عراق اشک بار ہیں ہم

سلمٰی اعوان

الفیصل ناشران وتاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

یہ دردِ جگر عراقی شُعرا کا

یہ عراق ہے
جیتا رہے وہ جس نے کہا تھا
میں اس تک جانے والے ہر راستے سے آگاہ ہوں
سلامت رہے وہ جس کے ہونٹوں نے یہ چار الفاظ ادا کیے تھے
عراق، عراق، عراق کے سوا کچھ نہیں

سعدی یوسف

دھرتی کے پیار میں گرفتار لوگو
میں اپنے دروازے پر آئے وحشیوں سے خائف نہیں
میں تو ڈرتا ہوں اندرونی دشمن سے
آمریت، مطلق العنانی اور سکھا شاہی سے

مظفر النواب

جنگ سخت محنت کرتی ہے
یہ یتیموں کیلئے نئے گھر بناتی ہے
خوشیاں لاتی ہے
کھیتوں میں بارودی سرنگیں بوتی ہے
اخباروں کو تصویروں سے سجاتی ہے

جنگ کتنی ذی شان اور عظیم ہے
کفن سینے اور قبریں کھودنے والوں کیلئے
ماؤں کی آنکھوں سے بارش مانگتی ہے
خاندانوں کو نقل مکانی پر مجبور کرتی ہے
یہ کتنی مشقت کرتی ہے؟

پھر بھی

کوئی اس کا مدّاح نہیں

دُنیا میخائل

میں اپنے سامنے خون آلود افق دیکھتا ہوں

اور کتنی بیشمار اندھیری راتیں

ایک نسل گئی ایک نئی نسل آئی

آگ ہے کہ جلتی اور بھڑکتی ہی رہی

محمد مہدی الجواہری

سالِ نو چلے جاؤ

ہمارے گھروں میں مت آؤ

ہم جن کے خواب نہیں

ہم جن کی یادیں نہیں

ہماری خواہش ہے ہم مر جائیں

ہمیں قبریں قبول کرنے سے منکر ہو جائیں

ہم صدیوں کی تاریخ لکھنا چاہتے ہیں

سالِ نو

ہم ایک تاریخ لکھنا چاہتے ہیں

نازک الملائکہ

اعلیٰ ترین اور کمتر ترین قوموں کی اِن سوچوں کے نام

وقت کی سُپر پاور کا ایک اہم فرد کارل رو Karal Rove تکبر اور نخوت سے بھرے پرے لہجے میں دنیا کو اُس کی گھٹیا اوقات کا احساس دلاتے ہوئے کہتا ہے۔

''ہم ایک ایمپائر ہیں۔ جب ہم کوئی کام کرتے ہیں ہم اس کے ہونے کا جواز پیدا کر لیتے ہیں۔ جب دنیا ہمارے اِس جواز پر غور و غوض کر رہی ہوتی ہے۔ ہماری ترجیحات کا رُخ بدل جاتا ہے۔ ہم تاریخ کے اداکار ہیں اور تم سب لوگ (یعنی باقی دنیا) صرف یہی جاننے میں لگے رہتے ہیں کہ ہم کر کیا رہے ہیں؟''

مجھ جیسی ایک بے عمل اور شورش زدہ قوم کی فرد جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہوئے کہتی ہے۔

''ارے کتنا زعم ہے۔ خدا تو کہیں یاد ہی نہیں اور ہاں تاریخ میں تو بڑا ہی نکما لگتا ہے۔ جانتا ہی نہیں کہ ہر دور کی ایمپائر، ہر عہد کی سپر پاور، ہر وقت کی عظیم سلطنت دراصل کسی سرکس ہی کی طرح ہے جو فنکاری اور اداکاری کے کرتب دکھا رہی ہوتی ہے۔ کرۂ ارض پر ظالم خدا کا روپ دھار لیتی ہے اور بھول جاتی ہے کہ اُس کی سکھا شاہی کا وقت کائناتی حاکم اعلیٰ کی تعین کردہ مدت کے اندر رہے۔ کیونکہ اُس اوپر والے کی افتادِ طبع کو بھی چین نہیں۔ وہ بھی تو نئی سرکس کے نئے گھوڑوں، نئے اداکاروں اور نئے فنکاروں کے نئے نئے تماشے دیکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ شکر ہے وہ ایسا ہے۔''

تو یہ کتاب اعلیٰ ترین اور کمتر ترین قوموں کی ایسی ہی سوچوں کے نام معنون کرتی ہوں۔

باب نمبر:1

1۔ **بحرین ایرپورٹ کے گیٹ نمبر 30 پر مسکین سا آدمی بغداد کیلئے یوں آوازیں لگاتا تھا جیسے بادامی باغ کے بس سٹینڈ پر سیالکوٹ سیالکوٹ، راولپنڈی کی صدائیں لگتی ہیں۔**

2۔ **دمشق سیٹیڈل Damascus Citadal دمشق شہر کا موتی ہے۔اس کا لینڈ مارک ہے۔**

3۔ **تو مجھے اِن کے ساتھ رہنا ہے۔رنگ برنگے نئے نئے تجربات سے اپنا دامن بھرنا اور مسرتوں کو کشید کرنا ہے۔**

سچ تو یہ تھا کہ ایک کہانی کی تخلیق کیلئے میں اپنے بھیجے کا تیل نکالنے میں کسی کولہو کے بیل کی طرح آنکھوں پر کھوپے چڑھائے چوبی ہل کے ساتھ جُتی دن رات چکر پر چکر کاٹے چلی جارہی تھی۔

بات تو اتنی سی تھی کہ سفرِ روس کے دوران رُوس کی صحافتی زندگی کے ایک بے باک پر مقتول کردار نے مجھے چِٹھی ڈال لی تھی۔یوں تو وہ ایک لفظ بھی نہیں بولی تھی پر پتہ نہیں کیوں اُس کا متین سا سچائی کی لو سے دمکتا چہرہ میری آنکھوں میں رچ گیا۔دل میں بس گیا۔میرے سنگ سنگ رہنے لگا۔ایک دن میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

”بھئی اب اُردو پڑھنے والوں سے اُس کا ملانا بہت ضروری ہوگیا ہے۔“

پھر کہانی بُنی جانے لگی۔

جب میں نے اُسکے بالوں کو سنوار کر اُن میں پھول چڑیاں سجالیں۔سک مسّی لالی سے ہونٹوں، سُرمے کاجل سے آنکھوں، ماتمی پوشاک اور رُجُون دیاس میں ڈوبے گیتوں سے اُسے رخصت کر بیٹھی تو احساس ہوا کہ اب کیا کروں؟

اُچھل پیڑے یوں بھی ٹکنے نہیں دیتے۔ہمیشہ یہی چاہتے ہیں کہ کہیں نہ کہیں بھاگی پھروں۔خجل ہوتی رہوں۔

اب خود سے پوچھتی ہوں۔کہاں چلنا ہے؟ کہیں بھی سوائے ناميوں اور ساميوں کے دیس کے۔باقی سب جگہیں قبول ہیں۔پر مصیبت ساتھی کی۔ہمیشہ ساتھ چلنے والی نے مہم جوئی دکھا دی تھی۔نازک سی نئی نویلی گاڑی کا دیو جیسے ٹرک سے پیچا لڑا دیا۔اُس نے وہ پٹخنیاں دیں کہ یقیناً چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ہوگا۔وہیں اُسے یہ بھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ بچی کیسے؟ کسی بڑی نیکی نے جیسے دروازہ کھٹ سے کھول کر اُسے فٹ پاتھ پر لُڑھکا دیا۔

دھان پان سی مہر النساء کو گاڑی کے سُرمہ بننے کے ملال کے ساتھ ساتھ خود پر اوپر والے کی نظرِ عنایت کا بھی پورا احساس تھا۔شکرگزاری کے سجدوں کی مدت کم از کم سال بھر تو ٹھہری۔

''بھئی سر نہیں اٹھانا مجھے تو۔''

اب ایسے میں میں کیا کرتی؟ ایک دن شیریں مسعود کا ایس ایم ایس پر ایران جانے کا پیغام ملا۔

''ایران'' میں نے پکوڑا سی ناک سکیڑی اور لمبی سانس بھری۔

"ہائے کہیں عراق چلی جاؤں نا۔ایک کہانی جنگ کے زمانے سے بلا رہی ہے جائے بغیر اُسے پیرہن کیسے پہناؤں؟ یوں بھی میرے خوابوں کے بغداد کا ظالموں نے حشر کر دیا ہے دیکھنا چاہتی ہوں۔

یونہی کہیں بچوں کے سامنے ذکر کر بیٹھی ۔انہوں نے تو وہ لتے لئے کہ بولتی کو جیسے سانپ سونگھ گیا ۔بڑے والے نے ماں کی ایسی بے تُری خواہشوں کا ذکر بہن سے کر دیا ۔اُس نے پل نہیں لگایا بڑی بہلی بو بو نے فون کھڑ کھڑا دیا ۔

''بس بس باز رہیں ایسی مہم جوئیوں سے ۔ہماری تو جان آپ میں ہی پھنسی رہے گی ۔''

تپ چڑھی ۔

''لو اِن کی محتاج ہوں نا میں ۔میرے نان نفقے کا بوجھ اُٹھاتے ہیں نا یہ ۔رُعب تو دیکھو ۔ساری زندگی ان کے پیچھے گال دی ابھی بھی رجے نہیں ۔پر چھوٹے والے نے تو حد ہی کر دی ۔اُس کی تو منطق ہی عجیب تھی ۔

''جیسی ٹٹ پونجھی (شکستہ غریب سی) خود ہیں ویسے ہی مُلکوں میں جاتی ہیں ۔کبھی سری لنکا جا وڑھیں گی ،کبھی رنگون ۔ارے امریکہ انگلینڈ جاتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے کیا ؟چلو کسی یار دوست کے سامنے بندہ ڈھینگ ہی مار لیتا ہے ۔بے نیازی اور خاندانی رجے پجے ہونے کا تاثر دیتا ہے ۔

''یار اماں تو آجکل ذرا امریکہ گئی ہوئی ہیں ۔واپسی پر انہیں انگلینڈ بھی رُکنا ہے ۔بہت مس کر رہا ہوں ۔''

بھانڈوں اور مراثیوں سے انداز میں بات کرتے کرتے اِک ذرا وہ رُکا اور پھر بولا ۔

''چلو امریکہ انگلینڈ سے الرجک ہیں تو آسٹریلیا چلی جائیں ۔عائشہ باجی نے ہزار بار کہا ہے ۔شو بازی کیلئے وہ بھی کچھ اتنا بُرا نہیں ۔''

وہ اگر چھوٹا سا ہوتا تو میں نے کھینچ کر جوتا اُس کے جباڑے پر مارنا تھا جیسے میں

اُس کے بچپن میں اکثر مارا کرتی تھی ۔مگر اسوقت وہ پانچ فٹ دس انچ کا لوہاری دروازے کے ماجھے ساجھے جیسے تن وتوش رکھنے والوں جیسا بنا ہوا تھا۔

میں نے ’’حرام زادہ‘‘ منہ بھر کر کہا تھا۔

ایسا کرنے اور کہنے میں اُس کی فضولیات پر میرے غصے اور کھولاؤ دونوں کی یقیناً تسکین تھی۔

’’میں تو وہ کروں گی جو میرا من چاہے گا۔‘‘

اِن ہی بھول بھلیوں میں کچھ یاد آیا تھا جو ذہن سے اوجھل ہوا پڑا تھا۔

مصر پر ایک کتاب لکھی تھی ۔"مصر میرا خواب" ۔کتاب لکھ کر اُس کی رونمائی کروانا بھی اب بیٹی کو بیاہنے کی طرح ایک مجبوری بن گئی ہے ۔سوچا کہ بھئی مصر پر لکھا ہے تو مصر والوں کو بھی خبر کرو ۔یہ کیا کہ سوتے ہوئے بچے کا منہ چوم رہی ہوں، نہ ماں کو خبر نہ پیو کو پتہ ۔تھوڑی سی ہل جل کرو۔

سفیر صاحب کو لاہور بُلانے نے کاسندا بھیجا۔جواب آیا۔بڑے مشکور ہیں ہم کہ آپ نے ہمارے دیس پر لکھا۔اب حق تو ہمارا بنتا ہے ۔پچاس لوگوں کی بارات لے کر جولائی کے پہلے ہفتے ہمارے گھر اسلام آباد تشریف لے آئیں۔اب اس الیلی داستان کی روئیداد کی تفصیل کا کیا ذکر کہ من آنم و من دانم۔بہر حال سفارت خانے کی اِس نوازش کا بُہت شکر یہ کہ بہتیری عزت دے ڈالی جسکا ہمیں گمان تک نہ تھا۔

یہیں سفارت خانے میں تقریب کے اختتام پر ایک اُونچے لمبے نوجوان نے اپنا تعارف ابوشعیب الہیثم سفیر فلسطین کی حیثیت سے کرواتے ہوئے کہا۔

’’ہمارے ملک فلسطین پر لکھیے۔‘‘

’’لو میاں ۔ہمارے تو نتھنے پھولے ۔جی باغ باغ ہوا۔سالوں پُرانی خواہش کی

تکمیل کے آثار نمودار ہوئے۔

فلسطین پر بھلا کس کافر کا جی لکھنے کو نہ چاہے گا اور فلسطین کی سرزمین پر اُترنے کی تمنا کون نہ کرے گا؟

پر ایک مصیبت تھی۔ میں اس وقت سفرنامہ رُوس کے کھلارے میں تن من سمیت ڈوبی پڑی تھی۔ ایسا بڑا امیدان کہ جس نے میرے کس بل نکال دیئے تھے۔

درمیان میں یہ ایک اور نازک، گہرا اور گھمبیر سا پنگا۔

گھر آ کر سوچا کہ پہلے ایک سے تو نپٹوں۔ کہیں دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا والی بات ہو جائے۔ دو کشتیوں کا سوار بلعموم غڑاپ سے پانیوں میں لڑھک جا تا ہے۔ بچتا بچا تا کہیں نہیں سیدھا ڈوبتا ہے۔ کوئی بخت ور اور قسمت والا ہو تو دوسری بات۔

اور میں جتنی بخت ور اور قسمت کی دھنی ہوں۔ بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔

پروجیکٹ سے فراغت ملی تو فون کھڑکایا۔ کہ حضور والا بندی فلسطین جانے کی آرزومند ہے۔ ہز ایکسیلنسی کے ہاں پھُوں پھاں والی کوئی بات نہ تھی۔ جواب میں بچوں والی تہذیب و شائستگی نمایاں تھی۔ پاسپورٹ، درخواست فوری بھیجنے کو کہا گیا۔ چلو بھیج کر انتظار میں بیٹھ گئی۔

شوق و اضطراب بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ رابطہ کیا۔ لہجے کی بیتابی و شتابی پر صبر اور حوصلے کی تلقین کی گئی۔ کارگزاری کی رپورٹ بلاشبہ بڑی مسرور کن تھی۔ اس بے چاری نمانی سی عورت کا ذکر صدر فلسطین جناب محمود عباس سے ہوا تھا۔ انہوں نے کہا۔ اھلاً و سہلاً، جم جم آئیں سو بسم اللہ، سر متھے سر آنکھوں پر۔ پاکستان اور پاکستانی ہمیں بہت پیارے۔ وہاں کی وزارت اطلاعات کی چیف سکریٹری بھی ہماری آمد کی تہہ دل سے منتظر اور اسرائیل خانہ خراب کے ہاں بھی تذکرہ ہو گیا تھا۔

ہمیشہ کہیں بھی گئے رُلنے والی بات ہی ہوتی تھی، کوئی تھو کتا بھی نہیں تھا۔اب جو کچھ وی آئی پی بننے کے آثار نمودار ہونے شروع ہوئے تو ایڑی ہی زمین پر نہ لگتی تھی۔فلسطین کیلئے پروین عاطف کی جان بھی لبوں پر تھی۔تھوڑی سی شاکی بھی تھیں کہ سب کچھ اکیلے اکیلے ہی۔پر ابھی تو میں خود بھی بیچ میں لٹکتی مٹکتی پھر رہی تھی تو کسی اور کیلئے کیا فرمائش ڈالتی؟

یہ جاڑوں کے دن تھے۔گلابی گلابی جاڑوں والے نہیں بلکہ دُھندوں، کہروں اور ہڈیوں کے اندر گودا تک جام کرنے والے دن۔جب وہ میری خلیری بہن ڈاکٹر رضیہ حمید امریکہ سے ٹپکی۔۱۹۷۱ کے آوائل میں کیمسٹری میں پی۔ایچ ڈی کے لئے وظیفہ پر امریکہ جانے والی ایسی وہاں گئی کہ واپسی کا تو راستہ ہی بُھول گئی۔وہیں اپنے پاکستانی کلاس فیلو سے شادی اور دو بچے پیدا کر کے اُسی معاشرے میں گُھل مل کر ہمارے لیے بس ایک داستان کی صورت میں یاد رہ گئی تھی۔

کہیں بیس 20 سال بعد جوگی والا پھیرا ڈالا تو آدھی زندگی امریکہ جیسے مُلک میں گالنے والی کو دیکھ کر دانتوں تلے اُنگلی داب لی۔کمبخت نری سادھو، مہنت، بے چین و مضطرب، غریبوں اور مارے موٹے انسانوں کے لئے کُچھ کرنے کی خواہشمند۔

پھر سُننے میں آیا۔اُس نے نوکری پر لات ماردی۔امریکہ کی Peace core میں شامل ہو کر دُنیا کے دُور اُفتادہ ملکوں میں تعلیم دینے کے مشن پر روانہ ہوگئی۔کبھی لاطینی امریکہ اور کبھی افریقہ کے پس ماندہ ملکوں میں اُس کی سرگرمیوں کے بارے پتہ چلتا۔بیچ میں اکثر پاکستان کا چکر بھی لگ جاتا۔ساتھ میں اُس کے اپنے جیسے کچھ اور ماہی منڈے ٹائپ عورتیں اور مرد بھی ہوتے۔اکتوبر 2005 کے زلزلے میں آزاد کشمیر کے علاقوں میں جا بیٹھی۔اُن دنوں میں بھی اُس کے ساتھ مظفر آباد کی دُور افتادہ اور دشوار گزار وادیوں میں گئی۔

جب وہ گھانا، موزمبیق، تنزانیہ اور ممباسا کے قصے سناتی تو میرے سینے پر رشک و حسد کے سانپوں کی یلغار ہو ہو جاتی۔ جی چاہتا ابھی اور اِسی وقت اٹھوں کھڑاویں نہیں جوگرز پہنوں۔ جوگیا گُرتا نہیں، پینٹ گُرتا تن پر ڈالوں۔ ٹمن کا نہیں، چمڑے کا چھوٹا سا بیگ ہاتھ میں لوں اور "ربا میں شوقن تیرا جگ ویکھن دی" الاپتی انجانے دیسوں کی طرف نکل جاؤں۔ پر کہاں؟

تنزانیہ کیلئے ٹرائیاں ماریں۔ پر وہ تو کہیں ڈوڈوما Dodoma میں بیٹھی تھی۔ افریقی سارے زمانے کے ہڈ حرام اور سُستی کی پنڈیں۔ دوبارہ وہ میرے ویزے کیلئے دارالسلام بھی آئی۔ پر ایک کے بعد ایک ایسی ایسی پخیں فون پر سُنیں کہ میں نے کُڑھ کُڑھ کر اُسے کوسا۔

''ارے ایک تہائی جنم تو میرا اُس کا ایک چھت تلے اکٹھا گزرا۔ ہوشیاری چالاکی تو اُس کمبخت کے پاس نہیں پھٹکی۔ نہ بل نہ پھیر۔ مقدر کی بخت ور تھی۔ علم نصیب میں لکھا تھا۔ پڑھ گئی اور امریکہ پہنچ گئی۔ چالیس سال سے وہاں ہے۔ کچھ کرنے جوگی ہوتی تو آدھا محنت کش ٹبر امریکن شہری اور کروڑپتی تو ضرور ہوتا۔

''بیٹھ آرام سے۔ تیرے نصیب میں یہ دیس دیس گھومنا نہیں لکھا۔''

جاڑوں کے یخ بستہ دنوں میں وہ پاکستان آئی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اس بار اس کے پروگرام میں تین ماہ کیلئے اسرائیل و فلسطین کا قیام بھی ہے۔

میں چلائی۔

''ارے وہاں تو میں بھی جارہی ہوں۔ مجھے اپنے ساتھ ہی نتھی کرلو۔''

دو دنوں بعد میں نے اُسے گاڑی میں بٹھایا اور اسلام آباد کے سیکٹر ۱۰ میں اردن کے سفارت خانے پر ہلّہ بول دیا۔

میرے اضطراب، میری بے چینیوں، میرے اُچک کر جہاز میں بیٹھنے کے بے تابانہ بے پایاں اظہار پر نوجوان سفارت کار کا انداز بڑا مد برّانہ سا تھا۔

کاجو کی پلیٹ بذات خود وہ میرے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

''یہ لیجیے۔''

چاکلیٹ ہاتھوں میں زبردستی تھمائی اور مُصر ہوا اِسے کھایئے۔

میں نے ممتا کی ساری محبت لہجے میں گھولتے ہوئے کہا تھا۔

''الہیثم مجھے پہنچا دو وہاں۔''

''سمجھنے کی کوشش کریں۔'' اُسنے میرے جوش و جذبے پر سرد پانی انڈیلا۔''یہ امریکی شہری ہیں۔اسرائیل انہیں روک نہیں سکتا۔آپ کا تو پاسپورٹ اعلان کرتا ہے کہ اسرائیل جائے ممنوعہ ہے۔''

ٹھنڈی ٹھار ہوگئی تھی۔

''کوشش ہورہی ہے۔گھبرایئے نہیں۔''

ایکدن جب میں جنگ اخبار کی ریفرنس لائبریری میں بیٹھی "سری لنکا" کی فائل دیکھ رہی تھی۔ماحول کی خاموشی اور سناٹے کو فلسطینی سفارت خانے سے آنے والی آواز نے توڑا۔ابوشعیب بول رہے تھے۔

''اسرائیل نے آپکو اوکے کر دیا ہے۔پر ساتھ ہی چند شرائط بھی عائد کر دی ہیں۔سُن لیجیے۔''

میں دھڑکتے دل کے ساتھ سُنتی تھی۔کڑی شرائط میں سب سے اہم فلسطین کے مسئلے پر نہ لکھنے کا وعدہ تھا۔یروشلم میں داخلے کی کوئی کوشش نہیں ہونی چاہیے۔چند اور بھی ایسی ہی بے تکی باتیں تھیں۔فون بند ہوگیا تھا۔اب خود سے پوچھنا ضروری تھا تو میں نے وہاں

کرنے کیا جانا ہے اگر لکھنا نہیں ۔ پھر چند لمحوں کی چُپ کے بعد میرا اندر جیسے پھڑک اٹھا تھا۔

''ہے نا لعنتی یہ اسرائیل بھی ۔''

اب یہ بھی کہیں ممکن تھا کہ فلسطین پر جس انداز سے بھی لکھا جائے اسرائیل کا ذکر نہ آئے ۔اس کے وجود کا کینسر اور اُس کے بغیر ہی ۔یعنی افسانہ آئیں بائیں شائیں سے بھر جائے اور اصل قصے سے رہ جائے یا شاعر کے خوبصورت لفظوں میں کہ وہ بات جس کا سارے فسانے میں ذکر نہ تھا والی بات ہو۔

گھر واپس آ کر میں نے خود پر لعن طعن اور پھٹکار کا پٹارہ کھولا جس میں اس سے پہلے بھی بیسیوں بار میں اُسے غوطے دیتی رہی ہوں۔

عمان میں اپنے قیام کے دوران جب ہوٹل والوں نے اسرائیل کے لئے چند گھنٹوں کا ٹرانزٹ ویزا دینے کا پوچھا تو مجھے ڈر کیوں لگا اور فیس کا سُن کر مجھے ونڈل سی کیوں پڑی ؟ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وقت اور چانس آپ پر خوش قسمتی کا دروازہ کھول دے ۔اور تُف ہے کہ کھیسے میں پیسے ہوتے سوتے بھی آپ یہ دروازہ بند کرلیں۔کوئی چار پانچ سال بعد مصر اپنی سیر کے دوران صحرائے سینا (Sinai) کے ریگ زاروں سے گزرتے ہوئے خلیج عقوبہ (Gulf of Aqaba) کے ساحلی شہر ایلات اور اسرائیلی شہر رفہ (Rafah) سے ظالم اسرائیل کو شروع ہوتے دیکھنا بڑا تلخ تجربہ تھا۔یہ سرحدی علاقہ افقی صورت میں چلتا چلتا بحیرہ روم کے مشرقی ساحلوں پر واقع غزہ سے جاملتا ہے جو ایک چھوٹی سی مستطیل پٹی ہے۔جہاں وہ بدقسمت اور مظلوم قوم جس کا نام فلسطینی ہے محصور ہوئی پڑی ہے۔مصر کے ساتھ جڑے اس چھوٹے سے حصے میں جیالوں نے سرنگیں بنا ڈالی ہیں ۔ایک ظالم اسرائیل ،دوسری ظالم مصری فوجی حکومتیں جو غزہ کے مجاہدوں اور مصر کے اخوان المسلمین سے خائف ۔اوپر سے دلیر اور جیالے فلسطینی مجاہد جنہوں نے سوجتنوں اور حربوں سے یہ

غیر قانونی راستے بار بار تباہ کیے جانے کے باوجود پھر بنائے ہیں۔ان سے گزرنا ہے۔چھاپے پڑنے پر پکڑے بھی جانا ہے۔سزائیں بھی کاٹنی ہیں اور باز پھر بھی نہیں آنا۔

میں نے بھی جی جان سے اُس سرنگ کے راستے فلسطین جانے کا سوچا۔خرچہ کچھ زیادہ نہ تھا۔لالچی طبعیت نے اب ساری توانائی اس میں جھونک کر اس مقصد کو حاصل کرنے کی اپنی سی کوشش کرنی چاہی۔گویہ آدم خور شیر کے کچھار میں سر دینے والی بات تھی۔پر اس وقت خواہش کے منہ زور اور تند و تیز ریلے کے سامنے بڑی مجبوری محسوس کر رہی تھی۔

پر بُرا ہوا یا اچھا۔میری ساتھی نے ایڑھی نہ لگنے دی۔زمانے بھر کی ڈرپوک اور دبّو سی۔

اُسے کون سی کتاب لکھنی تھی جو وہ اس جھمیلے میں پڑتی۔یوں بھی چسکے مارے میرے ساتھ آ گئی تھی۔میرا کیا تھا؟ کھا کھٹ بیٹھی تھی۔نانی دادی جو بالعموم کاٹھ کباڑ کا سامان بن کر کھڈے لائن لگی ہوتی ہے۔اندر بھی ہو جاتی تو خیر صلاً۔

رضیہ حمید نے جب واپس آ کر فلسطین کے شہروں حیفہ، غزہ، رام اللہ، عکا، یروشلم وغیرہ کی گردان کی۔غزہ کی بوڑھی عورت کے زیتون کے باغ میں زیتون کے درختوں پر چڑھنے، انہیں توڑ کر گھر لانے اور دستی مشین سے تیل نکالنے کے قصے سنائے۔اسرائیل کی ظالمانہ کہانیاں، اس کے ظالمانہ ہتھکنڈے، حماس کی خدمت خلق، انکے جذبات کی شدتیں اور الفتح کی سیاست سب پہلوؤں پر روشنی ڈالی تو میری حالت قابل دیدنی تھی۔حسرتوں کا دھواں تھا جو مجھے سُلگا سُلگا کر مارے جا رہا تھا۔

خیر سے میری اُمیدوں پر پانی پھر جانے کی رہی سہی کسر فریڈم فرٹیلا نے پوری کر دی۔میری تو لٹیا ہی ڈوب گئی۔ظالم اسرائیل پٹڑی پر کس مشکل سے چڑھا تھا؟ اب ایک گڑگڑاہٹ سے نیچے اُتر گیا۔

ابو شہیب فون پر تاسف بھرے لہجے میں مخاطب تھے۔

''اسرائیل نے انکار کر دیا ہے۔''

اب بغداد جانا بھی خاصا سنسنی خیز تھا۔جسے کہتی وہ کانوں پر ہاتھ رکھ لیتا۔

''ارے موت کے منہ میں جانے والی بات ہے یہ تو۔'' سوچا عراق ایمبیسی کو لکھوں۔عرضداشت بھیجی گئی کہ حضور والا اکیلی ہوں صرف تحفظ درکار ہے۔بلایا گیا۔ہزایکسی لینسی ڈاکٹر رُشدی محمود تاریخ میں پی ایچ ڈی تھے۔تپاک سے ملے۔ہر طرح سے تعاون کی یقین دہانی ہوئی۔

''بس جا کر ایک خط لکھیے کہ آپ کو کن کن پہلوؤں پر کام کرنا ہے؟''

آٹھ نو پوائنٹس پر مشتمل ایک خط بھیج کر انتظار کی سُولی پر چڑھ بیٹھی۔چند بار فون کیا۔ہر بار ہزایکسی لینسی خوش مزاجی سے ہیلو ہائے کرتے۔یقین دلاتے۔جلد خوشخبری سنانے کا فرماتے۔مگر کچھ تھا جسکی پردہ داری مطلوب تھی۔تفصیل ہرگز خوشگوار نہیں۔کہیں خوشگوار میٹھی میٹھی سی دوستانہ باتوں کے انبار میں محتاط لفظوں میں لپٹا ایک پیغام ضرور تانکا جھانکی کرتے ہوئے کچھ بتاتا اور سمجھاتا تھا کہ عراق امریکی تسلط میں ہے۔کہیں تمہارے جیسی منہ پھٹ اور ہتھ چھٹ گرفت میں آ گئی تو اُس کا تو پٹرہ ہو جائیگا اور کوئی بعید نہیں کہ اُس کی اٹھا پٹخ شروع ہو جائے کہ عراق میں تو افراتفری مچی ہوئی ہے اور عہدوں کیلئے دوڑیں ہیں۔وہ جو گذشتہ سال سے ڈپلومیٹک انکلیو میں کروڑوں کی مالیت سے بننے والا نیا سفارت خانہ انتہائی شاندار، بغداد کی قدیمی عظمتوں کا نمائندہ جی جان سے بنانے میں ہلکان ہو رہا ہے اور چاہتا ہے کہ اُس کی تکمیل صرف اور صرف اسی کے ہاتھوں ہو اس اعزاز سے محروم رہ جائے گا۔

اب میں تو یہی کہوں گی کہ اس میں یقیناً میرے مقدر کا بھی دوش ہے کہ جس کے

نصیب میں مُفتہ نہیں خجل خواری ہے۔

''اب میں کیا کروں؟ کس کھوں کھاتے میں گروں؟ کہاں جاؤں؟ کسی پل چین نہ تھا۔ ایسے میں اخبار کا ایک اشتہار نظر سے گزرا۔عراق اور شام کیلئے زیارتی کارواں ۱۵ جولائی کو روانگی۔ادائیگی ایک لاکھ پچیس ہزار۔

یہ زیارات کا پیکج تھا۔عراق و شام کی مقدس جگہیں محترم تو سبھی مسلمانوں کیلئے ہیں۔یوں شیعہ مسلک کیلئے ذرا خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔

بہت سی سوچوں نے گھیرا ڈال دیا۔ترجیحات کا فرق غور طلب تھا۔

مذہبی معاملات میں بُہت لبرل ہوں۔خدا کو ربُ المسلمین نہیں رب العالمین جانتی ہوں۔انسانیت پر ایمان رکھتی ہوں اور تہہ دل سے اِس پر یقین ہے کہ مذاہب کی یہ رنگا رنگی اوپر والے کی اپنی تسکین طبع کیلئے ہے اور یہ تنوع اُسے حد درجہ محبوب ہے۔

اس لئے آپ اور میں کون اپنے عقیدے اور مسلک پر غرور کرنے والے۔

مسئلہ میرے اکیلے کا تھا۔عرفانہ عزیز نے ایکبار بڑے جذب سے میرے ساتھ سفر کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔فون کیا تو دس مجبوریاں سُننے کو ملیں۔میں نے ریسور پٹختے ہوئے دل میں کہا۔

''چل میاں چل انہی کے ساتھ۔بات ساری کھول دینا۔گھر والوں والے تو مطمئن رہیں گے کہ بی بی اکیلی نہیں۔عراق جانے کی اور تو کوئی راہ ہی نہیں۔

بہت خوبصورت شاعر جناب حسن عسکری کاظمی سے راہنمائی چاہی کہ مقامات مقدسہ پر اُن کی دو کتابیں میں پڑھ چکی تھی۔انہوں نے ایک نمبر دیا''اِن سے رابطہ کرو۔''

بات ہوئی۔دل کچھ ٹھُکا۔پر تھوڑی سی جانکاری تھوڑی سی پرکھ پڑتال ضروری تھی۔حیدر زماں صاحب کے گھر پہنچی۔دہلیز میں قدم دھرتے ہی دروازے ہی دروازے

والا اشتہار آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔یہاں بھی درویشی ہی درویشی والا منظر تھا۔

لگی لپٹی کے بغیر اپنی ترجیحات کا ذکر کر دیا۔اہل بیت سے محبت ہے مگر مسلمان میں بس ایویں سی ہوں ۔حج ،عمرہ، گیتوں اور نظموں کے زور پر کر کے آئی ہوں ۔مجھ جیسی سر کی ہوئی خاتون اُس شریف النفس انسان نے کہاں دیکھی ہوگی؟ تاہم انہوں نے اپنے تعاون کا بھرپور یقین دلایا تو میں نے پاسپورٹ اور پچاس ہزار روپیہ کھٹ سے نکالا۔حوالے کیا۔شام کو بقیہ رقم بھیجنے کا وعدہ کیا اور اتنا سا جانا کہ 5 جولائی کو روانگی ہے۔لاہور سے دمشق بذریعہ ہوائی جہاز۔تیرہ دن کا شام میں قیام۔بس سے عراق ،پندرہ دن کے بعد ایران کیلئے روانگی اور تہران سے لاہور واپسی۔

مزید حال احوال کیا ہیں؟ پتہ نہیں کچھ جاننے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔جنگ کے بعد کا عراق دیکھنے کا تجسس اگر زوروں پر تھا تو وہیں شام کے بارے وارفتگی شوق عالم کچھ نہ پوچھو والا معاملہ بھی تھا۔

چند دن کے خمار کے بعد نقشے کھولے۔فاصلوں کا حساب کتاب کیا۔موسم کے بارے میں رپورٹیں لیں۔شام گرم تھا لیکن قابلِ برداشت۔تیس سے بتیس 32-30 ٹمپریچر پر۔ہاں البتہ عراق تنور بنا ہوا تھا۔ڈی ہائیڈریشن کی پرانی مریض ہنس کر خود سے بولی۔

’’آپے بجھی تی تینوں کون چھڑائے۔(خود اپنے شوق سے تم بندھی ہو۔اب کون تمہیں اس سے چھڑائے)۔

وسط جون کا وہ بھی ایک آگ برساتا دن ہی تھا ظہر کے چار فرض پڑھتے پڑھتے عراق پہنچ گئی۔

’’دو جہاں کے بادشاہ، ناممکنات کو ممکن بنا دینے والے شہنشاہ کیا یہ ممکن ہے؟ اب

پڑھ کیا رہی تھی التحیات، قل ھواللہ یا سورہ فاتحہ سب بھول گئی اور سوال جواب میں اُلجھ گئی تھی۔

میرے لیے تو ناممکن پر تیرے لیے کن فیکون۔ پلیز آپ عراق میں میرے قیام کے دوران ابر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا میرے سر پر تان دیجیے نا۔ مشکور رہوں گی آپ کی۔"

ایسی فضول اور بے سروپا سی خواہش پر بے اختیار ہی میری ہنسی چھوٹ گئی۔

بیڈ پر بیٹھے پانچ سالہ پوتے نے حیرت سے دیکھا۔ چھلانگ لگا کر نیچے کودا اور دوڑتا ہوا ماں کے پاس جا کر بولا۔

''اماں دا دو پاگل ہوگئی ہیں۔''

چار بالشت لمبے اور تین بالشت چوڑے اٹیچی کیس میں میرے نہ نہ کرنے پر بھی میری بے حد پیاری خادمہ نے دس جوڑے ٹھونس دیئے کہ وہاں جا کر آپ نے دھوبی گھاٹ ہرگز ہرگز نہیں لگانا۔ تنہائی میں چپکے سے میں نے پانچ جوڑے نکال باہر پھینکے۔

''کسی فیشن شو میں جا رہی ہوں۔ فضول کا بوجھ''

ہاں البتہ عراق کی گرمی کو مارنے کیلئے تخم ملنگا اور قتیرہ گوند کے لفافے رہنے دیئے۔ بادام اور سونف کے ساتھ قطعی چھیڑا چھیڑی نہیں کی۔ نئے ڈیجیٹل کیمرے کے ساتھ پرانا یوشیکا بھی رکھا۔ پرانی ساتھی دوربین بھی حفاظت سے کونے میں ٹکائی۔

بلڈ پریشر کی دوائی دھیان سے سنبھالی۔

میں اُن جاہل اور ان پڑھ لوگوں سے بھی بدتر ہوں جو خاموش قاتل کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی دوائی نہ کھانا بڑا فخر سمجھتے ہیں۔ سفر پر جاتے ہوئے دوائی رکھنی ضروری پر کھانے کی مجبوری نہیں۔ ہاں البتہ تکلیف کی شدت تو ناک سے لکیریں بھی نکلوا دیتی ہے۔

بیگ میں نہ پاسپورٹ، نہ ٹکٹ، نہ کوئی معلوماتی بروشر۔ اجڈوں اور جاہلوں والی

بات تھی۔اللہ تیرے حوالے۔

ایر پورٹ پر تھوڑی سی پریشانی ہوئی۔شکر ہے کہ میاں ساتھ نہیں آئے تھے۔ایسی بدنظمی دیکھتے تو وہیں لعن وطعن کے تبّروں سے تواضع شروع کر دیتے۔

قافلے کے لوگوں کو تاڑنے اور جائزہ لینے سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سیدھے سادھے عقیدتوں کے اسیر لوگ ہیں جو حج وعمرہ کی طرح زیارات کو بھی ایمان کا حصّہ سمجھتے ہیں۔

پہلا پڑاؤ بحرین ہوا۔خوبصورت شہر پرشین گلف کے دہانے سے کسی جادوئی اسرار کی مانند پھوٹتا ہوا نظر آیا۔ایر پورٹ کیا تھا۔ایک پورا شہر۔دنیا جہان کی نسلوں اور قوموں سے بھرا پڑا۔

فلپائن کی پھینی پھدکڑ ڈھڈو رنگی (چپٹی ناک اور مینڈک جیسے رنگ والی) لڑکیوں کے ٹولوں نے آدھا ہال سنبھالا ہوا تھا۔باقی کا آبنوسی بنگلہ دیشی لڑکیوں اور عورتوں کے قبضے میں تھا۔شلوار قمیض اور قمیض پاجاموں کے علاوہ ساڑھی تو قسم کھانے کو ایک کے بھی تن پر نہ تھی۔

1969 ڈھاکہ یونیورسٹی میں اپنا زمانہ طالب علمی یاد آیا تھا۔ایک ماہ میں ہی اُٹھتے بیٹھتے میرے کلاس فیلوز نے "تماں کے خوقی ناہیں (تم بچی نہیں ہو) بنگال آئی ہو تمہیں ساڑھی پہننی اور بنگالی بولنی چاہیئے" جیسے طعنوں سے چھلنی کرنا شروع کر دیا تھا۔لباس اور زبان کیلئے اُن کی بے تکی محبت، گریز اور تعصب خوفناک حدوں کو چھوتا تھا۔میں نے بھی فی الفور یہ دونوں کام کرنے میں ہی اپنی سلامتی اور عافیت جانی تھی۔

وقت کتنا بدل گیا تھا۔بنگلہ دیشی عورت ملکی معیشت مظبوط کرنے میں کس درجہ سر گرم ہے۔

متحدہ عرب امارات کی چھ امیر ریاستوں اور مشرق وسطٰی کے کھاتے پیتے ملکوں میں یہ غریب عورتیں اور لڑکیاں ایجنٹوں کی وساطت سے محنت مزدوریاں کرنے جا رہی تھیں۔ تیسری دنیا کے غریب لوگوں کا مقدر۔ یہاں کوئی تین گھنٹے کا پڑاؤ ہوا۔ گیٹ نمبر 31 سے دمشق کیلئے ہمیں داخل ہونا پڑا۔

گیٹ نمبر 30 پر کھڑا دُبلا پتلا مسکین سا آدمی ''بغداد بغداد'' کیلئے یوں آوازیں لگا رہا تھا کہ جیسے بادامی باغ کے بس سٹینڈ پر ''سیالکوٹ سیالکوٹ راولپنڈی راولپنڈی'' کی صدائیں لگتی ہیں۔

اِس بین الاقوامی ہوائی اڈے پر جہاں دنیا جہاں کے مسافروں کو اُن کی پروازوں کیلئے پروقار انداز میں عربی، انگریزی اور ہندی میں بلایا جا رہا تھا۔ میں خود سے کہے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

''اللہ یہ پیغمبروں، ولیوں، صاحب کشف اور الف لیلیٰ کا بغداد ایسا یتیم و یسیر ہو گیا ہے کہ اس درجہ گھٹیا اور جٹکے انداز میں اِس کے مسافروں کو پکاریں پڑ رہی ہیں۔

بس اُس وقت جی چاہا تھا کہ اِس پکار کے پیچھے پیچھے چلتی شہریار اور شہرزاد کے دیس چلی جاؤں۔ دیکھوں تو بے چارہ کتنا زخمی ہوا پڑا ہے؟

یہیں میں نے اُس مدھو بالا کو دیکھا تھا۔ ثروت شجاعت شیخوپورہ کالج کی پروفیسر۔ ہنستے ہوئے میں نے پوچھا تھا۔ ''کوئی قرابت داری اُس خاندان سے۔'' کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ زندہ دل خاتون تھی۔

جہاز میں دہکتے لبوں، چمکتے رخساروں نین کٹاراسی آنکھوں اور چھوٹتی مُیار جٹیوں جیسی جتنی عورتیں بھی نظر آئیں کم و بیش سب شامی تھیں۔ میرے ساتھ بیٹھنے والی بھی ایسے ہی قد کاٹھ اور رنگت والی تھی۔ وہ تو علم کے میدان کی بھی اچھی شہسوار تھی کہ دمشق یونیورسٹی میں

جغرافیہ کی استاد تھی۔

بچے جہاں کے بھی ہوں اُنکے کھیل بھی ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔سامنے والی سیٹ پر بیٹھی شامی بچی گڑیا کے ساتھ کھیلتی،کبھی اُسے کپڑے پہناتی،کبھی پھول تاروں سے سجاتی۔

لڑکا موبائل پر گیمیں کھیلتا تھا۔سامنے چلتے ٹی وی پر عربی فلم میں وہی پُرانے رنڈی رونے تھے۔مرد کی بیوفائی،عورت کا چھکوں پھکوں رونا،جیبوں کی تلاشی۔

واش روم کیلئے اٹھی تو چلتے چلتے ٹھٹھکی۔ایک فلپینو لڑکی روتی تھی۔دلداری کی تو جیسے ٹھیس لگ جائے آبگینوں کو والا معاملہ ہوگیا تھا۔دو ننھی منی معصوم صورتیں چھوڑ کر آئی تھی۔یاد نے زور مارا تو موتیوں کے ہار پرونے لگی۔

اب دلاسا اور تسلّی کے دو بول ہی تھے ناغریبوں کے مقدر۔

گلف ایر لائن کی فضائی میزبانیں بلاشبہ مقابلہءحسن میں بھیجی جانے والی تھیں۔مرد جتنے خوبصورت تھے اتنے ہی فارغ البال۔جی چاہتا تھا ایک کراری چپت کھوپڑیوں پر لگاؤں۔کیسا مزہ آئے؟

کھانے میں بریانی تھی۔کمبختوں کے پاس کشمش کا قحط تھا۔سارا زور پیاز پر تھا۔گارنش گویا مردے کے منہ پر مکھن ملنے کے حساب میں جاتی تھی۔سبزیوں کی ڈش بے سوادی اور میٹھا اُس سے بھی زیادہ بے سوادا۔

ایک عظیم اور قدیم تہذیبی گہوارہ ملک شام کے دارلخلافہ دمشق کی پہلی جھلک جہاز کی کھڑکی سے اترتی ہوئی آنکھوں سے آٹکرائی تھی۔

بڑا دلربائی والا منظر تھا۔جیسے دُنیا سے کٹے پھٹے کسی صحرا میں پہاڑیوں کے پاؤں سے ناف تک کے دامن میں بچیوں نے کھیلتے کھیلتے گڑیوں کے خوبصورت گھروندے یہاں

وہاں سجا دیے ہوں۔

ریگستانی میدان میں جبل قاسیون اور چام cham پیلس ہوٹل کی اولین جھلک بھی میں نے اُس شامی خاتون کی نشاندہی پر ہی دیکھی تھی۔

میں نے باہر دیکھا تھا شہر کے بیچوں بیچ گزرتی لمبی شاہراہ حافظ الاسد روڈ جیسے کوئی موٹا تازہ اژدھا پھنکارتے مارتا ہو۔ درختوں کی قطاریں اپنی لمبائی چوڑائی اور تناسب کے اعتبار سے بڑی منفرد سی دکھتی تھیں۔

تین گھنٹے کے اِس سفر میں میں نے اُس حُسن کی مورتی سے شام کے متعلق کافی اسباق پڑھ لیے تھے۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے تک جغرافیائی لحاظ سے شام، فلسطین وغیرہ سلطنت عثمانیہ کی علمداری میں تھے۔ انگریزوں اور اتحادیوں کی سازشوں نے اس کے حصے بخروں کیلئے بڑی گھناؤنی چالیں چلیں۔ اِس سرزمین کو مختلف ٹکڑوں میں اپنے حواریوں میں بانٹ دیا۔

یہ کمبخت انگریز اور اُن کے چچیرے، ممیرے بھائی بند منحوس مارے کیسے تخریبی ہیں؟ ملکوں ملکوں پھڈے ڈالے رکھتے ہیں۔ میں نے کڑھ کر سوچا۔ ڈاکٹر زُخرف کے لہجے میں دُکھ کی چبھن تھی کہ اس کا خوبصورت خدوخال والا ملک اس بندر بانٹ کے نتیجے میں بے ڈھبا سا ہو گیا تھا۔

دمشق کمال کا خوبصورت شہر ہے اور دمشق سٹیڈیل Damascus citadel تو گویا شہر کا موتی ہے۔ اس کا لینڈ مارک ہے۔ ایک کروڑ پچیس لاکھ آبادی والا یہ مُلک کٹھ پتلی بادشاہت سے گزرتا کیمونسٹ سوشلسٹ چکروں میں اُلجھتا حافظ الاسد کے بعد اُس کے بیٹے بشار الاسد کی صدارت میں ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔

بشار کے بارے میں میرے ایک سوال پر ڈاکٹر ژ شرف نے کہا تھا۔

''بہت سمجھدار اور لوگوں میں ہر دل عزیز ہے۔ مُلک کو تیز رفتاری سے ترقی کی جانب لے جا رہا ہے۔ ہمہ وقت لوگوں سے رابطے میں رہتا ہے۔''

جہاز لینڈ کر رہا تھا۔ میں نے اپنی حسین ہم سفر کا شکریہ ادا کیا کہ جس نے شام سے میرا ابتدائی تعارف کروا دیا۔ ایر پورٹ اتنا شاندار نہ تھا جتنا میں توقع کر رہی تھی۔

پڑاؤ زینبیہ میں ہوا۔ دمشق سے پندرہ کلو میٹر پر زینبیہ کا علاقہ حضرت زینب کے نام نامی سے مشہور ہے۔ درمیانے درجے کے ہوٹلوں، بازاروں اور رہائشی مکانوں کی وجہ سے متوسط زائرین کی کثرت ہے۔ جو یہاں ٹھہرتے اور دنوں رہتے ہیں۔ اب "محبانِ اہل بیت" ہوٹل کے ایک کمرے میں بچھی اٹھ چارپائیوں میں سے ایک پر لیٹتے ہوئے میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

''میں کیا کروں۔''

کمرے میں داخل ہونے کے ساتھ ہی عورتوں کے بیگ اٹیچی کیس کُھل گئے تھے۔ برتن بھانڈے، دالیں، چاول، مٹھیاں اور چنے نکل آئے تھے۔ دیگچیاں گلاس پلیٹیں بھی ملحقہ کچن میں سج سجا گئی تھیں۔ اکلوتے غُسل خانے میں باری باری غُسل کے بعد تن والا جوڑا ڈھل کر کمرے میں بچھی چارپائی کی پائنتیوں پر سُوکھنے کیلئے ڈل گیا تھا۔

بالوں میں کنگھی پٹی اور حضرت زینب کے روضہء مبارک پر جانے کی تیاریاں عروج پر تھیں۔

''میں کیا کروں۔'' سوال ایک بار پھر اپنے آپ سے ہوا تھا۔

ابھی تک میں آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ 1955 اور 1956 کی کچھ کچھ دھندلی یادیں تھیں۔ میری نانی اور دادی ایسے ہی لازموں کے ساتھ حج کیلئے گئی تھیں۔

میری توقعات کے خانوں میں ایسے مناظر میں سے کسی ایک منظر کا بھی کوئی تصور نہ تھا۔ پورے دو ڈھائی گھنٹوں کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں۔ اٹھ کر بیٹھی۔ اُن سبھوں کو دیکھا۔

بڑی موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں والی صابرہ داتا دربار کی ملنگنی تھی۔ موچی دروازے کربلا گامے شاہ میں صفائی کرتی تھی۔ کسی نیک دل لیڈی ڈاکٹر کے جذبہ رحمی کے نتیجے میں یہاں پہنچی تھی۔ کونے والی چارپائی پر بیٹھی چھ فٹی تیس سالہ زیب النساء ٹکہ ٹکہ پیسہ پیسہ جوڑ کر آئی تھی اور شکر کی کیفیت سے باہر نہیں نکل رہی تھی۔

جمیلہ تچی کہانیوں کے حوالے سے اپنی ذات کا ایک بڑا کردار تھا۔ ایسی دلخراش داستان، رونگٹے کھڑے کرنے والی، رُلانے والی۔

چار سیاہ کپڑوں میں ملبوس دو نوجوان اور دو بوڑھی عورتیں سرگودھا کے زمیندار کھاتے پیتے روایتی گھروں سے تھیں۔ اور مدھو بالا جانے کس کمرے میں تھی۔ جس کے لئے میں نے سوچا تھا کہ میری اُس سے دال گل جائے گی۔

باتھ روم کے کھڑ کھڑ کرتے پلاسٹک کموڈ پر بیٹھتے ہوئے کہ جب مجھے ہر لحہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ جانے کب میں اِس پر سے لڑھک کر دھڑام سے گرتے ہوئے گندگی میں لتھڑ سکتی ہوں۔

یہ جملہ میں نے خود سے کہا تھا۔

''تو مجھے اِن کے ساتھ رہنا ہے۔ ان رنگ برنگے نئے تجربات سے اپنا دامن بھرنا اور مسرتوں کو کشید کرنا ہے۔''

باب نمبر:2

1۔ شام سے بغداد تک کی اِس اہم شاہراہ پر کاش ریسٹورنٹ ہوتے۔ زمانے بھر کا زائر، پتہ نہیں اِن اندھے حکمرانوں کو اِس مذہبی سیاحت Religious Tourisim کی اہمیت کب سمجھ آئے گی؟

2۔ چیک پوسٹوں پر میٹل ڈیٹکٹرز کی سر سے پیر تک چڑھائیاں، اُترائیاں ٹینکوں پر چڑھے بندوقیں تانے امریکیوں کی مشتبہ نگاہیں اور عراقیوں کی پیسے بٹورنے کی کاوشیں سب انتہائی بیہودہ اور جی جلانے والی تھیں۔

صحرا کی رات دیکھنے کا میرا تجربہ نہیں تھا۔ صحرائی شاموں کی دید سے میں شام میں خوب لُطف اندوز ہوئی تھی۔ کہیں دمشق میں پل پل نیچے اُترتے سورج کے نظارے، کہیں حلب میں ڈوبتا سورج کہیں حمص میں اس کی رنگینیاں۔

شام میں گزرے تیرہ دن جیسے ہوا کے تیرہ معطر جھونکے تھے۔ کمرہ بھی ٹھیک ہی مل گیا تھا اور ساتھی نسرین بھی اچھی بیبی سی خاتون تھی۔

اس وقت میرے سامنے جو شام تھی اُس نے مجھے تک تک دیدم و دم نہ کشیدم والی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اور جب رات سے واسطہ پڑا تب بھی سانس سینے میں اٹکنے لگا اور آنکھیں جیسے پتھرا سی گئیں۔

دمشق سے بغداد کے راستے میں زیتون کے باغوں، نخلستانوں اور پستہ قامت

پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ سرابوں سے بھی آشنائی ہوئی۔

منظروں میں یکسانیت بھی تھی مگر کہیں کہیں بڑی انفرادیت تھی۔ چھوٹے شہروں کی وضع قطع جدید انداز کی یوں کہ آٹھ دس منزلہ عمارتوں کے پہلو بہ پہلو کشادہ اور صاف سُتھری سڑکوں پر شجر کاری کی بہتات کے ساتھ ساتھ کارخانوں کی چمنیاں دھواں اُگلتی تھیں۔

آسمان کی شفاف نیلاہٹیں کہیں نہیں تھیں۔ دھرتی کے مٹیالے پن کے عکس آکاش کی بلندیوں پر منعکس تھے۔

سرابوں نے بہت گمان دیئے۔ دُور لمبی لمبی ریل گاڑیاں چلتی تھیں۔ دریا نظر آتے تھے۔ پانی کی چاندی جیسی چھلیں مارتی بل کھاتی لہراتی لہریں ابھرتیں اور پھر غائب ہو جاتیں۔ شفاف ہموار سڑک جیسے پستہ قامت پہاڑی منظروں کا عکس دیتی۔

پتھریلی زمین کے اِس سپاٹ سمندر میں کہیں سیاہ پتھروں کی بارش سی برسی ہوئی جیسے کسی شرارتی بچے نے رنگ برنگے بانٹے اُچھال کر یہاں وہاں بکھیر دیئے ہوں۔ کہیں مخمل سی بچھی ہوئی، کہیں بل کھاتے کچے راستے دُور کھجوروں اور کینا کے درختوں سے گھرے گھروں کی طرف جاتے ہوئے نظر آتے۔

سُورج کا غروب ہونا بھی دل کش تھا۔ آتشیں گولا جیسے افق میں ساکت ہو گیا تھا۔ جیسے ٹھٹھر سا گیا تھا اور پھر چند بار پلکیں جھپکنے میں ہی وہ جانے کہاں ڈوب گیا؟

بند شیشوں سے صحرائی زندگی کی صورت کے جتنے رُخ سامنے آئے تھے اُن کے سحر نے دل اور آنکھوں کو عجیب سا مسرور دیا تھا۔

شام کے امیگریشن ڈیپارٹمنٹ سے تو خلاصی جلد ہی ہو گئی پر عراق نے گویا سُو کھنے ڈال دیا تھا۔ ایک تو باتھ رُوموں کی حالت ناگفتہ بہ۔ پندرہ عراقی دینار بھی دینے ضروری اوپر سے خوشبوؤں کی بھرمار۔ انتڑیاں باہر نکلنے کیلئے بے قرار و بے تاب۔ خدا خدا کر کے

انہیں روکا اور سمجھایا۔

''بی بی رحم کرو، کچھ ترس کھاؤ، اتنی اُگل اُچھل دکھانے کی ضرورت نہیں۔ کس نے سنبھالنا ہے تمہیں یہاں۔

ہواؤں کے جھونکے نہیں جھکڑ تھے۔ سبھوں کے راستے دوزخ کے اوپر سے ہو کر آتے تھے۔

صحرائی رات کا حُسن چیک پوسٹوں کی خستہ حال عمارتوں پر جلتے مدقوق روشنی والے بلبوں اور ٹیوب لائٹوں سے ماند پڑا ہوا تھا۔

خانہ خدا کی حالت بہتر تھی۔ مگر اردگرد جنگ کا بکھرا ہوا فضلہ، جیپوں کے انجر پنجر، گاڑیوں کے دانت نکوستے ڈھانچے ساری کہانی سُناتے تھے۔ نماز کے بعد وہیں جائے نماز پر لیٹ گئی۔

شام سے عراق تک اِس اہم شاہراہ پر ''کاش'' ریسٹورنٹ ہوتے۔ بندہ اُتر کر ٹانگیں سیدھی کر لیتا۔ دو گھونٹ چائے پی لیتا۔ اتنا زائر۔ میرے اللہ اِن حکمرانوں کو کب عقل آئے گی؟

ٹورزم کسی بھی ملک کیلئے سونے کا انڈہ دینے والی مرغی کی طرح ہے اور مذہبی سیاحت Religious Toursim تو اِس باب میں سرفہرست ہے۔

امرتسر کے بی بی کے، ڈی اے وی کالج میں سیاحت پر ایک کانفرنس کے دوران کالج کی پرنسپل مسز کاکڑیا نے پاکستان سے جانے والے ہم مندوبین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا پاکستان کا پنجاب ہمارے لئے مسلمانوں کے مکہ مدینہ کی طرح ہے۔ حکومت پنجاب ہمیں تھوڑی سی سہولیات کے عوض اپنی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ کر سکتی ہے۔''ہائے۔'' مجھے محسوس ہوا تھا جیسے میرے اندر کی ہوک نے میرے سارے سر یر میں

اُداسی اور یاس گھول دیا ہے۔ کاش کوئی اِس بات کو سمجھے۔ کاش ہنگامی بنیادوں پر کام ہو۔
دفعتاً پکار پڑی تھی۔ ''حاضر ہو''

پس تو آناً فاناً حاضر ہوگئے تھے۔ کتنے مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ کتنی بار میٹل ڈیٹکٹر نے سینے سے پاؤں تک چڑھائیاں اور اترائیاں کیں۔ چیک پوائنٹ کسٹم پر کھڑے اپنے اپنے پاسپورٹ پر عراق میں داخلے کیلئے مہر لگوانے والوں کی قطار بہت لمبی تھی۔ آخری نمبر پر میں تھی۔ عراق کی تاریخ کا جھمیلا دماغ کی راہداریوں میں اُلٹے سیدھے مارچ پاسٹ میں مصروف تھا تبھی میں نے اُسے دیکھا تھا۔

ملاحت بھرا چہرہ، میک اپ سے سجا، سکارف میں لپٹا، نازک سا وجود جینز اور کھلے بلاؤز میں پھنسا میرے قریب آ کر کھڑا ہوا تھا۔ خوش آئند بات تھی کہ انگریزی اچھی بول لیتی تھی۔

وہ بغداد سے کوئی پنتالیس 45 کلومیٹر پر Mandali شہر کے ایک سیکنڈری سکول میں سینئر ٹیچر تھی۔ مجھے تو ایسا بندہ اللہ دے۔ اُس کا ہاتھ پکڑا اور دروازے سے باہر آ گئی۔

''لگ جائے گی مہر بھی۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

میں نے دردِ دل کا ساز کیا چھیڑا وہاں تو پل بھی نہیں لگا تھا کہ پلکیں بھیگ گئیں۔ لہجے میں جیسے گلہ سا گھل گیا تھا۔

منگولوں نے ہماری تہذیب، ہماری وراثت، ہمارے تمدّنی اثاثوں کو تاراج کر دیا تھا۔ علم و ادب کے خزینوں سے دجلہ کے پانیوں کو سیاہ کر دیا تھا۔

تب خوارزم شاہ نے دنیا کے حکمرانوں سے مدد کیلئے کہا تھا پر کسی نے پرواہ نہیں کی۔ سینکڑوں سال بعد عصرِ حاضر کے ہلاکو خان نے بھی ہمیں تاراج کیا اور کسی اسلامی ملک کے کان پر جُوں نہیں رینگی۔

میں صدام کو بھی قصور وار سمجھتی ہوں مگر اتنی بڑی سزا۔ہسپتالوں میں جانا نہ بُھولیں۔جنگ کی صیح تصویر وہاں نظر آئے گی آپ کو۔اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اور ساتھ ہی میری آنکھوں سے بھی۔

''عراق پر خدا رحم کرے۔خدا رحم کرے۔میرے عراق پر خدا کی رحمت ہو۔''اِس رحمت کی بہت بار تکرار تھی۔

اُسے میں نے اپنے بارے میں بتایا۔اوراس کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کی تو جیسے وہ خوف سے بھرے لہجے میں بولی۔

"خدا کیلئے میرے متعلق کچھ مت لکھیے گا"۔انتہائی کوشش کے باوجود وہ مجھے اپنا نام نہ بتا سکی۔

کلیرنس میں 25000 کے نوٹوں نے اہم کردار ادا کیا۔گروپ کا ایک لڑکا دمشق سے غائب ہوگیا تھا۔پھڈا پڑ جانا تھا کہ بندے پورے کرو۔

پھر جیسے دھیرے دھیرے آسمان پر چراغ جلنے لگے۔رنگوں کی جھلملاہٹوں کی ایک دنیا آباد ہوگئی۔نیلی ،سرخ ، پیلی،سفید ٹم ٹم کرتی روشنیاں۔باہر اندھیرا تھا مگر آسمان روشن تھا اتنا روشن جیسے ننھے مُنّے دیوں کا کھیت سا اُگ آیا ہو۔

گاڑی بظاہر صُورت سے تو بہت اچھی نظر آتی تھی۔پر ایک جگہ چلنے سے انکاری ہوگئی۔میں کہوں میرے لئے ہوئی کہ میرا اندر جان گئی تھی کہ بیچاری بےکل اور مضطرب ہے۔گاڑی میں بڑے روایتی لوگ تھے۔ساتھ کا آج چودھواں دن تھا اور وہ میری صورت کم کم دیکھتے تھے کہ مجھے دمشق کے گلی کوچوں نے نہیں چھوڑا۔

حلب کے میوزیم چمٹے رہے۔حمص میں مرقد خالد پر راز و نیاز کے سلسلے تھے اور اب گاڑی میں باہر نکلنے کیلئے کھڑی ہونے والی پہلی عورت بھی میں ہی تھی۔

ہوائیں تو گرم تھیں ۔صحرا میں رات ٹھنڈی ہوتی ہے اِس کی نفی کرتی تھیں مگر آسمان پرتو بارات سجی ہوئی تھی ۔

جی چاہتا تھا۔گاڑی تو ٹھیک ہی نہ ہو۔یونہی بیٹھی نظارے لُوٹتی رہوں۔شب کو الوداع اور سحر کو خوش آمدید کہوں ۔

''اللہ یہ کہکشاں اتنے قریب کہ بازو پھیلاؤ اور کلاوے میں بھرلو۔''

دوبارہ گاڑی میں بیٹھ کر میں نے آنکھیں موند لی تھیں اُس شرارتی بھُو کے بچے کی طرح جو ماں کے دودھ سے پیٹ بھرنے کے ساتھ ہی پرُسکون نیند سو جاتا ہے ۔

میں پیغمبروں کی سرزمین پر سفر کر رہی تھی ۔میں دنیا کی قدیم ترین ارض تہذیب پر تھی ۔تاریخ عراق کے ورق پھڑ پھڑائے ۔قدیم ترین میسو پوٹیما (Mesopotamia) اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ آئی ۔اسلامی عہد جاہ وجلال کے ساتھ وارد ہوا۔جدید عراق اپنے المیوں کے ساتھ ابھرا۔

معذرت کرتے ہوئے میں نے بس اتنا کہا۔

''دیکھو میں بہت تھکی ہوئی ہوں ۔نیند میری پلکوں پر اُتر آئی ہے ۔تم سے تو مجھے ڈھیروں ڈھیر باتیں کرنی ہیں ۔دل کی باتیں، گہری اور راز کی باتیں ۔آخر یہ تمہاری محبت اور چاہت ہی تو ہے جس میں مبتلا میں دُور دیسوں سے مارو مار کرتی تمہارے پاس آئی ہوں ۔

گھبراؤ نہیں ہر مرحلے پر میں نے تمہاری معیت میں ہی رہنا ہے ۔جگہوں اور لوگوں کے حوالے میں نے تمہاری وساطت سے ہی دیکھنے ہیں ۔

ابھی جس پچھلے پڑاؤ پر گاڑی رُکی تھی وہاں ٹینکوں پر چڑھے امریکیوں کو بندوقیں تانے دیکھ کر میں بہت ڈپریس ہوئی ہوں ۔لو اب اجازت دو ۔''

باب نمبر:3

1۔ زمانے گزر گئے اِن عربوں کے ہاں خارجیوں کی تمیز نہ ختم ہوئی اور نہ ہوگی۔

2۔ صدام کے زمانے میں زبان بندی تھی مگر امن تھا۔اب ہماری زبان کھل گئی ہے مگر امن ناپید ہوگیا ہے۔

3۔ ہلاکو خان کتاب کی عظمت سے آگاہ نہ تھا مگر اس عصر حاضر کے ہلاکو سے زیادہ کون کتاب سے واقف ہو سکتا ہے۔

4۔ عراقی اور افغانی دنیا کی مشکل اور عجیب قومیں اور امریکہ دونوں سے پنگا لے بیٹھا تھا۔

بغداد کا پہلا دا رہی بڑا تیکھا اور کڑا تھا۔خوبصورت چہرے والے ٹیکسی ڈرائیور کو ایک صرف انگریزی کی شُدبُد نہیں تھی۔باقی سب چوبیتوں (ہوشیاریوں) اور سیاحوں کو ڈاج دینے کی چالاکیوں میں وہ اگر دس نمبریا نہیں تو نو نمبریا ضرور تھا۔ٹیکسی میں سوار تین عورتوں میں سے صرف ثروت کے ہاں عربی کا لاما والا دال دلیہ تھا۔میں اور نسرین تو کورے تھے۔

شاہراہوں پر اُگے کھجور کے درختوں کا بانکپن لُو کے تھپیڑوں کے باوجود آنکھوں کو تھوڑی سی ٹھنڈک اور طراوت کا احساس بخشتا تھا۔دائیں بائیں مٹی رنگے یک و دو منزلہ گھروں پر پڑتی طائرانہ سی نظر صحرائی تصویر کے ایک رُخ کو سامنے لاتی تھی۔تیل کے گھر میں

ہونے کے باوجود گاڑی کا ایرکنڈیشنر آن نہیں تھا۔کھلے شیشوں سے دوزخ کی ہوا فراٹے مارتی اندر آتی تھی۔

دوپہر اپنے جوبن کے اعتبار سے اِس درجہ جوان تھی کہ اُس پر آنکھ کا ٹکنا محال تھا۔

کوچ سے اُتر کر بغداد کی دھرتی پر قدم رکھا تھا اور جہاں رکھا تھا وہ ایک ویران اور آگ میں تپتا بلتا وسیع وعریض بس ٹرمینل یارڈ تھا۔خارجیوں کا بس سٹینڈ۔زمانے گزر گئے اِن عربوں کے ہاں خارجیوں کی تمیز نہ ختم ہوئی اور نہ ہوگی۔

باہر سڑک کشادہ تھی اور دونوں سمت بازار تھا اور منظر من وعین مردان ونوشہرہ کے قصباتی بازاروں جیسا تھا۔اِس اتنے بڑے جتھے کو پیدل مارچ کیلئے کہا گیا۔کچھ بہت ہی تھکی ہاری شکستہ دم عورتوں کو چوبی ریڑھیوں میں بٹھادیا گیا۔بالکل ویسی ہی ریڑھیاں کہ جن میں ٹوٹے پھوٹے اعضاء والے لوگوں کو بٹھا کر بھیک مانگی جاتی ہے یا سامان کی ڈھویا ڈھائی ہوتی ہے۔

اب ستم سا ستم تھا۔پیکج والوں کی ٹکے ٹکے کو بچانے والی کمینگیاں تھیں یا کام کی منصوبہ بندی کا جھٹکہ پن کہ دمشق سے ڈھائی بجے چلنے والے بھیڑ بکریوں کے اِس ریوڑ کو جس طرح رگیدا گیا۔وہ تو بڑا ہی انسانیت سوز تھا۔چیک پوسٹوں پر ناکہ بندی کے مرحلے یا وردی والوں کی تنی ہوئی سنگینوں کے سایوں میں گنتی جبر اُپڑاؤ کے کھاتے میں تھی۔وگرنہ تو بگٹٹ ''بھاگتے چلو'' والی پالیسی تھی۔انگوروں،کھجوروں کے باغات،ٹیالی پُرشکوہ بغداد کی عمارتوں اور دجلے کو بہتے دیکھ کر سکون بھرا سانس تھا۔

''چلو اب پڑاؤ ہوگا۔پر نہیں جی۔سامرہ کا ناکا بھرنا ہے اور واپسی امام محمد کے مزار پر حاضری دینی ہے۔پھر کہیں بغداد میں داخلہ ہوگا۔ہرصورت ایک دن بچانا ہے۔''

ناشتے کیلئے ایک جگہ رُکے۔کیا غریب الوطنی کا سا سماں تھا کہ صرف ایک بوتل

پانی ۔راستے میں جابجا بنی چیک پوسٹوں پر فوجیوں کے پُرے طبیعت پر حُزن وملال کے سائے گہرے کیے دیتے تھے ۔ریت کی بوریاں مدافعتی دیواروں کی صورت دھارے اپنے گردوپیش جنگ کا فضلہ بکھیرے نظر آتی تھیں ۔ہاں اِن فوجی چوکیوں پر پیلے پھولوں کی لمبی سی بیلیں ضرور لہرا رہی ہوتیں ۔عراقی پھولوں سے پیار کرتے ہیں ۔موسیقی کے رسیا ہیں اور اب ٹینک توپوں میں اُلجھ گئے ہیں ۔

صحرائی راستے کی ویرانی دھوپ کے پیار میں اپنا رنگ لیے ہوئے تھی اور نخلستانوں جیسے مناظر بھی جابجا تھے ۔دجلہ کے پانیوں پر مرغابیوں کے ڈیرے اُترتے اور اڑتے، کناروں پر بنے خالی گھروں کے آگے وسیع وعریض کھیتوں کے سلسلے تھے ۔کھجوروں کے جھنڈ تھے اور میں نے خود سے کہتے ہوئے آنکھیں بند کرلی تھیں ۔

''یہ لوگ خانہ پری کے چکر میں ہیں ۔مجھے تو دجلہ اور فرات کو آرام سے دیکھنا ہے ۔یقیناً میرا خدا کوئی ایسی سبیل میرے لیے ضرور پیدا کرے گا۔اس وقت تو بھوک پیاس سے حشر ہوا پڑا ہوا ہے ۔میں بہت نڈھال ہوں ۔''

سامرہ کے تپتے ،بگولے اڑتے صحرا میں امام علی ال حادی اور امام حسن ال عسکری کے مزار جیسے صحراؤں میں جنگلی گلابوں کی طرح کھلے ہوئے تھے ۔تاہم اس وقت کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا نہ طرزِ تعمیر کا حسن، نہ اُن کی دلربائی ۔بس اگر مجھے اچھے لگے تھے تو خطائیوں جیسے وہ بسکٹ جنہیں میں نے بڑی ڈھٹائی سے تین چار بار مانگ مانگ کر کھایا اور قہر برساتی گرمی میں لنگر سے ملنے والی قہوے کی دو چھوڑ تین چار گلاسیوں کو پی کر زہر کو زہر سے مارنے کی کوشش کی تھی ۔

بغداد کے مضافات میں بھی امام محمد کا مقبرہ اُس اُجڑے پجڑے قطعے میں کسی عورت کے بدصورت ہاتھ میں پہنی ہوئی فیروزے کی خوشنما انگوٹھی کی مانند دکھتا تھا ۔

میں گاڑی میں ہی بیٹھی ویرانیوں کو گھورتی اور کڑھتی رہی تھی۔سارا منظر سبّی اور جیکب آباد کے کسی قصباتی جگہ جیسا تھا۔مٹی دھول کی دھند میں لپٹے کچے گھر،ہواؤں کے بگولوں سے اڑتے پھرتے شاپروں کی یہاں وہاں بکھری بہار۔ ہائے یہ بغداد کیسی بے سرومانی کا شکار نظر آتا تھا۔

اب میں خود سے کہتی تھی کہ یہ کون سے امام محمد ہیں؟ جس امام محمد سے میں آشنا ہوں ۔وہ فقہ کا بڑا امام تفسیر وحدیث اور ادب میں اجتہاد کا درجہ رکھنے والے ہیں جن کے بارے میں انہی کے ایک ہونہار شاگرد امام شافعی کا کہنا ہے کہ میں نے قرآن مجید کا عالم امام محمد سے بڑھ کر نہیں دیکھا۔فقہ حنفی والے انہیں بہت مانتے ہیں۔

میرے خیال میں یہ محمد بن الحسن نہیں ہو سکتے۔مجھے یاد آیا تھا وہ تو رے میں فوت ہوئے تھے۔ہارون رشید ساتھ تھے۔

اس وقت تو میں مزید تفصیل کے موڈ میں نہیں تھی ۔جو بھی ہوں گے اللہ کے نیک بندے ہی ہوں گے۔

میں نے بھوک کے ہاتھوں آنکھیں موند لی تھیں۔

اوراب بغداد کی سرزمین پر میں سر پہ ہیٹ اوڑھے دم بخود کھڑی تھی ۔گنہگار تھی نہ۔بغداد کے آسمان پر بادل کا چھوٹا موٹا ٹکڑا چھوڑ خشخش کے دانے جتنا دھبہ بھی نہ تھا۔

"یہ تو نزی سن سٹروک کے منہ میں جانے والی بات ہے۔"نسرین نے کہا۔

میں نے قریب سے گزرتی ٹیکسی کو ہاتھ دے دیا اور ذرا آگے چلتی ثروت کو بھی کھینچ لیا۔سالار کارواں آگے چلتے تھے۔ٹیکسی ان کے پاس جا کے رُکی۔میں نے گردن نکال کر ہوٹل کا نام پوچھا۔

''باب المراد''

ہم کاظمین کے علاقے میں تھے۔ حضرت امام موسیٰ کاظم کے روضہء مبارک کے سنہری گنبد اور نقشین میناروں نے بہت دُور سے ہماری توجہ کو کھینچ لیا تھا۔

مگر مصیبت تو یہ آن پڑی تھی کہ ہم اپنے بقیہ ساتھیوں سے بچھڑ گئے تھے۔

ہونٹوں پر ”بابُ المراد بابُ المراد“ کا ورد تھا۔

چوک میں کھڑے پولیس مین نے انگریزی میں کہا۔ ”حرم کی جانب بازار بیرونی دیوار ساری کی ساری بابُ المراد کے نام سے جانی جاتی ہے۔ فندق (ہوٹل) کا نام بتایئے۔ وہ نام کیا تھا؟ جانے میری بلا۔ اب وہ دونوں مجھے دیکھتی تھیں۔ میں چُپ۔ بولوں کیا؟

اِس اندر کو تو اللہ سمجھے۔ بس ذرا موقع ملا اور فضیحتا شروع۔ اب منہ میں گنگھنیاں ڈال لی ہیں۔ چلی تھی بڑی ابنِ جبیر بننے۔

ٹیکسی والے نے چار پانچ چکر لگا کر تُرشی سے کہا تھا۔ ”اُتر جائیں۔“

اب اُسے پانچ ڈالر دے رہے ہیں اور وہ ماش کے آٹے کیطرح اینٹھا جا رہا ہے۔ دیلوں کیطرح ایک ایک ڈالر کا اضافہ کرتے ہوئے بالآخر میں نے آنکھیں دکھائیں۔

”چلو دفع ہو جاؤ۔ بیچ منجھدار چھوڑ کر بھاگ رہے ہو۔ اوپر سے اکڑتے بھی ہو۔“

اُس کے پلّے خاک پڑنا تھا۔ جیسے ہماری پھٹکار اس کے سر پر سے گزری تھی اسی طرح وہ بھی بکتا جھکتا ہماری ہی طرح ہمیں پھٹکارتا ٹیکسی بھگا لے گیا۔

اب کھڑے ہیں۔ کاظمین بہت پُر رونق نظر آ رہا تھا۔ جگہ جگہ چیک پوسٹیں جھلکنے کے باوجود اِس تلخ حقیقت کی عکاسی کرتا تھا کہ پانچ سال گزرنے کے باوجود بغداد ابھی بھی خطرے سے بھرا ہوا ہے۔

اب بہت سارے سوالیہ نشان سامنے تھے۔

''دیکھو میں نے کہا۔ اسلام کی اتنی عظمتوں والی ہستی موسیٰ ابو الحسن امام جعفر صادق کے بیٹے کے علاقے میں ہیں۔ گھبراہٹ کس بات کی؟ چلو پہلے کچھ کھا پی لیں۔''

سامنے جنرل سٹور تھا۔ پانچ ڈالر بھنائے تو تقریباً ساڑھے پانچ ہزار کے عراقی دینار ہاتھوں میں آگئے۔ دودھ کے بڑے ڈبے اور سیون اپ کی بوتلوں سے گرمی کو مارا اور دوکاندار سے ذرا احوال پوچھا۔ صدام او رموجودہ صورت کا موازنہ جاننا چاہا۔

متین سے مرد کا جواب تھا۔

''صدام کے زمانے میں ہماری زبان بند تھی مگر امن تھا سکون تھا پر اب ہماری زبان کھل گئی ہے۔ ہم بول سکتے ہیں مگر امن وامان کی صورت انتہائی مخدوش ہے۔ آپ گھر سے نکلتے ہیں تو جانتے نہیں کہ واپسی ہوگی یا نہیں۔''

''ہائے وے میریا رباوہی وطن والا حال۔''

پاس کھڑا دوسرا عراقی امریکہ کے بارے میں بولا تو لگا جیسے لہجے میں زہر گھل گیا ہو۔

''لعنتی۔ ساتھ ہی زمین پر تھوک دیا۔ صدام بھی لعنتی۔'' ایک بار پھر تھوکا۔

طے پایا کہ روضہء مبارک کے اندر چلتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی نظر آجائے گا۔

روضہء مبارک تک دو رویہ ہوٹلوں اور دُوکانوں کا سلسلہ چلتا ہے۔ زائرین کے پُرے دوپہر کی ان دوزخی ساعتوں میں بھی سڑکوں پر گھومتے پھرتے اور دوکانوں کے اندر آ جا رہے تھے۔ چیک پوسٹ پر تفصیلی چیکنگ کے مرحلوں سے گزارا جا رہا تھا۔

پسینے کی دھاریں پشت پر بہتی تھیں۔ وہ والی بات ہوگئی تھی موسیٰ ڈریا موت توں تے موت اگے (یعنی جتنا دھوپ میں چلنے سے ڈرتے تھے اتنا ہی چلنا پڑ رہا تھا)۔

دفعتاً ثروت چلائی۔ ''وہ دیکھو باب المراد فندق۔''

سُوکھے دھانوں پانی پڑ گیا۔خوشی خوشی سیڑھیاں چڑھیں۔آدھ گھنٹہ مغز کھپائی کی۔سب لاحاصل۔پھر جیسے اُنہیں کچھ سمجھ آئی۔ایک آدمی "چلو آؤ" کا تاثر دیتا اِن کواچی بھیڑوں کو ہانکنے لگا۔جہاں لا کر کھڑا کیا وہ بیوٹی سیلون تھا۔

اب وہاں کھڑے ہنستے ہوئے سوچتے،ایک دوسرے سے پوچھتے اور کہتے ہیں کہ بھلا یہاں لانے کی کیا تُک؟

"اوہو"ثروت نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

میر کارواں کا حُلیہ بتاتے ہوئے اُنکی آنکھوں کی ایک خصوصیت کی تمثیلی وضاحت ہوئی تھی تھوڑا سا بھینگا پن تھا وہاں۔خیال تھا کہ وہ عرصہ تیس 30 سال سے مسلسل زیارتی گروپوں کے ساتھ یہاں آجا رہے ہیں تو یہ ہوٹلوں والے انہیں پہچانتے جانتے ہوں گے۔یہ نہیں معلوم تھا کہ ماروں آنکھ پھوٹے گھٹنا والی صورت پیدا ہو جائے گی۔بڑھیوں کو تھریڈنگ اور فیشل کی ضرورت تھی۔واہ بھئی واہ۔

ایک دوکان کے آگے دھری خالی کُرسیوں پر بیٹھتے ہوئے مدھو بالا نے ہاتھ اٹھائے اور جلیل القدر شخصیت ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظم سے کہا۔

''حضور آپ کے گھر آئے ہیں اور بھٹک رہے ہیں۔کچھ تو خیال کیجئے۔''

ابھی ہاتھ میں پکڑا کولا کا ٹن ختم بھی نہ ہوا تھا کہ دائم زمان نے آواز دی'' آنٹی آپ لوگ کہاں پھر رہی ہیں؟ ہوٹل اِدھر ہے۔''

اب تاسف سے کہتے ہیں۔

''ارے یہ تو وہی جگہ ہے کئی بار گزرے تھے ہم جہاں سے۔''

ہوٹل فندق ذوالفقار تھا تو حرم کے پہلو میں۔پر تھا بس ایویں ہی۔لفٹ ندارد کمرے میں پہلا استقبال لوڈشیڈنگ نے کیا۔دوسرا اُن چار بوڑھی عورتوں نے جو

ریڑھیوں میں لد کر یہاں پہنچی تھیں اور اب بستروں پر چڑھی بیٹھی آنکھیں جھپکتی کہتی تھیں۔

''تُسی بڑیاں ظُلمتر یاں او۔کتھے رہ گیاں سو(تم لوگ بڑی ظُلمتر یاں ہو۔کہاں رہ گئی تھیں)۔بجلی آئی تو دیکھا چھ بیڈ۔ایک پر ایک چڑھا ہوا۔

''اللہ رحم کرے۔اگر رات کے اندھیرے میں باتھ روم جاتے ہوئے کسی ایک کی دوسرے پر چڑھائی ہوگئی تو کھوپڑے میں پلپل کرتا بھیجا باہر نکل کر فرش پر نہ بھی گرا تو بھی پسلیاں اور ہڈیاں کسی ہوچھے کی یاری کی طرح تڑاخ کر کے ٹوٹے ٹوٹے ہوسکتی ہیں۔انہی منگتی ریڑھیوں میں لدلدا کر بغداد کے ہسپتالوں میں داخلہ ہوگا۔اللہ ویری دشمن کو جو صبح اٹھ کر سات جوتیاں بھی مارے اُسے بھی بغداد کے ہسپتالوں سے بچائے کہ صدام دور میں غریب غرباء دوائیں نہ ملنے کے باعث زخموں کے ناسور بننے پر مرتے تھے۔پھر امریکیوں کے پیٹریاٹ میزائلوں اور کلسٹر بموں کے زخمی اسپتال پہنچتے بعد میں تھے مر پہلے جاتے تھے کہ جانتے تھے وہاں جانے کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

اب وہ سامی نامی خود تو اوٹ میں ہوگئے ہیں۔اپنے چیلوں چانٹوں اور بالکوں کو آگے کر دیا ہے۔جو اپنے ہی لوگوں کو خودکش دھماکوں میں کٹے پھٹے اعضاء کے تحفے اور آنکھوں میں دُکھ اور حسرتوں کے دھوئیں عنایت کر رہے ہیں۔

مولا مندی لکھی نالیوو۔

نسرین نے کہا۔''ذرا میر کاروان سے تو کہو۔''

''نہ بی بی نہ۔میں نہ بولوں۔قلیتی بندہ ہوں۔نکو بن جاؤں گی۔تم نکلو باہر۔شور مچاؤ۔''

بتی آئی۔تھوڑی سی کھینچا تانی ہوئی۔کچھ اِدھر کچھ اُدھر والا معاملہ ہوا۔چلو سانس تو آنے لگا۔اٹیچی کیس پائینتی پر رکھا۔بیگ وغیرہ سرہانے سجایا اور کمر سیدھی کرنے لیٹی۔

آرام خاک کرنا تھا۔دماغ پر بغداد سوار تھا۔ڈی ہائیڈ ریشن کا خوف تھا۔آدھ گھنٹہ بھی نہ لیٹ پائی۔

ہوٹل کے ریسپشن پر جولڑکا بیٹھا تھا مروان تھا۔انگریزی صاف ستھری بولتا تھا۔تعارف کروایا تو پاس بٹھالیا۔کمپیوٹر پر بغداد کے شب و روز دوڑنے لگے تھے۔کتنی تصویریں اُن بدقسمت عراقیوں کی دکھادیں جوسڑکوں پر مرے پڑے تھے۔کسی کی ٹانگیں غائب، کسی کا سر غائب، کہیں بازو، کہیں دھڑ ندارد۔جلتی عمارتیں،شعلے اُگلتی گاڑیاں اور اِن قیامت جیسے لمحوں میں سامان لوٹتے لوگ۔

سکرین پر نئے منظر اُبھرے تھے۔

قُرآن لائبریری، بغداد لائبریری آگ میں جل رہی تھیں۔عہدعثمانیہ کے بے حد قیمتی نُسخے ،قرآن پاک کےقدیم ترین مخطوطے فٹ پاتھوں پر، سڑکوں پر ادھ جلے ٹکڑوں اور پورے جلے راکھ کے ڈھیروں کی صورت پڑے تھے۔ایک پڑھی لکھی قوم کا گھٹیا پن، چاند پرکمندیں ڈالنے والے ایسے وحشی، ظالم اورانسانیت سے عاری لوگ۔

ہلاکوخان جاہل تھا۔اُسے کتاب کی عظمت سے آگاہی نہ تھی۔عہدعباسیہ خصوصاً عہد ہارونی میں یونانی ،رومی، سنسکرت، ژند، فارسی، سریانی،قبطی زبانوں میں لکھی گئی نادر کتابیں جنہیں دنیا بھر سے بغداد لاکرتراجم کی صورت جس انداز میں محفوظ کیا گیا۔اُس نے علم و آگہی کے دیئے یوں روشن کیے کہ بغداد جگمگا اُٹھا۔انسانی فکر کوجلا ملی اورشہرعلم و ادب کا گہوارہ بن کر پوری دنیا میں ممتاز ہوا۔اُس وقت کی دُنیا کے دو ہی تو نام تھے۔بغداد اور قرطبہ۔

ہلاکو یہ سب نہیں جانتا تھا۔اسی لیے اُس نے دجلہ کا پانی سیاہ کردیا تھا۔غرناطہ کے عیسائی تو کتاب کی اہمیت سے آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ کتاب دنیا کا مشترکہ اثاثہ ہے

انہوں نے کیوں راکھ کے ڈھیر لگائے؟عصر حاضر کے ہلاکو خان سے زیادہ بھلا کتاب سے کون واقف ہوسکتا ہے؟

پھر۔

ایک بڑا سوال میرے سامنے تھا۔

شاید وہ نئی صدی کے انسان کوانسانیت کے اِس تحفے سے نوازنا چاہتا تھا۔

میں نے سر جھٹک کر سکرین پر نظریں جمادی تھیں۔

مروان صدام کی بعض پالیسیوں کا ناقد تھا۔بعض کا حامی۔تعلیم پر حکومت کی خصوصی توجہ۔مفت اور لازمی۔ہر عراقی اسی لیے پڑھا لکھا ہے۔ملک کے طول وعرض میں صاف پانی کے پلانٹ۔ظالم بھی بڑا تھا۔اپنے دامادوں اور بیٹے تک کو نہ چھوڑا۔بیچاری عام پبلک کس کھاتے میں؟

کلک کلک ہوئی تھی۔اُودے حسین سکرین پر نمودار ہوا۔صدام کا بڑا بیٹا۔بڑا رعنا جوان تھا۔قصےحسین کو بھی دیکھا۔وہ بھی شہزادہ تھا۔دونوں بیٹے امریکیوں کے خلاف مزاحمت میں مارے گئے۔اُودے حسین کی کہانی نے لرزا دیا۔

میرے تو سارے وجود نے جھرجھری لی تھی۔صدام کے گہرے دوست اور اُودے کے درمیان جھگڑا ہوگیا۔دوست مارا گیا۔صدام کو معلوم ہوا۔پہلے تو بیٹے کو مار مار کر اُس کا بھرتہ بنایا۔ہسپتال پہنچایا پھر عدالت میں گھسیٹا۔ماں نے بیٹے کو بچانے کیلئے کوشش کی تو اُسے خاتون اوّل کے سارے اعزازات سے محروم کردیا۔ساجدہ اُسکی چچا زاد،بچپن کی ساتھی،رازدار،بچوں کی ماں۔زندگی کے ہر اُتار چڑھاؤ میں اُس کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑی۔اُسے سزا دی۔دوست کی بیوی سے شادی کی اور سمیرا خاتون اوّل بن گئی۔

دونوں بیٹیوں راغدہ اور رعنا کی شادیاں اپنے سگے بھانجوں سے کیں۔سسر اور

داما دوں کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں ۔دونوں داماد اپنی بیویوں کے ساتھ امریکہ چلے گئے جہاں وہ ہاتھوں ہاتھ لیے گئے ۔انہیں واپس لانے میں شاہ اردن نے بڑا کردار ادا کیا۔

بیچارے بغداد آئے تو پہلا کام دونوں کو قتل کرنے کا ہوا۔

سکرین پر بڑی خوبصورت لڑکیاں پھول جیسے بچوں کے ساتھ دیکھیں تو بے اختیار افسوس کے پاتال میں گرتی چلی گئی ۔کیا انسان تھا؟ کیسی شخصیت تھی؟ سفاک، بے رحم، نرالا اور انوکھا۔

خلیجی جنگ پر اپنی قوم سے خطاب پر سلامتی کونسل کے جس انداز میں لتے لیے گئے میں تو اُس کا ترجمہ سُن کر دنگ تھی ۔جارج بُش کے والد سینئر بُش کو جو خط لکھا گیا وہ بھی بڑا اہم تھا۔

اُس کے ہاں کہیں رتی برابر ابہام نہیں تھا ۔ڈنکے کی چوٹ پر اُس کا بیان تھا کہ امریکہ کو صرف اور صرف ہمارے تیل میں دلچسپی ہے ۔عربوں کو غلام بنانا اُس کی خواہش ہے۔

وہ احمق تھا، بہادر تھا، کیا تھا؟ ابھی تو خیر سے میرا ابتدائے عشق تھا۔

سفارتی دُنیا کے ایک معتبر امریکی سفارت کار ریان سی کروکر Rayan C Croker کے الفاظ یاد آئے تھے ۔عراقی اور افغانی دنیا کی مشکل اور عجیب قومیں ہیں۔

اور وہ دونوں سے پنگا لیے بیٹھے تھے۔

بغداد کا نقشہ پوچھا نہیں تھا ۔پر اُنے بغداد کیلئے رہنمائی چاہی۔

یہ کاظمین یا الکاظمیہ AL.Kazimiaa ملحقہ حریہ (Huriya) آگے قدیم شہر یہیں وہ جگہ جہاں مدینۃ المصور کی بنیاد رکھی گئی ۔بس ذرا احتیاط۔ بغداد میں لاء اینڈ

آرڈر کی صورت خاصی مایوس کن ہے۔شنوائی نہیں۔کسی کو ساتھ لے لیں۔بم دھماکوں کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔

بم دھماکوں کی وجہ پوچھنے پر مروان بولا تھا۔

"خیر سے استعماری طاقتیں مفاد پرست سُنّی اور شیعہ ٹولوں کو لڑا لڑا کر مروا رہی ہیں۔دونوں بڑے فرقے ایک دوسرے کا بیج مارنے میں دل و جان سے مصروف ہیں۔

ڈپریشن سا ہونے لگا تھا۔کمرے میں آکر بیڈ پر بیٹھ گئی۔لیٹ گئی۔پھر اُٹھ بیٹھی اور پھر باہر نکل گئی۔

دو رویہ دوکانوں میں طعام خانے تھے۔کپڑے تھے۔ڈھیروں ڈھیر سونا آنکھوں کو چندھیاتا تھا۔تربوز، گرما، انگور اور مالٹے تھے۔بڑے بڑے تھالوں میں تلوں سے سجے گرما گرم طبون تھے جو تازہ تازہ بیکریوں کے تندوروں سے نکل کر آئے تھے۔

دھوپ کا جوبن تھا اور لوگوں کے پُرے تھے۔رونقیں اور گہما گہمی تھی۔رنگا رنگ کھجوریں تھیں۔کہیں بچپن چھلانگ مار کر سامنے آ گیا تھا۔جب ریڑھیوں والے آوازیں لگاتے تھے۔کھجوریں بصرے کی۔یہ بصرہ ہمیشہ سے ذہن کی گپھاؤں میں بیٹھا ہوا تھا۔چلو اب بصرہ میں تو نہیں پر اُس سرزمین پر تو تھی۔

سو ڈالر بھنایا تو تقریباً ایک لاکھ سولہ ہزار کے نوٹ ہاتھ آئے۔۲۵ ہزار کا نوٹ باہر رکھا۔بقیہ پرس میں گھسیڑا۔دودھ لیا۔۱۰ کلو وزنی تربوز اُٹھایا۔کرنسی اتنی بے وقعت سی تھی کہ سینکڑوں چھوڑ ہزاروں کے نوٹ بے اوقاتے اور بے توقیرے تھے۔

صد شکر کمرے میں مُنّی سی فرج تھی۔کسی سے پلیٹ چھُری مانگی۔کپڑا بچھا کر آدھے تربوز کو دوائی جان کر ٹھونسا۔صبح سے اناج نام کی ایک کھیل اندر نہیں گئی تھی۔نسرین اُونگھتی تھی۔فرج میں بقیہ آدھا رکھ کر اُسے کھانے کو کہا۔منہ ہاتھ دھویا۔کنگھی پٹی کی۔بزم

ڈوپٹے کا حجاب بنا کر اوڑھا۔عبایا پہنی اور نکل پڑی۔

مجھے اس مختصر سے وقت میں یہ اچھی طرح سمجھ آ گیا تھا کہ میرا وہ بسوں ٹراموں میں بیٹھ کر ہر نئے مُلک میں اُس کے شہروں سے متعارف ہونے کا سستا ترین پیکج فارمولا یہاں عراق میں نہیں چلے گا۔شہر اور ملک جس ابتلا سے گزر رہا ہے وہ ایسی من مانی کی اجازت نہیں دیتا۔ مجھے ڈالروں والی تھیلی کا منہ کھولنا ہے۔سلامتی اور تحفظ سے بغداد کو دیکھنا ہے۔

روضہ مبارک کی بیرونی دیوار کے سامنے کا سارا علاقہ بازاروں اور ہوٹلوں سے بھرا پڑا ہے۔بڑے بڑے تنبو نما چیک پوسٹوں پر بیٹھی لڑکیاں جدید وضع کے میٹل ڈیٹکٹر ہاتھوں میں پکڑے آپکو خارجی جانتے ہوئے دھیمی سی مسکراہٹ لبوں پر بکھیرے آپ کے سینے سے ٹانگوں تک پھیرتے اور اوکے کرتے ہوئے باہر کا اشارہ کر دیتی ہیں۔

ٹیکسی سٹینڈ تک آتے آتے میرے ہونٹوں پر دعائیں تھیں۔اپنی آرزوں کے شہر بغداد کی سرزمین پر قدم دھرنے کی خوشی تھی۔اس خوشی کے سنگ سنگ خدشات کی بھی ایک لام ڈور تھی۔

میں نے چلتے چلتے اپنے آپ سے کہا تھا ”کہ اب دھماکوں سے کیا ڈرنا۔آئی نے جیسے لکھا گیا ہے آنا ہی ہے۔بندہ ڈریا موت توں تے موت اگے۔وہاں دیس میں بھی تو یہی سب ہوتا ہے۔“

اور جب میں ٹیکسی ڈرائیوروں سے بات کرتی تھی جو شہد کی مکھیوں کیطرح ارد گرد آ کھڑے ہوئے تھے۔نظریں عینک کے سیاہ شیشوں کے عقب سے چہروں کو تنقیدی انداز میں ٹٹولتے ہوئے ایک قابل اعتماد،ایک قابل بھروسہ بندے کیلئے خدا کی مدد کی طلبگار تھیں۔

پھر جیسے وہ ٹھک سے میری نظروں کو بھا گیا۔کوئی پچیس چھبیس کے چکر میں

ہوگا۔مہذب،سنجیدہ، متین سا۔آنکھیں جیسے اندر کے کسی دُکھ کوعیاں کرتی ہوں۔انگریزی میں رواں تھا۔بس پتہ نہیں میرا دل اُس سے سودے بازی اور نمک مُکا پر کیوں نہ مائل ہوا؟

دروازہ کھول کر بیگ سیٹ پر پھینکتے ہوئے میں خود کو رب کائنات کی تحویل میں دے چکی تھی۔کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں نا جن پر اعتماد کرنے کو دل گواہی دیتا ہے۔

اور وہ چہرہ بھی ایسا ہی تھا۔

گاڑی میں بیٹھنے کے ساتھ ہی میرے اندر کی شوخ وچلبلی سی خواہشیں فی الفور پھسل کر ہونٹوں پر آگئیں۔

میں نے خود سے سوال کیا۔

''مجھے سب سے پہلے کہاں جانا ہے؟''میرے اندر نے فی الفور جواب میں کہا تھا۔

''دجلہ پر۔''

دجلہ پر دیر تک ٹھہرنا ہے کہ مجھے اُس سے باتیں کرنی ہیں۔شام کو رخصت ہوتے،سورج اور اس کی کرنوں کو دجلہ کے پانیوں پر اُترتے ہوئے دیکھنا ہے۔پھر مجھے اُس قدیم ترین بغداد سے ملنا ہے جس کا سحر مجھے یہاں لایا ہے۔دن کی روشنیوں میں، رات کی روشنیوں اور تاریکیوں میں جنگوں سے متاثر لوگوں سے ملنا ہے۔اسپتالوں میں جانا ہے۔

امام اعظم جناب ابوحنیفہ، جناب ابوموسیٰ کاظم اور پیران پیر غوث اعظم کے روضہ مبارک پر حاضری صبح پاک صاف ہوکر ہوگی۔''

عینک اُتار کر اُس سے مخاطب ہوئی جو افلاق تھا اور جو مجھے بھرے مجمع میں بڑا منفرد لگا تھا۔

''عراق تہذیبوں کا گھر اور بغداد مسلمانوں کی عظمتوں کا نشان جسکی کہانیاں پڑھ

پڑھ کر ہم بچپن سے اسکی محبت میں گرفتار ہیں ۔یہ دجلہ اور فرات جن کے کناروں پر ہمارے آباء کے قافلے اُترے اور جنکے پانیوں میں ان کے گھوڑوں نے چھلانگیں ماریں ۔

میں بہت دور سے آئی ہوں ۔محبّتوں اور چاہتوں کے اس سفر میں اکیلی بھی ہوں اور خوف زدہ بھی ۔بس اتنی سی منّت ہے کہ بغداد کو دکھادو ۔اُس سے بصری تفصیلی تعارف کروادو ۔اس کے زخمی اور بدحال لوگوں سے ملادو ۔تمہارا احسان یاد رکھوں گی ۔''

اب آواز میں بھی جذبات ہوں ۔آنکھوں میں بھی ۔اور چہرہ بھی انہی تاثرات میں بھیگ جائے ۔مخاطب بھی جوان بچہ ہوتو متاثر ہونا ضروری امر ہے ۔

''کیسے وقت میں آئی ہیں آپ ۔ہم بدقسمت لوگ تو شعلوں کی برستی بارش میں نہا رہے ہیں ۔آتش فشاں کے کھولتے لاوے میں بہہ رہے ہیں ۔

کلیجے پر گھونسہ لگا ۔کیا کہتی؟تھوڑی سی چپ کے بعد لڑکا بولا ۔

''آپکو اپنے گھر لے کر جاتا ۔ماں بہنوں سے ملاتا ۔''

میں اُس کے سنجیدہ سے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہے بغیر نہ رہ سکی ۔

''خواہشیں کتنی بھی منہ زور کیوں نہ ہوں ۔دانے پانی کا اختیار بھی بہت اہم ہے ۔ہاں یہ شعلوں اور آتش فشاں کی بھی تم نے خوب کہی ۔پاکستانی بھی تو اسی بربریت کا شکار ہیں ۔آگ اور شعلوں میں گھرے ہوئے ہیں ۔ ہمارے فیصلے، ہماری پالیسیاں، ہمارے حکمران، سب غیرت وحمیت سے عاری مغرب کے غلام ہیں ۔انکے دست نگر ۔تمہاری عنایت ہوگی اگر تم اپنے گھر مجھے لے کر جاؤ ۔''

کون سے گھر؟ لمبی سی آہ اس کے سینے سے نکلی تھی ۔گھر تو کوئی رہا ہی نہیں ۔ماں بہنیں سب بمباری میں مرگئیں ۔گھر زمین بوس ہوگیا ۔

''تو تم کہاں تھے؟''

میں زکو(Zakhu) شمالی عراق میں تھا۔عراق پٹرولیم کمپنی میں اپنی جاب پر۔
چار دن بعد پہنچا تھا۔المامون میں میرے انجنیئر ابا کے ہاتھوں کا بنا ہوا خوبصورت گھر تو
20 مارچ کی خوفناک صبح کی وحشیانہ بمباری میں ہی زمین بوس ہو گیا تھا۔اوراس میں رہنے
والی مہربان صورتیں جانے کہاں اور کن کمروں میں رزق خاک ہوئیں۔مجھ سے چھوٹی بہن
جوصرف دو ماہ بعد بیاہی جانے والی تھی نے جانے اپنی خوابوں سے معمور آنکھوں سے کیسے
موت کو آنگن میں اترتے دیکھا ہوگا؟ مجھے تو ان کا آخری دیدار بھی نصیب نہ ہوا۔نہ کہیں
قبریں نہ کہیں غسل کا اہتمام اور نہ کفن دفن کہ بغداد کربلا بنا ہوا تھا۔اور صدام کے محل پر
وحشیانہ بمباری ہورہی تھی اور المامون کا علاقہ گرین زون سے بہت قریب تھا۔

وہ کیمیکل ٹیکنالوجی میں ایم ایس سی کیمیکل انجنیئر اب ایک ٹیکسی ڈرائیور ہے کہ
ملازمتوں کا قحط پڑا ہوا ہے۔یوں سیاحت،تاریخ سے دلچسپی اور گائیڈ جیسے شوق اور مشاغل
اُس نے زمانہ طالب علمی سے پال رکھے تھے۔اُس کی چھٹیاں اکثر و بیشتر غیر ملکیوں کے
ساتھ گزرتیں۔باپ اُس کی ان بے قاعدہ اور بے ڈھبی سی سرگرمیوں سے بڑا الرجک رہتا
تھا۔جاب تو اُسنے کوئی سال بھر پہلے شروع کی تھی۔سب کچھ لٹ جانے پر اُسے تو مہینوں کچھ
یاد ہی نہیں رہا تھا۔ایک بار خودکشی کی کوشش کر چکا تھا۔کاظمیہ کے علاقے الحریت میں رہنے
والے چچا چچی نے بانہوں میں سمیٹا ہوا ہے۔ان کا بہت ممنون تھا۔

''آپ کو لے کر چلوں گا ان سے ملانے۔اِس ٹیکسی ڈرائیوری نے مجھے زندگی کی
طرف دوبارہ کھینچا ہے کہ میں لوگوں کے دُکھوں کو سنتا ہوں اور اپنے بھولتا ہوں۔درد میں
ڈوبے گیت احساس دلاتے ہیں کہ زندگی ابھی باقی ہے۔مجھ جیسے لوگوں کیلئے۔علی اسماعیل
عباس جیسے بچوں کیلئے جس کا کوئی عزیز بھی نہیں بچا۔جس کے بازو بھی نہیں بچے جس کے
ڈاکٹر بننے کے خواب بھی نہیں بچے۔

اِس نوحے کو ذرا سُنیے ۔اس نے گاڑی کا ٹیپ آن کیا اور میں سُنتی تھی۔

The children of Iraq have names

They are not the nameless ones

The children of Iraq have faces

They are not the faceless ones

The children of Iraq do not wear Sadam's face

They each have their own face

The children of Iraq have names

They are not all called Sadam Hussain

The children of Iraq have dreams

They are not the dreamless ones

The children of Iraq have hearts that pound

They are not meant to be statistics of war

They are quick and lively with their laughter

What do you call the children of Iraq

Call them Omar, Muhammad Fahad

Call them Tiba, Marwa.

میں دائیں بائیں دیکھتے دوکانوں کے سائن بورڈ پڑھتے کہیں سمجھ آنے، کہیں نہ آنے کی کیفیت میں ڈوبی اور عراقی بچوں کی ترجمان یہ انگریزی نظم سُنتے سُنتے اس وقت چونکی

جب گاڑی ایک اسپتال کے یارڈ میں داخل ہوئی۔

''سب سے پہلے یہاں بچوں کو دیکھیے اُن سے ملیئے۔''

میرا تو وہ حال تھا کہ جیسے کہیں سر منڈواتے ہی اولے پڑیں۔یہاں تک پہنچنے میں تکالیف کا ہی کوئی انت نہ تھا۔مروان نے کمپیوٹر پر ایک سے بڑھ کر ایک المناک مناظر دکھا کر پتہ پانی کر دیا۔اوپر سے افلاق کی غم انگیز داستان، اس پر بھی بس نہ ہوا لا کر ایرموک اسپتال میں کھڑا کر دیا۔

ایرموک اسپتال اور یہ منصور سٹی کا علاقہ ہے۔میں نے جانا تھا۔پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے اور دل جیسے وزنی پتھروں تلے آ گیا تھا۔اسپتال کے شعبہ اطفال کے انچارج ڈاکٹر کے کمرے میں داخلہ ہوا۔چشمہ پہنے جس شخص سے تعارف ہوا وہ درمیانی عمر کا حواس باختہ سا تھا۔ڈاکٹر سعد معروف۔ڈاکٹر تو کہیں سے نہیں لگتا تھا تاہم پاکستان کا جان کر بہت خوش ہوا۔قہوہ پیتے ہوئے پتہ چلا کہ گلف وار کے بعد جنگ کے تین چار سال تک تنخواہوں کی کوئی باقاعدگی نہیں تھی۔

ایک اقتصادی پابندیوں سے زندگی اجیرن۔دوسرے دوائیں نہ ملنے سے مریضوں کی ابتر حالت اور اموات۔جی چاہتا تھا دنیا کو آگ لگا دیں۔

وارڈوں میں ہمیں خود لے کر گیا۔کاش مجھے تھوڑا سا پتہ چل جاتا تو ان معصوم بچوں کیلئے ٹافیاں ہی خرید لاتی۔

اچھے بھلے پرسکون اور خوشحال ملکوں میں بیمار بچوں کو دیکھنا تکلیف دہ امر ہوتا ہے کہ اسپتال اور مریض دونوں خوفناک۔تو اب ایسے ملک کی بات ہی کیا جو جنگوں اور پیہم جنگوں میں ہی اُلجھا رہا ہو۔جس کا بیج مارنے کی ہر کوشش ہوتی رہی ہو۔

جنرل وارڈ میں کیسے کیسے بچے تھے۔پانچ سال پہلے جنگ کے شعلوں میں جھلستے

بچوں اور عورتوں سے وارڈ بھرے تھے اور اب خودکش دھماکوں میں مرتے اور جلتے بچے، عورتیں اور مرد بستروں پر پڑے تھے۔ تیکھے نقوش اور سرسوں جیسی رنگتوں والے malnutrition کی مختلف اقسام کے مریض تھے۔ ڈاکٹر سعدی خوفناک حقیقتوں سے پردہ اٹھاتے تھے۔ بلیک مارکیٹ میں بیکار ہونے والی دواؤں کی تفصیلات جنہیں والدین بیچارے خرید کرلاتے اور بچوں پر اُن کے منفی اثرات پڑتے۔ ایک افراتفری اور ماردھاڑ ہوئی پڑی تھی۔ اِن بستروں پر بچے نہیں تھے جیسے لاشیں تھیں۔ کہیں ٹوٹی ٹانگوں، ٹوٹے بازوؤں، جلے چہرے، بارود سے جھلسے وجود لیکمویا Lymphatic ،Leukemia cancer، جگر اور جانے کن کن بیماریوں میں مبتلا تھے۔ بچوں سے بات کرنا چاہی تو زبان درمیان میں تھی۔

دل چاہتا تھا یہیں بیٹھوں اور پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ پہلے امریکی جارحیت کا سامنا تھا۔ اب دھماکوں اور خودکش حملوں نے قیامت برپا کر رکھی تھی۔

جب وہ خواتین کے وارڈ کی طرف جانے لگے۔ میں رُک گئی۔ میں نے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے شکستہ سی آواز میں کہا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب میں ایک جہنم سے نکل کر دوسرے جہنم میں داخل ہو گئی ہوں۔ یہ سب منظر میرے ملک کے بھی ہیں۔ میں بہت ڈپرس ہو رہی ہوں۔ اور وہ حساس منفرد طرز کا شاعر منصور آفاق یاد آیا تھا۔ اُسکا نوحہ یاد آیا تھا۔ لب دھیرے دھیرے گنگنانے لگے تھے۔

میرے ہارے ہوئے مظلوم دل کو مرثیہ خوانی کی ہمت دے
ہمارے عہد کے اِس کربلا پر تیری امت کی یہ مجبوری بھی کیسی ہے
کہ ہم مرتے ہوؤں پر بین کرنے سے گریزاں ہیں۔

باب نمبر: 4

1۔ دنیا کے چودہری کے بوتھے پر جوتا مارا۔منتظر زیدی تیری دلیری، جرأت اور جی داری کو سلام۔

2۔ انقلابی عراقی شاعروں کی شاعری، عالمی سازشوں کی کرب انگیز داستانیں سنتے اور پرانے بغداد کو دیکھتے شام کتنی جلدی گزر گئی تھی۔

3۔ ہر عہد کے عراقیوں کی زندگی میں دجلہ گویا شہ رگ سا۔ موجودہ دجلے کی صورت گری نے مجھے دن میں مایوس اور رات کو مسحور کیا تھا۔

دجلہ نے مجھے تھوڑا سا نہیں قدرے زیادہ مایوس کیا ہے۔میری زمانوں کی پالی ہوئی فینٹیسی نے ہلکا سا نہیں ذرا زیادہ زور سے جھٹکا کھایا ہے۔

''تو یہ دجلہ ہے۔''اندر کی بے کلی نکل کر باہر آ گئی تھی۔

میرے تصورات نے جو صورت گری کی تھی وہاں وسعت، کسی حد تک لامحدودیت، طلسم اور رومانیت تھی۔یہ تو بڑا اسکڑا اسکڑا ایا گدلا سا ہے۔جیسے کسی شہر کے بیچوں بیچ کوئی عام سی نہر بہتی ہو۔جسے زمانے اور وقت کے بے رحم ہاتھوں نے گھائل کر دیا ہو۔قوموں اور تہذیبوں کی مار دھاڑ اور غلبے کی خواہشوں نے اِسکا کچھر کس نکال دیا ہو۔

تو میں دجلہ کے پانیوں کو دیکھتی ہوں اور ان پانیوں میں بغداد کا چہرہ دیکھنے کی کوشش میں ہوں اور بے حد جذباتی ہو رہی ہوں۔

''اللہ میں تو تیری رومانیت کی اسیر تجھے کہاں سے دیکھنے آئی ہوں۔''

کاظمین سے جب چلے تھے تو ایما برج (Aimma Bridge) تک آنے

میں زیادہ دیر نہیں لگی ۔افلاق مجھے بتا رہا تھا ایسا برج کو سینٹ برج (Saint Bridge) بھی کہتے ہیں کہ اس کے ایک طرف اعظمیہ یعنی امام ابوحنیفہ کی نسبت سے مشرقی بغداد اور دوسری جانب کاظمیہ امام ابوموسیٰ کاظمی کے تعلق سے کاظمیہ مغربی بغداد ہے ۔درمیان میں دجلہ کسی موٹے بل کھاتے سانپ کی طرح بہتا ہے۔

گاڑی کی رفتار تیز تھی ۔میں شیشے سے منظروں کو دیکھتی اور اس کی رواں کمنٹری سُنتی تھی ۔یہ امام اعظم کا علاقہ اس کے ساتھ تھا اور ہم اب المغرب سکوائر سے مڑتے ہوئے امام اعظم روڈ پر رواں دواں ہیں۔

جب ایرموک ہسپتال سے نکلے تو دجلہ کیلئے میری بے کلی ،میرے شوق ومحبت کی انتہا،میرے لفظوں،میری باتوں،میرے اظہاریئے میں تکرار کی صورت زور وشور سے گونجی تھی ۔پیارے سے لڑکے نے اُس کا احترام کرتے ہوئے کہا تھا۔''دجلہ کے کنارے اکثر مقامات پر کنوپیاں بنی ہوئی ہیں ۔وہاں بیٹھ کر نظارہ کریں ۔دھوپ میں سہ پہر کے باوجود بہت تیزی ہے۔''

اُس نے ایک جگہ مجھے اُترنے کیلئے کہتے ہوئے اپنے داہنے ہاتھ سے گھنے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ وہاں بیٹھئے ۔میں گاڑی پارک کر کے آتا ہوں۔''

میرے جیسی کو دجلے کا اشتیاق نچلا نہیں بیٹھنے دے رہا تھا اور اب کبھی کھڑے ہوتے ،کبھی بیٹھتے متاسف سی،کہیں اس کے گدلے مٹیالے سے رنگ،کبھی گرد وپیش اور کبھی اس کے پانیوں میں تاریخ کھوج کرتی ہوں۔

شام کے سلونے حُسن کا انداز صحرائی علاقے میں اپنے رنگ لئے ہوئے ہے ۔لُو کے تھپیڑوں میں وہ دوپہر والی شدت تو نہیں ہے پر تپش میں ابھی بھی آگ کے بُجھتے شعلوں

پر سے تیر کر آنے کا احساس ملتا ہے۔ یوں تیز ہوائیں اِس شدت کو تھوڑا سا کم بھی کر رہی ہیں۔ سنہری کرنیں دُور پانیوں پر اُتر اُتر کر اُنھیں زرنگار بناتی ہیں۔

کناروں کے ساتھ ساتھ کہیں بلند و بالا اور کہیں کہیں پست عمارتوں کے سلسلے ہیں۔ پرندوں کے غول اڑانیں بھرتے پھرتے ہیں۔

افلاق گاڑی کہیں پارک کر کے میرے پاس آ گیا ہے۔ اُس کی نشان دہی پر میں نے دوربین سے اُن دو پلوں کو دیکھا ہے جو Sinak اور جمہوریہ برج ہیں۔ انکے دائیں بائیں فلک بوس عمارتیں ہیں۔ ہوٹل ہیں۔ اُن کے آگے پھولوں سے بھرے پارک ہیں۔ سیڑھیاں اور راستے دریا کے پانیوں میں اُترتے ہیں۔ اور دریا کے کنارے کنوپیاں ہیں۔ سڑکوں پر تیز رفتار گاڑیوں کی ایک ڈور ہے۔

چند کشتیاں بھی نظر آ رہی ہیں۔ کبھی دونوں حصّوں میں کشتیوں سے آمد و رفت تھی۔ کشتیوں کو آہنی زنجیروں سے باندھ کر چوبی شہتیروں کے پُل بنائے جاتے تھے اور اُن پر گھوڑے اور اونٹ بھاگے پھرتے تھے۔

دجلہ کو Tigris بھی کہتے ہیں۔ یہ نام گوروں کی دَین ہے۔ ہے کوئی بات مجال ہے جو ذرا سا تعلق اور قربت محسوس ہو۔ جیسے اس کا وہ کزن فرات بھی تو ہے۔ Euphrates یہاں کچھ شناسائی کی جھلک تو ملتی ہے پر شاہوں کی مرضی جو اُن کی ساعتوں کو اچھا لگے وہی رواج پائے۔

دجلہ عراق کی محبت اور خیر خواہی میں سر سے لے کر پاؤں تک گتھوا پڑا ہے۔ ترکی کی جھیل اُرمیہ Urmiya سے نکل کر یہ ماردھاڑ کرتا گردش پہاڑوں کے راستے عراق میں داخل ہوتا ہے۔

ترکی کے پہاڑوں سے ہی ایک بڑی نہر Grater Zab موصل سے کوئی

ڈیڑھ سو کلومیٹر آگے آ کر اسمیں شامل ہوتی ہے۔

Lesser Zab کے نام سے دو مزید نہریں (Al-Azayan) اور (Qiyala) نیچے بغداد تک آتے آتے اس کی معاون بنتی ہیں۔

فرات تو شام کو ممنون کرتا ہوا عراق کی ناف سے اندر گھستا ہے۔پاس پاس چلتے ہوئے قرنا پر دونوں کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔اور پھر یک جان ہو کر شط العرب کے پانیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔

عراق کی قدیم ترین تاریخ، اُس کی صدیوں پُرانی تہذیبیں اور قومیں اِن دونوں کے بغیر نامکمل۔انہوں نے عُروج و زوال کے المیے، جنگ اور خون ریزیوں کے معرکے دیکھے اور سب کے چشم دید گواہ بنے۔

دجلہ کی اہمیت مقدم کہ عراق کا دل بغداد اور بغداد کی جان دجلہ۔صدیوں سے چولی دامن جیسا ساتھ، میاں بیوی جیسا سنگ، بغداد اسلامی جاہ و حشمت کا گہوارہ اور نمائندہ، علم و تہذیب کی مرکزیت سب اِسی کے کارن۔اِسی کی مرہون منت، اس کے بغیر اُدھوری اور نامکمل۔

میری دجلہ میں حد درجہ دلچسپی کو افلاق نے بہت پسندیدگی سے دیکھا تھا۔یہ ہر عہد کے عراقیوں کی زندگی میں خون کی طرح دوڑتا رہا ہے۔ہماری خوشیوں، ہمارے غموں کا امین، ہماری باغیانہ سرگرمیوں کا رازدار ہمارے باغی شاعروں کی جائے پناہ۔

انھوں نے بھی ٹوٹ کر اس سے محبت کی ہے۔افلاق نے ابراہیم جبیرا (Jabera) کی شاعری گنگنائی تو افلاق مجھے ایک تلاوت کرنے والا خوش الحان قاری محسوس ہوا۔

Blessed Tigris what inflames your heart inflames me
and what grieves you makes me grief.

اس کے پانیوں نے شاہوں کی بے وفائیوں اورقہر وعتاب کے بہت دُکھ جھیلے ہیں۔جعفر برمکی کی لاش کے تین ٹکڑے دجلہ کے تین پُلوں پر لٹکائے گئے اور سر اس پُل پر جسے باب المدام کہتے ہیں۔ذہانت ،فطانت وسخاوت اور خلیفوں سے محبت و رفاقت اور وفاداری جیسی خوبیوں سے مالا مال یہ سر مہینوں اِس پُل پر لٹکا شہریوں کیلئے سامان عبرت اور پانیوں کیلئے وجہ غم و درد بنا رہا۔

اِن پانیوں نے وہ منظر بھی دیکھا تھا۔جب ہارون الرشید والئی خُراسان کی سرکوبی کے بعد بغداد آیا۔اِس پُل سے گزرا جعفر کا سر لٹک رہا تھا۔رُکا۔اُس وقت سورج پوری آب وتاب سے چمکتا تھا۔ہوائیں تھم تھم کر چلتی تھیں۔دجلہ کا پانی مدھم مدھم سُروں میں کوئی المیہ گیت گنگناتا تھا۔ہارون گھوڑے پر سوار اُس سر کے قریب گیا۔کپڑا طلب کیا۔اُس کے چہرے پر پڑے گرد وغبار کو صاف کیا۔کھلی آنکھوں کو بند کیا۔دجلہ کے پانیوں پر نظر ڈالی۔کچھ سوچتا رہا۔یقیناً اُس نے پانیوں کو کہا ہوگا۔

’’میں تم سے شرمندہ ہوں۔شرمسار بھی ہوں۔مگر مجبور تھا۔خلافت عباسیہ کا تاجدار ہارون الشید برامکیوں کے سامنے دو کوڑی کا ہو کر رہ گیا تھا۔بے وقعت اور بے توقیرا سا۔‘‘

یقیناً پانیوں نے بھی اُسے کچھ سُنایا ہوگا۔اُس وقت کی کچھ منظر کشی کی ہوگی۔کچھ یاد دلایا ہوگا۔جب وہ بہت سال پہلے خلافت کا عہدہ سنبھالنے بغداد آرہا تھا۔اُس کا طمطراق کروّفر بھی اُنہیں یاد تھا کہ وہ یہاں آکر رُکا تھا۔اُس دن بھی سورج چمکتا تھا۔اُس کی چمک میں تپش تھی۔اور ہوائیں تھم تھم کر چلتی تھیں۔یحیٰی برمکی نے پاس آکر کہا تھا۔

''حضور دیر ہو رہی ہے۔مادر ملکہ خیزران محل میں بے تابی سے آپ کی منتظر ہیں۔شماسیہ میں ہمارا خاندان اور رعایا دو رویہ کھڑے منتظر ہیں۔آپ کو نئے خلیفہ کی مبارک باد دینے اور تحائف پیش کرنے کیلئے بے تاب و بے قرار ہیں۔

"میں نے شاہی انگوٹھی یہاں پھینکی تھی۔اسی جگہ،انہی پانیوں میں،بھائی ہادی مجھ سے خائف تھا نا۔بابا مہدی کی شاہی وراثت کی نشانی۔میں نے سوچا کہ بانس ہی نہیں ہوگا تو بانسری کیسے بجے گی؟''

وہ چند لمحوں کیلئے رُکا پھر جیسے خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بات کو آگے بڑھایا۔

''آپ تو جانتے ہیں اُستادِ مکرم میں تو ان خلافتوں اور شاہی وراثتوں کے چکر میں ہی نہیں پڑنا چاہتا تھا۔زبیدہ کے ساتھ پُرسکون سی عیش وعشرت کی زندگی گزارنے کا خواہاں تھا۔مگر مادر ملکہ اور آپ کی کاوشوں نے مجھے قائل کیا ہے۔اب آپ بتایئے شاہی مہر کے بغیر بات کیسے بنے گی؟''

اور جن جیالوں نے دریا میں چھلانگیں ماریں اُن میں جعفر برمکی بڑا نمایاں تھا۔

پانی احسان فراموش نہیں ہوتے۔سزا دینے پر تُل جائیں تو دوسری بات ہے۔پانیوں نے شاہی مہر واپس کر دی تھی۔

شہزادے نے ہاتھ میں تھامی۔بوسہ دیا۔اُنگلی میں پہنی۔احسان مندی کے جذبات سے لبالب بھری نظروں سے دجلہ کا شکریہ ادا کیا کہ حفاظت کا حق ادا کیا۔جعفر کی جان نثاری کا ممنون احسان ہوا۔

افلاق کچھ گنگنا رہا تھا۔کاش میں نے عربی کا علم حاصل کیا ہوتا جو میری مذہبی زبان ہے۔آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔کچھ کھٹ ہی لیتی۔ترجمے سے جانا یہ اوائل بیسویں صدی کا شاعر محمد البعیدی تھا۔

اے عراقیو اپنی ذات پر پر چسپاں ذلت کے اِن دھبوں کو دھو دو۔
ہم غلام نہیں کہ گردنوں میں طوق پہنیں۔
ہم قیدی بھی نہیں ہیں۔
کہ پاؤں میں بیڑیاں پہنیں۔
ہم کوئی عورتیں ہیں
کہ جن کے پاس آنسو ہیں۔
تو اگر ہم نے ظلم کے خلاف آواز نہ اٹھائی
تو دجلہ کی خوشیوں کا خون ہو جائے گا۔

اور جب میں دیگر انقلابیوں کی شاعری سُنتی اور دُور دجلہ کے منظروں کو دیکھتی تھی۔ میری وہ مایوسی ختم ہوگئی تھی کہ تیزی سے گرتی شام کا جوبن دجلہ میں جو نئے رنگ گھول رہا تھا اُنکی دل آویزی کمال کی تھی۔ سنہری کرنوں نے جیسے اُس کے اندر اُتر کر اُس کے گدلے پن کو سونے میں بدل دیا تھا۔ درختوں کی شاخیں تیز ہواؤں کے ساتھ جُھک جُھک کر جیسے اُسے پیار کرتی تھیں۔ پرندوں کی ڈاریں اور کشتیاں پانی میں اُتر رہی تھیں۔

اور میں نے اپنی اس مُسرت کو افلاق کے ساتھ شیئر کیا تھا اور سُنا تھا۔

''رات کو دیکھیئے گا۔ دجلہ آپ کو حیران کرے گا۔''

ٹیکسی کی رفتار ہوا جیسی تھی۔ صدام گرینڈ موسک کو دکھاتے اُس کے بارے میں بتاتے مجھے شہدا برج پر لے آیا۔ شہدا برج اپنی تاریخ کے حوالے سے کونسا کم تھا۔ آزادی کی جدوجہد کا سمبل۔ جان نثاروں کی قربانیوں کا مرکز۔

عراق ایک طویل جدوجہد سے گزرے۔ 1914 سے 1958 تک ہمارے شاعروں کی آوازیں شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک گونجیں۔ اپنے لوگوں کی

خاموشی، ان کی بے حسی اُنہیں تکلیف دیتی تھی۔ وہ جلتے تھے۔ کڑھتے تھے۔ جمیل صدقی الزاہوی آوازیں دیتے تھے۔ پکارتے تھے۔

سو رہے ہو۔

تو کیا سوتے ہی رہنا ہے۔

اٹھ جاؤ۔

اور مقابلے پر کھڑے ہو جاؤ۔

لکھنے والے کا لکھا ہوا مٹا ڈالو۔

تھوڑی دیر کیلئے میں دُکھ کی رَو میں بہنے لگی تھی۔ میں نے خود سے کہا تھا۔

آزادی کی دیوی کوئی ایسے ہی بانہوں میں آجاتی ہے۔ صدیاں گزر جاتی ہیں۔ کتنی جانوں کے نذرانے اس کی بھینٹ چڑھتے ہیں۔ کتنی دُلہنوں کے سہاگ اُجڑتے ہیں۔ کتنے بچے یتیمی کے دُکھ سہتے ہیں۔ کتنے ارمانوں کا خون بہتا ہے پھر کہیں اس کا ہُما سر پر بیٹھتا ہے۔ کشمیر، فلسطین، افغانستان، عراق اور اپنے وطن کے حالات نے آنکھوں کو بھگو دیا تھا۔ کیسے میرے ملک کا بازو ٹوٹا۔ کیسے اب میرا مادرِ وطن اور یہ مظلوم ملک خون میں نہا رہے ہیں۔ کو قصوروار تو ہم سب بھی ہیں۔

پھر دُکھ کی ایک لہر میرے اندر سے اٹھی اور میرے لبوں پر آکر دم توڑ گئی۔

''میرے مولا۔ یہ تو آزاد ہو گئے تھے۔ یہ اب پھر غلام بن گئے ہیں؟ ہماری طرح کیا یہ بھی آزادی کے قابل نہ تھے۔

تاریخ پھڑ پھڑ کرنے لگی تھی۔ دراصل اُسے بھی تو موقع کی تلاش ہوتی ہے۔ بند رہنے سے اوب سی جاتی ہے۔ کھلی ہوا میں سانس لینا چاہتی ہے۔ اُس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ درمیانے درجے کے شاعر کی طرح جسے اچھا سامع مشکل سے نصیب ہوتا

ہے۔اُسے بھی کوئی چاہیے تھا سنانے کو۔اپنے آپ کو ہلکا کرنے کو۔

پوری عرب دنیا کوئی چار صدی تک عثمانیوں کے زیر تسلط رہی تھی۔

طویل عرصے کی حکومت سے عثمانی سلطنت اندرونی ریشہ دوانیوں،حکمرانوں کی کمزوریوں اور نظام کی بوسیدگی کے باعث اپنی اہمیت کھونا شروع ہوگئی تھیں۔یوں بھی عالمی منظر نامے پر تبدیلیاں سرعت سے نمودار ہورہی تھیں۔مغربی اقوام متحدہ خاص کر برطانیہ زیادہ فعال تھا۔بہت سے محاذ کھل گئے تھے۔برطانوی حکومت نئے،جدید کانٹوں اور ہتھکنڈوں سے لیس اپنے گھاگ حربوں سے عالمی سطح پر چھاگئی تھی۔رابطوں،لالچوں،سازشوں اور معاہدوں کے سلسلے عروج پر تھے۔عربوں کی قومیت کو تحریک کی صورت دی جارہی تھی۔لارڈ کچز،لارنس آف عربیہ اور جرٹروبیل جیسے برٹش ایجنٹ شازشوں کے جال بن رہے تھے۔خطے کے ٹکڑے کیسے کرنے ہیں؟کون اُلو کے پٹھے زیادہ وفادار ہیں؟کسے کہاں رکھنا ہے اور کسے کہاں سے غائب کرنا ہے؟ہاشمی خاندان اور سعودی قبیلہ سب سے پہلے اِس جال میں پھنسے تھے۔پہلی جنگ عظیم میں ہونے والی فتح و شکست نے عالمی بساط پر نئے مہرے سجادیئے تھے۔

1916 میں شریف مکہ نے ترکوں کے خلاف بغاوت کردی اور دمشق و مدینہ کے درمیان ترکوں کے ذرائع مواصلات ختم کردیئے۔

میسوپوٹیمیا تہذیبی گہوارے کا یہ زمینی ٹکڑہ عراق کے نام سے کہیں نہیں تھا۔1917 میں برطانیہ نے ہندوستان سپاہیوں کی مدد سے یروشلم اور بغداد پر قبضہ کر لیا۔1918 میں حسین ہاشمی اور برٹش جنرل ایلن بی نے عربوں کے سینے میں Promised Land کے کینسر کا بیج بودیا۔

1921 میں جرٹرو ڈ بیل نے بغداد،بصرہ اور موصل کو اکٹھا کر کے اسے عراق کا

نام دیا اور سازشوں سے شاہ فیصل کو عراق کے تخت پر بٹھا دیا۔

عراق شاہ فیصل کو قبول لنے سے انکاری۔ گردجو خود مختاری کے چکر میں برطانیہ کے آلہ کار بنے تھے انہیں بھی کوئی خود مختاری نہ ملی۔ وہ بھی نالاں۔

1924 میں سعود خاندان نے شریف مکّہ پر حملہ کر کے خود اقتدار سنبھال لیا۔ شریف مکّہ بھاگ نکلنے پر مجبور ہو گیا۔ سنی قیادت جو عثمانیوں کے قریب تھی وہ بھی ناکوں ناک شکایتوں سے بھری کہ انہیں کیوں نظر انداز کیا گیا۔ نوری السید اور جعفر عسکری جیسے اب بے ضمیر اور مفاد پرستوں کے ٹولے تھے۔ شاہ فیصل جیسا کٹ پتلی بادشاہ تھا جسے عراقیوں کی حمایت حاصل نہیں تھی۔ شاعروں کی آوازیں تھیں۔ العبیدی کی پکار تھی۔

1930 کے معاہدے نے عراق کی کولونیل حیثیت کو واضح کر دیا۔ اور اندر خانے اضطراب و بے چینی کی چنگاریں پھوٹنے لگیں۔ مگر 1948 کا پورٹس ماؤتھ معاہدہ تو گویا جلتی پر تیل کا کام کر گیا۔ پھر ہڑتالوں، آئے دن جلسے جلوسوں اور زیر زمین سرگرمیوں کے لمبے سلسلے تھے۔ سکولوں کے طلبہ نے لاٹھیاں کھائیں، گولیوں سے زخمی اور شہید ہوئے۔ اعظمیہ اور کاظمیہ کے غریب لوگ جمہوریت اور معاشی سہولتوں کیلئے نعرے لگاتے اور جواباً مرتے تھے۔

یہیں اسی پُل پر ہمارے مایہ ناز شاعر الجواری کے بھائی نے گولیاں کھا کر اپنے بھائی کی باہنوں میں دم توڑا۔

اُس شام جب میں کسی بابڑی عورت کی طرح پرانے بغداد کی تنگ تنگ گلیوں اور بازاروں میں گُھسی چلی جاتی تھی۔ افلاق نے ایک اچھے اور مودب بیٹے کی طرح مجھے ہاتھ سے پکڑا اور سہولت سے باہر کھلی شاہراہ پر لاتے ہوئے بولا۔

"گھبرائیے مت۔ میں پرانے اور نئے بغداد کا چپہ چپہ آپ کو دکھاؤں گا۔ جتنی بار

آپ چاہیں گی آپ کو لاؤں گا۔مگر اب اندھیرا بڑھ رہا ہے۔لوڈشیڈنگ ہونے والی ہے۔بمباریوں سے متاثر بہت سے گھر ابھی بھی یہاں کھڑے ہیں۔جنہیں گرانا ضروری تھا مگر گرائے نہیں گئے۔گلیاں بھی اونچی نیچی ہیں۔آپ ان سے ناواقف ہیں۔''

اپنائیت کی خوشبو میں مہکتے اِس احساس پر میرا دل بے اختیار اُس کا ممنون ہوا۔ممتا بھرے دل نے دعا دی۔

اور جب میں اُسکے ساتھ پارکنگ کی طرف بڑھتی تھی میں نے پریس کلب بغداد اور ساتھ ہی منتدر رل زیدی (Muntader-al-Zaidi) سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

''میں آپکی چیزوں،جگہوں لوگوں،حالات سے غایت دلچسپی،اندر خانے حقائق جاننے کی تڑپ،بغداد اور عراق سے محبت اوران کی تباہی پر آپ کے جذبات سے آگاہ ہو چکا ہوں۔اطمینان رکھیے۔ہر جگہ اور ہر قسم کے لوگوں سے ملاقات ہوگی۔ہاں منتدر رل زیدی سے آدھی ملاقات ابھی آپ کی سمجھ آنے والی زبان میں ہی ہو جاتی ہے۔پوری ملاقات ممکن نہیں کہ دلیر بچہ جیل میں ہے۔

گاڑی میں بیٹھے تو ایل سی ڈی پلیئر کے بہت سے بٹن دبے اور پھر ایک آواز گونجی۔

Greeting Bush in Baghdad.

This is a farewell kiss, you dog"

You are a guest in my country,

unwanted Surely, but still a guest.

You stand before us waiting for praise

But how can we praise you?

you come after your planes have raineddeath on our cities

Your soldiers broke down our doors

humiliated our men, disgraced our women.

We are not a frontier town

and you are not our marshal.

You are a torture.We know you force water down the throats

The throats of our prisoners

We have seen the pictures of our naked prisoners

threatened by your snarling dogs.

You are a maker of widows and orphans.

a most unwelcome guest.

I have only this for you,

my left shoe that I hurl at your lost and smirking face

nd my right shoe that I throw at your face of no remorse.

of no remorse

خوبصورت ریلنگ اور برقی قمقموں سے سجا دجلہ کے پانیوں میں جھانکتا دونوں
کناروں کی عالیشان عمارتوں کا خوبصورت رُخ پیش کرتا ہوا شہداء برج ۔ برج سے دجلہ کو
دیکھنا ایک مسحور کن تجربہ تھا ۔ اطراف کی بلند و بالا عمارتوں سے روشنیاں اپنے عکس جس جس
انداز میں پانیوں پر چھوڑتی تھیں انہوں نے اِسے قاتل بنا دیا تھا ۔ وہی دجلہ جس نے مجھے سہ
پہر کو مایوس کیا تھا اب ایک نئے رنگ کے ساتھ سامنے تھا ۔ یوں جیسے کوئی ادھیڑ عمر طوائف سج
سنور کر بالکونی میں کھڑی ہو جائے اور گاہکوں کو اشارے کرتی ہوئی کہے کہ دیکھو مجھے۔" ہے

کوئی مجھ جیسا۔“

اور جب میں دائیں بائیں دیکھتے نظاروں کے مزے لوٹتی تھی میں نے افلاق کو سُنا تھا جو موبائل پر کسی کی کال سُننے کے بعد اب مجھ سے مخاطب تھا۔

”کرادہ میں بم پھٹا ہے۔کوئی بیس کے قریب لوگ مر گئے ہیں۔زخمیوں کا تو کچھ پتہ ہی نہیں کتنے ہیں؟

میں خاموش کھڑی اس کے پاس بکھرے چہرے کو دیکھتے سوچتی تھی۔وہی وطنی کہانی۔میرے رب ہم مسلمانوں پر تیرا اتنا خوفناک عذاب نازل ہوا ہے کہ ہم ذہنی طور پر بانجھ ہو گئے ہیں۔ہماری فہم فراست،ذہانت سبھوں کو زنگ لگا ہوا ہے۔

چند لمحوں تک ہی افسردگی کی دُھند وجود کے ساتھ لپٹی۔نئے نظاروں کی چمک دمک اتنی تیز تھی کہ اُس نے توجہ التحریر سکوائر کی جانب موڑ دی۔جو میرے ایک ہاتھ تھا۔

رشید سٹریٹ کی خوبصورتیوں کی جھلک تھی۔سامنے یادگار آزادی Libration Monument ہے۔عراقی آرٹسٹ جاوید سلیم کا دلآویز شاہکار۔میں اُس کا کام دیکھتی تھی۔تاریک دنوں میں عراقیوں کی جدوجہد کی کہانی۔آہنی زنجیروں کو کاٹتے،ظلم و جبر کے پہاڑ توڑتے،کامیابی کا جشن مناتے،اتفاق و اتحاد سے آگے بڑھتے،ایک دوسرے کی مدد کرتے،نئے مُلک کی تعمیر نو کرنے میں اپنا حصّہ ڈالتے عراق اپنی خوشحالی اور تعمیر و ترقی کے لیے کس درجہ کوشاں ہیں۔آرٹسٹ نے اپنے فن کا اظہار بڑی خوبصورتی سے کیا تھا۔چوک رنگوں اور روشنیوں میں پور پور ڈوبا ہوا تھا۔

کیا بغداد نے ہولناک جنگ کا سامنا کیا ہے۔اِس ماحول میں ایسی کوئی بات سوچنا موزوں ہی نہیں تھا کہ وہ سحر زدہ کرتا تھا۔

افلاق کہتا تھا۔14 جولائی 1958 تاریخ عراق کا بہت اہم دن ہے کہ عراق نے

سامراجیت سے آزادی حاصل کی تھی۔

التحریر سکوائر میں دو منزلہ، سہ منزلہ اور آٹھ دس منزلہ عمارتوں کے سلسلے اور مقامی لباس میں عورتوں، مردوں اور بچوں کے ہجوم، بوٹوں اور پھولوں سے سجے تختے، کھجور کے درختوں کا امتیازی پن۔ ایک دوسرے کو ملاتی اور کاٹتی سڑکوں کے سلسلے۔

تو میں عین دجلہ کے ساتھ ساتھ بہتی ابونواس سٹریٹ سے گزر رہی ہوں۔ عربی کلاسیکل لٹریچر کے ایک نامی گرامی شاعر ابونواس کے نام نامی کی حامل سڑک۔ خوبصورت شاندار۔ اوپر کی طرف یہ امام اعظم سٹریٹ ہے۔ نیچے اُترتے ہوئے یہ رشید سٹریٹ بن جاتی ہے۔

مجھے چترال یاد آیا تھا۔ دریائے چترال کے ساتھ ساتھ بہتا بازار اور سڑک جو ہر فرلانگ پر ایک نئے نام سے اپنا تعارف کرواتی ہے۔

پندرہ، کوئی سولہ، کوئی اکیس منزلہ پانچ ستارہ ہوٹلوں کی عمارات دجلے کے ماتھے پر سجے جھومر کی طرح چمکتی تھیں۔ شیرٹن، ابونواس، فلسطین ہوٹل۔ ان ہوٹلوں کی شاندار عمارتیں۔ موتی اُچھالتے تالاب۔ مناظر کی خوبصورتیوں میں ایک ایسا تسلسل تھا کہ نظر ابھی ایک سے پوری طرح سیراب نہ ہو پاتی کہ کوئی دوسرا سامنے آجاتا۔ وہیں دوسری جانب بے شمار عارضی سے ہوٹلوں کا پھیلاؤ بھی تھا۔ کشتیاں اور لانچیں اور فیری بوٹ پانیوں میں اُتری ہوئی جن میں بیٹھے منچلے ہنستے گاتے زندگی ہر رنگ میں جیتی ہے کی نمائندگی کرتے تھے۔

افلاق کی سہ پہر کو کہی گئی بات کی حقیقت مجھ پر اب کھلی تھی کہ دجلہ کی رنگینیاں اور رعنائیاں رات کو دیکھیے گا۔ آپ حیرت زدہ ہو جائیں گی۔ واقعی ایسا ہی تھا۔

پانیوں میں کشتیاں چلتی اور گیت گونجتے تھے۔ کیا منظر اور نظارے تھے؟ رونقوں کی اس فراوانی کو دیکھتے ہوئے میں خود سے کہتی تھی۔

کہیں لگتا ہے عراق اتنی بڑی قیامت سے گزرا ہے اور ابھی تک گزر رہا ہے۔واقعی زندگی کہیں رکتی ہے؟اس کا کام چلنا اور بس چلنا اور ہر رنگ میں چلتے چلے جانا ہے۔

گاڑی سرپٹ بھاگی جاتی تھی۔پھر پُل پر چڑھی۔یہ المک (El-Muallac) برج ہے۔گاڑی سیدھی ہوئی۔چوک پر رُکی۔عمان سکوائر۔وزارت صنعت کی وسیع و عریض عمارت جو جنگ میں میزائل حملے کے بعد بھی بارہ گھنٹے جلتی رہی تھی۔داغ داغ ہوئی پڑی تھی۔آگے حبیب چوک سے دمشق سٹریٹ پر چڑھے۔دمشق سٹریٹ مغربی بغداد کی مرکزی شاہراہ ہے۔

زوارہ پارک دیکھنے کی چیز تھی۔رات میں اس کا اپنا حُسن ہے اور دن میں اپنا۔دونوں رخ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔اس میں اوپن ایر سینما ہے۔سمر تھیٹر بھی ہے عراق بلکہ عرب کی نامور شخصیات کے مجسمے بھی یہاں سجے ہوئے ہیں۔بچوں کی وڈیو گیمز اور چڑیا گھر بھی ہے۔

میرے اندر ایک ہلکا سا خوف ضرور سرسرا رہا تھا۔تا ہم جیسے میں خود کو تسلی دیتی تھی کہ نہیں انسانیت کا چہرہ ابھی بھی روشن اور تابناک ہے۔میں بے حد محفوظ ہاتھوں میں ہوں۔گاڑی پارک ہوئی۔رات کی اُتری سیاہی میں پیدل چلتے ہوئے میں رنگ و بو سے چمکتے زوارہ پارک میں داخل ہوئی۔پہلی نظر میں گلشن اقبال پارک جیسا لگا۔رات دن میں ڈھلی ہوئی تھی۔عراقی عورتوں،بچوں،مردوں کے پُرے نظر آئے۔بہت سارے لوگوں سے تعارف ہوا۔اھلاً و سہلاً جیسے لفظوں اور چہرے پر پھیلتی مسکراہٹ نے اپنایت کی خوشبو بکھیری۔الباکستان الباکستان محبت بھرے انداز میں دو تین بار دہرایا جاتا۔ڈسکو کلب میں موسیقی کی تانیں تھیں اور شوقین مزاج لوگوں کا انبوہ کثیر۔

افلاق نے پروگرام دیکھنے کیلئے پُوچھا۔میں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ آج مجھے جلدی جا کر آرام کرنا ہے۔پھر کسی دن سہی۔

میں ایک بلند و بالا ٹاور دیکھتی اور اُس کے بارے میں پوچھتی تھی۔بغداد ٹاور ہے۔بغداد کی خاص الخاص چیز ہے۔تھکی ہونے کے باوجود میرا جی اُسے دیکھنے کیلئے مچلنے لگا تھا۔دورویہ جھاڑیوں سے گھری سڑک پر بکھری مدھم مدھم سی روشنی میں چلنے لگے۔مطلوبہ جگہ پہنچے تو ٹکٹ کیلئے لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ٹکٹ خریدنے کیلئے میں نے پچیس ہزار کے دو نوٹ افلاق کو دیئے۔لمبی قطار میں آگے جگہ پانے کیلئے افلاق نے کیا منتر پھونکا کہ ہمیں سب سے آگے کھڑا کر دیا گیا۔یقیناً اُسنے پاکستان کا حوالہ دیا ہوگا۔لفٹ بہت کھلی تھی۔بارہ آدمی گِن کر اندر داخل ہوئے۔پہلے لیول پر رُکی۔کافی لوگ اُترے اور کچھ نئے چڑھے۔دوسرے لیول پر افلاق نے مجھے اُتارلیا۔یہاں ریسٹورنٹ تھے۔

شیشوں سے نیچے بکھرے بغداد کے نظارے تھے۔بہت دلفریب اور حسین۔ دجلہ کی سانپ کی سی بل کھاتی صورت تھی۔میں خوش و خرم محظوظ ہوتی رہی۔افلاق سے سُنتی رہی۔شیشوں سے تانکا جھانکی کرتی رہی۔کوک پیا۔شوارما کھایا اور شکر گزار ہوئی کہ لڑکا کس قدر سمجھدار ہے۔سستے سے ڈنر پر مجھے بھی رجا دیا اور خود بھی رج گیا۔اور حساب کتاب کی اکنی دونی تک بھی سمجھادی۔

باب نمبر5:

1۔ بغداد میں بسنے والے عیسائیوں، یہودیوں اور آرمینیاؤں کیلئے اُنکا وہ کوسموپولیٹن شہر جو بڑا ماڈرن اور کلچرڈ تھا جانے کہاں گُم ہوگیا؟

2۔ Songs of the broken hearted Baghdad سیریز کے گیت بیسویں اور اکیسویں صدی کی معاشرتی اور ثقافتی آمیزش کے ساتھ موسیقی کی دنیا کا ایک خوبصورت تحفہ ہیں۔

3۔ چوالیس 44 سو سال پرانے مجسموں کے چور زیادہ امریکی تھے۔

4۔ ال شابندر کافی شاپ ایک لٹریری سرکل ہی نہیں ایک عہد کی تاریخ اُس کی کھڑکیوں سے جھانکتی ہے۔

آنکھ تو کُھلی ہی دیر سے تھی۔ کمرہ ایسا نہیں تھا کہ میں کھڑکیوں پر پڑے پردے جھٹک کر سورج کی نوخیز آل اولاد کی عمارتوں کے چہرے اور کوٹھوں کے بیروں پر اُچھل کود سے ویلے کا اندازہ لگاتی۔ سو کسی کے پوچھنے پر جانی کہ نماز تو کب کی گل ہوگئی ہے۔ باتھ روم بند تھا۔ میں نے کھلنے کا انتظار نہیں کیا۔ ریسپشن میں آئی۔ سیٹ پر وہی بیبا سالڑ کامروان بیٹھا تھا۔ فوراً کل کی کارگزاری پوچھنے لگا۔ میں نے سب سے پہلے باتھ روم جیسا اہم مسئلہ اس کے سامنے رکھا اور کہا۔

''ذرا منہ ہاتھ دھولوں تب تمہیں احوال سناتی ہوں۔''

اُس نے رازداری برتنے کا کہتے ہوئے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ دیا۔ فسٹ

کلاس باتھ روم کا دروازہ کھول کر چابی مجھے دیتے ہوئے بولا۔"آتے ہوئے لاک کرتی آیئے۔"

افلاق کا بتایا۔"اوہو بڑا صحیح اور موزوں بندہ ٹکرا ہے۔سمجھ دار،ذہین اور انتہائی شریف۔"

"ارے بیبا اوپر والے کی مہربانی ہے۔بس میرے پاس تو دعائیں تھیں۔"

کل کے گزرے دن کی تفصیل سنتے ہوئے اُس نے جاننا چاہا کہ کیا وہ آج بھی میرے ساتھ ہوگا۔

"انشاءاللہ ہر روز ہوگا جتنے دن بغداد میں قیام رہے گا۔سوڈالر روز کی ادائیگی میرا پروگرام ہے۔تم بتاؤ یہ مناسب ہیں۔یوں اُس نے تو سرے سے اِس موضوع پر کوئی بات ہی نہیں کی۔میں نے بہتیرا سر مارا کہ وہ کچھ بولے۔کچھ کہے۔بس آنکھوں میں اور ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ لیے ہنستا رہا۔رات واپس آتے ہوئے سوڈالر کا ایک نوٹ اس کی جیب میں ڈال دیا تھا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔یوں وہ بہت ذمہ دار ہے لیکن احتیاط ضرور کیجیے۔زیادہ رش والی جگہوں پر جانے سے پرہیز کریں۔کل صبح سینٹرل پوسٹ آفس کے قریب یوتھ ہوٹل کی عمارت سے ذرا فاصلے پر بم پھٹا ہے۔خدا کا شکر ہے کہ جانی نقصان نہیں ہوا۔بس عمارت اور قرب و جوار کی دوکانوں،مکانوں کے شیشے ٹوٹے ہیں جن سے چند لوگ زخمی ہوئے ہیں۔شام میں کرادہ میں پھٹا ہے۔اس میں تو خاصا جانی نقصان ہوا۔"

"ہائے مروان سارے منظر میرے گھر کے ہیں۔" میں نے لمبا سانس کھینچتے ہوئے کہا تھا۔

چائے پانی کی تو کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔نسرین جانے کہاں تھی؟ میں نے

کنگھی پٹی کی۔تیار ہوئی۔فرج میں رکھا تربوز کھایا اور بیگ اٹھا کر باہر نکل آئی۔جو وقت میں نے افلاق کو دیا تھا میں لیٹ ہونا نہیں چاہتی تھی۔

ٹیکسی سٹینڈ تک فرلانگ سوا فرلانگ کے فاصلے کو طے کرتے ہوئے آج میں زیادہ پُراعتماد تھی۔دورویہ دوکانوں کا جائزہ نسبتاً زیادہ تفصیل سے تھا۔بڑے بڑے شاپنگ پلازوں اور دوکانوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی ریڑھیوں پر بھی نظر تھی۔اپنا اور ان کا موازنہ جاری تھا۔خیر سے صفائی سُتھرائی کے معیار سے لے کر بہت ساری چیزوں میں بہت ساری قدریں مشترک تھیں۔

اِس وقت افلاق کے ٹیکسی سٹینڈ پر ہونے کا کتنے فی صد امکان ہے جیسا خیال بریکنگ نیوز کی طرح بار بار سامنے آتا تھا۔

دل اور دماغ دونوں خلاف معمول متفق اور متحد تھے اور دلاسا دیتے تھے کہ وہ ضرور ہوگا۔

کل کے دیکھے گئے منظروں میں آج ایک بار پھر میرے گہرے انہماک کو اگر میری کزن دیکھ لیتی تو کوفت بھرے لہجے میں کہنے سے باز نہ رہ سکتی۔

''کوئی کسر نہیں ہے تیرے پاگل ہونے میں۔سچی بڑا پتلا حال ہے تیرا اُس لالچی سوانی جیسا جولسی کے گچھے کو پانی کے زور سے چاٹی بنا لیتی ہے۔تم نے بھی اِن محدود سے منظروں کی تصویر کشی سے دو صفحے بھر لینے ہیں۔''

دورویہ دوکانوں اور پلازوں پر لوگوں کی آمد و رفت شروع تھی۔سیاہ برقعوں کی سڑکوں پر بھرمار تھی۔چیکنگ کے مرحلے بھی زور و شور سے جاری تھے۔چھاتی سے لے کر پاؤں تک ڈیٹکٹر کا جھرلو پھرتا تھا۔ہاں البتہ کل جو ڈر اور خوف لرزا سا رہا تھا وہ آج خاصا کم تھا۔

طمانیت سے لبریز سرشاری سے پُر لہریں سارے شریر میں برقی رو کیطرح دوڑی تھیں کہ آنکھوں کو وہ دلبر سا بچہ نظر آیا تھا۔

میں نے اُس کے بازو پر بوسہ دیا اور طمطراق سے اگلی نشست پر یوں بیٹھی جیسے میں بغداد میں نہیں لاہور میں ہوں اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے والا میرا بیٹا غضنفر یا ضیغم ہے۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے منتدر ال الزیدی Muntader-al-zaidi کی اُسی نظم کو پھر سُننے کی خواہش کی۔ افلاق ہنسا۔

''بس اسے ہی سنتے جانا ہے۔ نہیں آج آپ نئی چیزیں سُنیں گی۔''

پھر گاڑی میں ایک دلکش آواز گونجی تھی۔ کیا آواز تھی اور کیا گیت تھا؟ سچ تو یہ ہے کہ بول سمجھ نہ آنے کے باوجود آواز کی نغمگی اور مدھر تانوں کی طرح ڈوبتا ابھرتا موسیقی کا رچاؤ اتنی مہلت ہی نہیں دے رہا تھا کہ میں معانی پر غور کرتی۔ مجھے لگتا تھا کہ جیسے پھولوں کی بچھی چادر پر بادِ صبا ہولے ہولے رقص کرتی ہو۔ گیت ختم ہوا تو میں نے ایسی دلکش آواز والا کون ہے؟ اور تھوڑا سا مطلب بھی جاننا چاہا۔

اور مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہ Give me love کے Songs of the Broken hearted Baghdad سیریز کا ایک گیت ہے اور گلوکار سید عبود ہے افلاق نے عربی میں گاتے ہوئے اُس کا تھوڑا سا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔

short of dying

How can I get you out of my mind

My agonishing pain and my cries

go on and go on

Every one except me is asleep

I toss and turn

sleep eludes me

عود اور وائلن کی سنگت ۔گیت تو دل میں گُھا جاتا تھا۔

مزید تفصیل کچھ یوں تھی کہ اس نائیٹل کے ساتھ یہ کارنامہ ہز ماسٹرز وائس گرافون کمپنی نے 1925 سے 1929 میں انجام دیا تھا۔ کہ عراق پر برٹش قبضے کے دوران موسیقی کے یورپی ماہرین نے میسو پوٹیمیا اور اردگرد کے عرب علاقوں کے لوک گیتوں اور بدلتے رجحانات پر شاعری اور موسیقی کوسُنا تو حیرت زدہ رہ گئے ۔یہ اُن کیلئے ایک حیران کن تجربہ تھا۔محبت کے آفاقی جذبے کے ساتھ ساتھ اس میں مختلف قوموں کے مذاہب، انکے مذہبی فرقوں ،رسم و رواج ،ان کے جذبات اوراحساسات کے جولطیف رچاؤ تھے وہ لاجواب تھے۔تب وہ قریہ قریہ گاؤں گاؤں گھومے۔بھیس بدل بدل کرلوگوں سے ملتے اوراس اثاثے کو اکٹھا کرتے ۔پھر 2008 میں اس پرانی شراب کونئی صدی کی مختلف ثقافتی اور کلچرل آمیزش کے ساتھ نئے جام وسبو میں ہونسٹ جانز Honest Jones نے پیش کیاتو یہ گیت دوآتشہ کیاسہ آتشہ بنے۔

گانے سنتے ،جگہوں کے بارے میں باتیں کرتے کہیں چھوٹی ،کہیں بڑی سڑکوں اور چوراہوں سے گزرتے ،اردگرد دیکھتے،کہیں ٹیکسٹائل فیکٹری کے بارے میں سُنتے ،کہیں مشینری ورکشاپ کے بارے میں جانتے،کہیں پاور پلانٹ پر بات کرتے،کہیں ٹیچرز ٹرئینگ کالج کی عمارت،کہیں ادھوری صدام گرینڈ مسجد کو دیکھتے اورخود سے کہتے مسجدتو موجود پرصدام غائب۔اب یہ عظیم مسجد کب تکمیل کو پہنچے گی؟ ان سب کے ساتھ جنگ کی تباہ کاریوں کا ناقدانہ جائزہ لیتے لیتے عدن سکوائر سے مرکزی شاہراہ 14 جولائی پر آئے ۔

انتظامی لحاظ سے بغداد دو حصّوں میں میں منقسم ہے۔

اعظمیہ، کاظمیہ، رصافہ، کرخ، کرادہ، منصور

نیوبغداد، رشید، صدرسٹی

نوناموں کوافلاق نے ایک سانس میں گنوادیا۔مجھے کہناپڑا۔''بیبادم تو لو۔''

''اس طرف دیکھیے۔''اُس نے ایک شاندار بلڈنگ کی طرف اشارہ کیا۔

یہ نیشنل پارلیمنٹ ہاؤس تھا۔

ایک خوبصورت وسیع وعریض عمارت سورج کی روشنی میں چمکتی تھی۔کھجور کے درختوں میں ہنستی تھی۔عمارتیں کتنی بھی خوبصورت کیوں نہ ہوں کس کام کی؟اگراندرمردِحُر نہیں بیٹھے۔عاقل نہیں اوروِژنی بلوغت نہیں۔اسلام آباد بھلایاد آنے سے کیسے چُوکتا؟

یہاں کی تو خیرلٹیا ہی ڈوبی پڑی تھی۔عراقی گورننگ کونسل کے بارے میں جانکاری چاہ رہی تھی کہ سارے دئے اوربھڑوے ہی ہیں یا کوئی کام کادانہ بھی ہے۔

افلاق ہنساتھا۔کام کا دانہ کیسے چلے گا؟ضمیرفروشوں اور بےغیرتوں کے ٹولوں میں۔

ہمارا وہ شہرہ آفاق شاعر سعدی یُوسف سچا اور پکا انقلابی سوشلسٹ نظریات کا حامل گذشتہ آمر کے دور میں بھی باہر تھا اور اب جب وہ ہمارے سکے سودھرے(خیر خواہ ہمدرد)ہمیں اُس ظالم سے نجات دلانے ہوا کے گھوڑوں پر تیرتے ہماری زمین پر آگئے ہیں۔سعدی یوسف اپنے وطن،اپنے گھرنہیں آسکتا کہ اُس کا نام ناپسندیدہ لوگوں کی فہرست میں پھر سے شامل ہوگیا ہے۔بصرہ اُس کا آبائی شہر ہےاوروہ زمانوں سے پیاسا پھر رہا ہے۔پہلے صدام سے خائف تھا۔اب ہمارے اِن نئے نجات دہندوں نے اُسے بین کردیا ہے۔جنگ کے دوران اُس نے امریکہ کو مخاطب کرتے ہوئے''تحائف کے تبادلوں''والی نظم لکھی تو انٹرنیٹ کے ذریعے یہ چند لمحوں میں بغداد اور بصرہ کے قصبوں اورشہروں میں کیا

ڈنیا بھر کے لوگوں کے ہونٹوں پر تھی۔ ذرا سنیے۔

Take the books of your missionaries
and give us paper for poems to defame you
Take your samuggled cigarettes
and give us potatoes.
Take the stripes of your flag
and give us the stars
Take Saddam Hussain
and give us Ibrahim Lincon.
Take what you do not have
and give us what we have

میرے دل نے بڑا ابو جہل پن محسوس کیا تھا۔ اور خود سے کہا بھی تھا۔ جذباتی اور احمقانہ پن ہی ہے نا ہمارا۔ صدام وہ کیوں لیں۔ انہیں تو قدرت نے ابراہم لنکن دیا تھا۔ اور ہم کون سا تہی دست ہیں۔ اتنا بڑا رھما، اتنا بڑا لیڈر تو ہے ہمارے پاس۔ مگر ہم اس کی طرف توجہ دیں۔ تب نا۔

قرآن کی رسی کو مظبوطی سے تھامنا تو ہمارے نصیب میں ہی نہیں۔

اپنے گہرے عراقی شاعر دوست مظفر النواب کو خود پر عائد پابندی کے بارے میں بذریعہ نظم اطلاع دیتے ہوئے اس نے لکھا تھا۔

''ان کی فہرستیں، میں تھوکتا ہوں اُن پر۔ میں اُنہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ہم اہل عراق جو اِس سرزمین کی تاریخ کے وارث ہیں۔ ہمیں اپنی بانس کی معمولی سی چھت پر بھی بڑا

فخر ہے۔''

گاڑی تیزی سے مڑی تھی۔

یہاں وہی خوبصورت زوارہ پارک نظر آیا تھا جہاں میں رات آئی تھی۔

''اس وقت دھوپ کو تیز ہے مگر پھر بھی صبح ہے۔ دن کی روشنی میں اندر ایک نظر ڈالیں گی۔'' افلاق نے میری رائے چاہی۔

سویرے سویرے پارکوں میں گھس جانے کے خیال سے ہی مجھے کوفت سی محسوس ہوئی اور میں کہہ بیٹھی۔

''رات تو آئے تھے یہاں افلاق۔ بغداد میں اپنی صبح میں نے باغوں اور پارکوں کی نذر نہیں کرنی۔

گاڑی مڑی۔ شاہراہ یفہ Yafa پر چڑھی۔ پھر جمہوریہ پل پر آئی۔ پل سے نیچے اُتری اور کھٹ سے التحریر سکوائر کے سینے میں گھس گئی۔ پاس ہی الرشید روڈ تھی۔ افلاق نے مجھے متوجہ کیا تھا۔

''رات کو ہم یہاں بھی آئے تھے۔''

میں حیرت زدہ سی اِس سارے منظر کو ہونقوں کی طرح دیکھتی تھی۔ رات مشرقی بغداد کا یہ کمرشل حصّہ روشنیوں کے سیلاب میں ڈوبا ایک انوکھا، نرالا، حیران کن طلسم بکھیرتا تھا۔ اور اب سارے منظروں پر جُھرلو سا پھرا ہوا تھا۔ سارا ماحول گرد آلود فضا میں جیسے دھیمے دھیمے سانس لیتا ہو۔ دجلا بھی گدلا۔ ابونواس روڈ بھی اُس طوائف کی طرح اُجڑی پُجڑی جس کے منہ پر صبح صبح پھٹکار برستی ہے۔ عمارتوں کا بانکپن گہنایا سا۔ یوں جیسے انہیں کیموفلاج کرنے کیلئے اُن پر پتلی سی مٹی کا کوٹ پھیر دیا گیا ہو۔ یہ التحریر سکوائر تھا جس نے رات مجھے سحر زدہ کیا تھا۔

دن اور رات کے روپ میں ایسا تضاد میں نے کہیں نہ دیکھا تھا۔الف لیلیٰ کی طلسمی کہانیوں کا بغداد اپنی کہانیوں جیسا ہی تھا۔

رات اور دن کے اِس تقابلی جائزے کے بعد گاڑی سنک Sinak برج پر چڑھی ،اُتری پھر میوزیم سکوائر کی طرف دوڑ لگا دی۔یہ حیفہ اور ناصرہ سٹریٹ کے درمیانی علاقے میں واقع ہے۔دنیا کی قدیم ترین بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ قبل از تاریخ کی باقیات کا بھی یہاں ہونا اِسے بہت انفرادیت دیئے ہوئے ہے۔

بغداد کا یہ علاقہ کرخ ہے اور زمانوں سے اِسی نام کو سنبھالے ہوئے ہے۔کچھ تھوڑا سا کل مروان نے بتایا تھا میوزیم کے لٹنے لُٹانے اور دنیا کی قدیم ترین تہذیب کے اجڑنے بکھرنے بارے۔کچھ اب افلاق سے سُن رہی تھی کہ حملوں کے دوران اُس کا دروازہ بمباری سے ٹوٹ کر گرا۔امریکی سپاہی اور اُچکے بدمعاش بھُوکے کتوں کی طرح اندر داخل ہو گئے تھے۔نادر شاہکار لوٹ کر لے گئے۔لائبریری کی نایاب کتب فٹ پاتھوں پر پڑی ہوئی ملی تھیں۔یہ لائبریری میسوپوٹیمیا تہذیب پر دُنیا کی بہترین لائبریری ہے جہاں بے شمار زبانوں میں وہ ادوار محفوظ ہیں۔

اس کے حشر نشر بارے سُنتی تھی تو بس لگتا تھا جیسے کانوں میں کوئی سیسہ ڈالتا ہو۔

رعب داب والی عظیم الشان عمارت جس کا بیرونی حصہ بارہ سو سال قبل کے ایک نئے عربی طرز تعمیر کے حُسن سے سجا کھڑا تھا۔عجیب سی بات تھی۔اس کے محرابی صورت دروازے اور راؤنڈ سٹی وال سٹائل والے میناروں کو دیکھتے ہوئے میری نظروں میں اُس اشتیاق لگن اور دید کی تڑپ تو تھی ہی جو بالعموم کسی بھی نئے ملک کے تاریخی شہر کی اہم جگہوں اور اہم عمارتوں کو دیکھتے ہوئے آنکھوں سے چھلکتی ہے پر اُن کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں جھانکتا ہوا وہ دکھ اور کرب بھی تھا جو بغداد کے چہرے پر لگے زخموں، اُن کے متاثر ہونے

کی شدت اور کس حد تک بحالی ہوئی ہے؟ جیسے جائزوں سے بھرا ہوا تھا۔

دروازے کی مرمت کی جا چکی ہے اور زندگی اپنے معمول پر رواں دواں تھی۔ میوزیم کیلئے لوگ بھی بس برائے نام ہی تھے۔

اندر داخل ہونے سے قبل میں نے باہر کے ماحول پر ایک گہری نظر ڈالی تھی۔کھجور کے درخت پاسبانوں کی طرح کھڑے تھے۔میرے سامنے بڑے میدان تھے جنکی حد بندی قد آور آہنی جنگلوں سے کی تھی۔2003 کے بعد اِسے طویل عرصے بعد دوبارہ کھولا گیا تھا۔چلو میری خوش قسمتی کہ میں اسے دیکھ سکی۔مجھے اِس سارے منظر نامے پر دُکھ ویرانی اور اُداسی کی گھمبیرتا کا احساس ہوتا تھا جو دل کو مضطرب کرتا تھا۔

دیس میں روزمرّہ کی مسلم امہ اور تیسری دنیا کے بیچارے مفلوک الحال ملکوں سے متعلق خبروں پر میرے دکھ اور اضطراب سے بھرے احساسات پر میری میری خلیری بہنیں ہمیشہ یہی کہتیں۔ارے اس کا حال تو ''بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ'' والا ہی ہے۔

اس وقت میں جب ایسے ہی احساسات کی رو میں بہتی تھی۔میں نے خود سے کہا تھا۔''بھئی اب کیا کروں بس میں ایسی ہی ہوں۔''

''ارے پہلے اندر تو چلوں منہ متھا تو دیکھ ہی لیا ہے۔اب گریبان میں بھی جھانکوں۔''

سیکورٹی کے مراحل طے ہوئے۔داخلی دروازہ ابھی بھی ریت کی بوریوں سے بھرا پڑا تھا۔دل اندر جا کر بھی اُجڑا اُجڑا سا تھا۔ایک پڑھی لکھی قوم کا گھٹیا پن۔چاند پر کمندیں ڈالنے والے ایسے وحشی، ظالم اور انسانیت سے عاری لوگ۔

اور یہاں تو صورت ایسی گھمبیر تھی کہ معاملہ ایک تھوڑی بیسووں، قوموں سمیریوں Sumerians سے اشوریوں Assyrians حطیطیوں، کلدانیوں، پارتھیوں

Parthians، ساسانیوں Sassanians، یونانیوں، رومیوں اور عربوں تک کے کچھ چھٹوں، ان کے پھلنے پھولنے اور اُجڑنے کی نشانیوں کے ساتھ محفوظ تھے۔ دُنیا کے ٹھیکیداروں کو اِن پتھر کے ٹکڑوں اور مجسموں کا فکر تھا۔ ایک دہائی تھی ۔نوادرات کے ماہر اور امریکن کلچرل کونسل کے اراکین پینٹا گون اور برطانیہ سے کہتے تھے۔

''بھئی اپنے ہتھیار، اوزار اور ایجادات ٹیسٹ کرنا چاہتے ہو۔ شوق سے کرو۔ دنیا کو تھوڑی سی تڑی لگانی ہے۔ لگا دو۔ اچھا ہے ذرا خودسری ہو رہی ہے۔ ہوش میں آجائے گی۔ پر سُنو۔ گلیاں عراقی لاشوں سے پٹ جائیں پرواہ نہ کرنا۔ سڑکیں ان کے خون سے سُرخ ہو جائیں ہونے دینا۔ معصوم بچوں اور عورتوں کیلئے بغداد اکیسویں صدی کا کربلا بن جائے بننے دینا۔ بس احتیاط رہے کہ بغداد میوزیم کا بال بیکا نہیں ہوگا۔ یہ ہر طرح محفوظ ہونا چاہیے۔

پر ساميوں اور حامیوں نے ذرا پروا نہ کی۔ بمباری سے عمارت اور صحن کو آگ سے بچانے کی بھی بس واجبی سی کوشش ہوئی۔ گوروں اور نیٹو لوگوں کے ساتھ ساتھ پرانے عراقی پاپیوں کو بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کا موقع مل گیا۔ انتہائی قیمتی مجسموں پر رالیں ٹپکیں، کچھ سمندر پار، کچھ گھروں اور محفوظ جگہوں پر کہ ذرا امن ہو جائے تو پیسے کھرے کرنے کا سامان ہو۔

گرینائٹ کے سفید چبوترے پر کھڑا مجسمہ میسوپوٹیمیا کی Assyrian تہذیب کی نمائندگی کرتا تھا۔

سیکورٹی کے مراحل طے ہوئے۔ میں اندر داخل ہوئی تھی۔ وسیع وعریض صحن جو ابھی حفاظتی انتظامات، فوجی گارڈوں، آہنی رکاوٹوں اور ریت کے بوروں سے بنی دیواروں سے لیس نظر آتا تھا۔ صحن کی مغربی سمت عراقیوں کی دیوار کے ساتھ کی گئی قلعہ بندی ابھی بھی

نظر آتی تھی۔

میوزیم کی عمارت اور مرکزی گزرگاہ سے بڑے ہال میں داخلے سے اس کے بین الاقوامی معیار کا اندازہ ہوتا تھا۔انسانی چہروں پر چار ٹانگوں والے شیروں جیسے حلیے والے دیوہیکل جانور دیواروں میں نصب کس خیال کے نمائندہ تھے۔طاقت اور شہہ زوری کے۔ افلاق سے یہی معلوم ہوا تھا۔کمروں کا پھیلاؤ اندر ہی اندر وسیع وعریض ہالوں کی صورت میں پھیلتا چلا جاتا تھا۔

دس ہزار 10000 سال سے بھی زیادہ میسو پوٹیمیا تہذیب کا ہر عہد اپنے نمائندوں کے ساتھ اٹھائیس گیلریوں، تہ خانوں، ہالوں، سیکنڈ فلور اور گراؤنڈ فلور کے کمروں کے شیلفوں، الماریوں، سٹینڈوں پر سجا ہوا ہے۔افلاق سے میں نے ساری تفصیل سُن کر کہا تھا۔

''بھئی جی تو چاہتا ہے ایک ایک کمرے میں گھسوں۔عراقی تاریخ انسانیت کی تاریخ، سلطنتوں کے عروج وزوال کی داستانیں۔پر ایک وقت کی کمی اور دوسرے کم ہمتی۔ اتنی تہذیبوں کے درمیان تو یوں بھی مت وج جاتی ہے۔

چلو افلاق نے مدد کر دی تھی۔

سمیرین ہال Sumerian Hall کو سب سے پہلے دیکھیں اور جانیں کہ سمیرین تہذیب 3000 سال قبل مسیح کس عروج پر تھی۔زراعت اور آب پاشی میں ہل اور شادف Shaduf بار برداری کیلئے پہیہ، انتظامی اصلاحات میں قانون دان، اکاؤنٹنٹ، باورچی، جولاہے، کمہار، ترکھان، مندر اور پادری، شاعر، گلوکار، موسیقار سب انسانی زندگی کیلئے لازمی ٹھہرے تھے۔پڑھنے لکھنے میں تصویری علامتیں حروف کے طور پر رائج ہوئیں۔اس قوم کے مجسمے، زیورات، ملبوسات، ظروف، نوادرات کی دنیا میں پہلے

نمبر پر ہیں۔

سیکنڈ فلور پر جانے کیلئے ماربل کی سیڑھیوں کی جو توڑ پھوڑ ہوئی تھی وہ مرمت کے باوجود کچھ کہتی تھی کہ اُن کے سینوں پر ظلم وجبر کے پہاڑ توڑتے کتنے شاہوں کے بھاری بھرکم وجود لڑھکائے گئے ہوں گے کہ لوٹ مار کرنے والوں کے پاس ہمیشہ وقت کی کمی بھی ہوتی ہے اور پکڑے جانے کا خوف بھی۔

سیڑھیاں آرام دہ اور خوبصورت تھیں۔ٹیرس پر نصف دائرے میں ہر قوم جیسے سمیری، عکاد، آشوری اور دیگر محرابی صورت میں بنی گزرگاہوں سے ملاقاتیوں کو اپنے اندر آنے کی دعوت دیتی تھیں۔اُن میں داخل ہو کر ایک جہان وا ہوتا تھا۔

افلاق مجھے سمیرین ہال کے وسط میں لے گیا۔جہاں اِس ہال کی سب سے قیمتی چیز سمیرین بادشاہ اینتمینا Entemena کا بغیر سر کے پتھر کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔

تقریباً 4400 سال پُرانے اِس مجسمے کے چور جانتی ہیں کون تھے؟میں نے حیرت سے بھری آنکھیں اُٹھائیں۔

''امریکی فوجی۔''

''اوہو۔''

وہ تو چاروانگ شور مچ گیا۔انسانیت کے ٹھیکیداروں کو مروڑ اُٹھنے لگے تھے۔اُن کے حسابوں آرٹ وکلچر کا خون ہوگیا تھا۔بھاگ دوڑ ہوئی۔نیچے کی مٹی اوپر آئی تب کہیں جا کر خیر سے یہ نیویارک کے آرٹ ڈیلروں سے برآمد ہوا۔

اسی طرح بے شمار مجسمے، سونے کانسی کی چیزیں، عراق اور نیٹو دونوں نے مل کر لوٹیں۔بیشتر تو نکلوالی گئی ہیں۔بہت ساری ابھی بھی گُم ہیں۔

''کھیر تتی تتی نہیں بہت ٹھنڈی کر کے کھانے کا پروگرام ہے یار لوگوں کا۔اب ترقی

یافتہ دُنیا اُن کے غم اور سوگ میں بڑی واویلا کرے۔ جتنا جی چاہے شور مچائے۔ بھونڈے احتجاج کرے۔ آرٹ Lover's قوموں کے لیے۔

پبلک گیلریوں میں سے ایک میں ورقہ کا وہ مقدس منقش مرتبان دیکھا۔ کیا نقاشی تھی؟ پور پور زخمی ہوا پڑا تھا۔ چودہ حصّوں میں ٹوٹا ہوا۔ کس مہارت سے جوڑا گیا تھا۔

بے چارے ماڑے موٹے غریب غربا عراقی بچے، بوڑھے، نوجوان اسپتالوں میں ٹوٹی ٹانگوں، جلے چہروں کے ساتھ مسیحاؤں کے انتظار میں جانیں دے رہے تھے۔ دوائیں نہ ملنے کے باعث مر رہے تھے تو بھئی دیں جانیں۔ یہ ان کلچرڈ جاہل لوگ اِسی سلوک کے مستحق ہیں کہ کبھی پابندیوں کے ہاتھوں بنیادی ضرورت کی چیزیں نہ ملنے پر مرجائیں اور کبھی غریب ملکوں کی قیمتی چیزیں ہتھیانے کے چکروں میں اُن کی دھرتی پر گرائے جانے والے خطرناک بموں سے ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں یا لنگڑے لولے ہوکر سامان عبرت بن جائیں۔

یہاں میں نے نرم سفید پتھر کے پجاری دیکھے۔ ہاتھ باندھے ہوئے، چہروں پر مسکینی، پہناووں پر بڑی بڑی خوبصورت ڈیزائن کاری تھی۔ کہیں دھڑ ٹوٹے ہوئے تھے جنہیں جوڑا گیا تھا۔ بنانے والے کیا کمال کے انسان تھے؟

سمیرین کیسے ذہین لوگ تھے؟ وہیں ورقہ کے سفید سنگ زرم کے ماسک اور مجسمے تھے۔ دیواروں میں نگینوں کی طرح جڑے عورتوں مردوں کے مجسمے۔ زیورات ایسے خوبصورت اور ڈیزائن دار کہ آج کی ماڈرن لڑکیاں دیکھیں تو اُن کی جان پر بن جائے۔

موسیقی کا ایک بڑا سا آلہ چلو بربط کہہ لیں وہ بھی شکستہ دم پڑا تھا کہ سونا اندر سے نکال لیا گیا تھا۔ کانسی کا مجسمہ باسطک Basitke کے ایک نوجوان کا اور شاہ Schalmanezer کا مجسمہ واقعی دیکھنے کے قابل تھے۔ گراؤنڈ فلور پر سیلنڈر سلیز،

موتی منکے اور زیورات تھے۔اتنے زیادہ کہ بندہ اِس ڈھیروں ڈھیر ہجوم میں گُم ہو جائے۔ہاں البتہ سیلنڈر سیلز بہت حیرت انگیز تھیں۔چھوٹی ہونے کے باوجود اُن پر تحریریں تھیں۔سخت پتھر کی سیاہ اور گہرے سبز رنگ کی یہ سرکردہ شخصیات کے دستخطوں اور دفتری مہروں کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔شیلف بھرے پڑے تھے ان سے۔

چند اور چیزوں نے توجہ کھینچی۔بلکہ دیر تک اپنے پاس ٹھہرائے بھی رکھا۔

ایک پجاری دیوی۔ماشاءاللہ سے ہماری ٹُن ٹُن جیسی دِس اُس کے گھیرے میں آہیں۔قریب جا کر حدود اربعہ پڑھا۔خیر سے شائد ایران سے تھیں۔گردن تک تو معاملہ درست تھا۔سر چھوٹا تھا چلو خیر۔آنکھیں نئے نکور کانچ کے نیلے بٹنوں جیسی تھیں۔خوب سجی تھیں۔جو فراک پہنے بیٹھی تھی وہ بھی بہت خوبصورت ڈیزائن دار پر پھیلاؤ کتنا تھا اللہ ہو غنی۔

دوسرا اشوری زمانے کا کیا لاجواب شاہکار تھا۔جپسم سے بنا یہ مجسمہ بظاہر چپٹا سا نظر آتا تھا۔پر اُس پر جو مردانی صورتیں کندہ تھیں۔وہ تو قدموں کو روکتا تھا۔پہلی منزل کے سٹوروں میں الماری کے شیلف رنگا رنگ برتنوں سے ناکوں ناک بھرے پڑے تھے۔ان کے سٹیل کے دروازے بھی کس قدر خوبصورت تھے۔

افلاق نے تہہ خانوں کے کمروں میں چلنے کیلئے کہا تھا۔وہاں جیولری کے انتہائی نادر شاہکار تھے۔

''دفع کر تھوڑا سا اسلامی عہد کو دیکھ لوں۔''

اسلامک گیلریوں میں گُھسی محرابی ساخت کی گیلریاں۔سچ تو یہ تھا کہ یہاں کا ماحول جلال، جمال و تقدس اور نور کے پُرفسوں سے ہالے میں لپٹا محسوس ہوتا تھا۔پتھر کے محرابی دروازے اور تختیاں کندہ کاری کی پھول پتیوں اور عربی کی آیات سے سجی دامن دل کو کھینچتی تھیں۔شیشوں میں سجے اسلامی عہد نامے مختلف ادوار کے قرآن پاک کی

جلدیں، ترجمے، تفسیریں، چوبی کندہ کاری کی محرابیں سب نہ صرف متاثر کرتی تھیں بلکہ آپ کا روحانی رشتہ اس وراثت سے جڑا ہوا ہے کا بھی بتاتی تھیں۔

کمروں میں بیٹھے نگران انگریزی سے نابلد نہیں تھے پر امریکیوں سے دلی نفرت کا کچھ وہ عالم تھا کہ جتنا بس چلتا تھا اور جیسے چلتا تھا کا اظہار ہوتا تھا۔ صدام کے بارے میں بھی بس ایسے ہی جذبات تھے۔

بیک یارڈ بہت کشادہ اور خوبصورت تھا۔ گھاس کے قطعوں کی تراش خراش آرٹسٹک سٹائل کی تھی۔ فٹ پاتھ پورے لان میں بکھرے جیومیٹری کی شکلیں بناتے تھے۔ گیٹ عقبی سڑک پر بھی کھلتا تھا۔ جو اس وقت بند تھا۔ سیکورٹی گارڈ بندوقیں سنبھالے پہرے دیتے تھے۔ چند لمحے رُک کر میں نے گردوپیش کی عمارتوں کو دیکھا اور پھر واپس اندر آئی اور گھومتے گھومتے میوزیم کے داہیں حصے میں جا گھسی تو ٹھٹھک گئی۔ جہاں جرٹروڈ بیل کانسی کے مجسموں اور آرٹسٹوں کے کمال فن کی صورت میں یہاں وہاں بکھری ہوئی تھی۔ اس کی لکھی گئی کتابیں، اس کے استعمال کی اشیاء سبھوں کو میں نے دیکھا۔

مجھے پتہ چلا تھا کہ اس شاندار میوزیم کو بنانے میں اُسکی انتہا درجے کی دلچسپی، آثار قدیمہ اور خاص طور پر میسوپوٹیمیا کی سرزمین پر بکھرے ہزاروں سالہ تاریخی ورثے سے اُس کی بے پناہ محبت اور لگن نے یہ عظیم کارنامہ اُس سے کروایا۔

جرٹروڈ بیل کون تھی؟ میں نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی۔

اور میری کچھ جاننے کی خواہش پر افلاق مجھے میوزیم کے کیفے ٹیریا میں لے آیا۔ جہاں قہوے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹوں میں اُس تاریخ ساز عورت کے بارے سُنا۔

جب باہر نکلی۔ دوزخ سے نکلے لو کے تھپیڑوں نے استقبال کیا۔ بیگ میں رکھا

گیلادستی تولیہ فوراًنکال کر چہرے کے گرداگرد لپیٹا کہ کہیں ماڑی موٹی جلد جو آب تک ساتھ نبھاتی چلی آرہی ہے کسی کورے برتن کی طرح تڑخ نہ جائے۔

افلاق سے صبح میں نے پاکستانی ایمبیسی جانے کا کہا تھا۔''چلو دیکھوں تو سہی۔ شمال کے گرد علاقے دیکھنے میں کچھ مددگار ہو سکتے ہیں یا شام جیسی صورت یہاں بھی کہ سفارت کاری تو کیا کرنی ہے؟ہاں ذاتی مال ومتاع بنانے اور اکٹھا کرنے میں مصروف ہیں۔جس کے کچھ احوال میں نے وطن میں پڑھے تھے اور رقیہ سے دمشق آکر آشنا ہوئی تھی۔

پاکستان ایمبیسی کھوجنے میں اُس نے مجھے کئی سڑکوں پر گھمادیا۔ایمبیسی نہ ملنا تھی نہ ملی۔

''انڈین ایمبیسی لے چلوں۔''اُس نے پوچھا۔

''لو میں نے کیا کرنا ہے وہاں جا کر۔''میرے لہجے میں شکستگی تھی۔

''پھر کیا کروں۔''

پاکستان ایمبیسی کا کسی کو پتہ نہیں تھا اور انڈینز کے عربی میں چھپے بروشر کئی دو کانوں سے مل گئے۔شام میں تو دو کلو کے خاکی تھیلوں میں چاول بھی دیکھ آئی تھی اور کڑھی بھی تھی کہ دو کانوں پر کوئی تو پاکستان میڈ چیز نظر آجائے۔دجلہ میرے ساتھ ساتھ بہہ رہا تھا۔

''افلاق تمہیں بھلا کیوں نہیں معلوم۔''میرے لہجے میں چھپا گلہ سا محسوس کرتے ہوئے اُسنے دھیرے سے کہا۔

''شرمندہ ہوں۔واقعی علم تو ہونا چاہیے۔''

پھر اُسنے دو تین جگہ رابطہ کیا۔شاید اُس نے میری اِس بات کو اپنی پیشہ ورانہ مہارت پر اعتراض جانا یا اس کے وطن میں اپنے ملک سے وابستہ کچھ دیکھنے کی میری

خواہش یا تمنا کا اُسے احساس ہوا تھا۔

بہر حال خاصی تنگ و دو اور گلیوں کے دائیں بائیں بہت سے چکر کاٹنے کے بعد اس نے مجھے ایک گلی میں واقع ایک چھوٹی سی کوٹھی جس کا سفیدی مائل بند گیٹ زنگ آلود ہوا پڑا تھا لا کھڑا کیا تھا۔ اب بیل کیے جا رہے ہیں کوئی نکلتا ہی نہیں۔

میں نے اپنے اوپر لعنت بھیجی۔ ''بڑی ڈھیٹ ہوں۔ جانتے بوجھتے بھی باز نہیں آتی۔''

جب گاڑی میں بیٹھی تو جھلاہٹ سی سوار تھی۔ بُھوک سے بھی بُرا حال تھا۔ قہوے کی ایک گلاس کے ساتھ چند بسکٹ جو میں نے میوزیم کی کافی شاپ سے کھائے تھے۔ وہ کب کے ہضم ہو گئے تھے۔

''ڈھائی بج رہے ہیں اب میں آپ کو مسجد چھوڑوں گا۔ تین گھنٹے آرام کریں۔ ہاں کچھ کھانا ہے تو مجھے بتائیں۔''

''میرے پاس دودھ اور میری دوائی ہے۔ بس یہی میرا لنچ ہے۔''

''ارے ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا۔ چچی نے آپ کے لیے جبن بھیجی ہے یہ آپ کو یقیناً پسند آئے گی۔''

ایک چھوٹا سا شاپر اُس نے گاڑی کے ڈیش بورڈ سے نکال کر مجھے تھما دیا۔ میں کچھ اور دیکھنے کی متمنی تھی کہ وقت بھی تو تھوڑا ہے۔ جب میں نے اس کا اظہار کیا وہ بولا۔

''آرام تھوڑا سا آرام۔ تھکن آپ کے چہرے سے دُھواں دھار قسم کی بارش کی طرح برس رہی ہے۔ موسم بھی اسوقت انتہا پر ہے۔''

اُس نے مجھے 14 رمضان مسجد تحریر سکوائر میں اُتارا۔ صد شکر کہ مشرق وسطیٰ میں مسجدوں میں عورتوں کا حصّہ بھی ہے۔ یہاں خوبصورت قالین بچھے تھے۔ خوشگوار اور لطیف سی

ٹھنڈک کا رچاؤ فضا میں گھلا ہوا تھا۔

دودھ کا پیکٹ نکالا۔بند گلاس میں قتیرہ گوند اور تخم ملنگا کے آمیزے میں شامل کیا۔تھوڑی سی مصری ڈالی۔جب اُسے پی چکی تھی۔افلاق کی چچی کے تحفے کا خیال آیا۔فوراً اُسے کھولا۔چھوٹی سی نان نما روٹی پر کریم اور تازہ گٹھلی نکالی کھجوروں کا لیپ سا کیا ہوا تھا۔ایک نوالہ لیا تو بہت مزے کا لگا۔سارا کھالیا۔پیٹ بھرا تو شکر ادا کیا کہ اُسنے کھانا دیا اور آرام کے لیے ٹھنڈی جگہ دی۔

کیمرے کی تھیلی کی لمبی ڈور کو گلے میں ڈالا اور کیس سمیت گریبان میں اڑیلا۔عراقی دینار دوپٹے کے پلّو میں باندھے اور انہیں بھی وہیں پہنچایا جہاں پہلے خزانے دفن تھے۔تن پر پہنی سیاہ عبایا کا گلا درست کیا۔بیگ سرہانے اور ٹانگیں لمبی پسار لیں۔

کتنی دیر سوئی کچھ معلوم نہ تھا۔ٹانگ پر زور پڑا تو ہڑبڑا کر اٹھی۔موٹی تازی گوری چٹی خاتون کہتی تھی۔

''اذان ہوگئی ہے۔صلوٰۃ۔''

شرابیوں کی طرح جھومتے جھومتے سر کو سنبھالا۔جی تو چاہتا تھا کہ سر کو زمین پر پٹخوں اور سو جاؤں۔پر اندر تین چار عورتیں اور آ گئی تھیں۔

وضو کرنے میں اتنی دیر لگائی کہ اگر کوئی ساتھی ساتھ ہوتی تو یقیناً کہتی۔وضو کرنے گئی تھیں یا پائے پکانے۔اب کرتی کیا۔پانی تو ایسا تھا کیتلی میں پتی ڈالو اور دم پر لگالو۔بے چاری پکوڑا سی ناک والا چہرہ جسے بادِسموم میں جھلسنے سے بچاتی لائی تھی اُسکا خانہ خراب یہاں ہو جانا تھا۔چلّو بھر پانی کو کوئی دو منٹ ہاتھوں میں رکھتی پھر داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے انہیں منہ ناک میں پھیرتی۔وضو کیا کرنا تھا بس مسح ہو گیا تھا۔

نماز سے فارغ ہوکر باہر آ گئی تھی۔بازار کی رونقیں بحال ہو رہی تھیں۔ٹریفک

میں تیزی اور لوگوں کے ہجوم بڑھ رہے تھے۔ افلاق سے موبائل پر بات ہوئی تھی۔ اُسنے گھنٹہ بھر بعد آنے کا کہا تھا۔

''چلو اچھا ہے میں ادھر ادھر گھومتی ہوں۔''

ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ قہوے اور حمس کا آرڈر کرنے کے بعد ارد گرد کی رونقیں دیکھنے لگی جب دو اُدھیڑ عمر اور ایک نوجوان لڑکی وہاں آکر بیٹھیں۔ دونوں عورتیں سرخ و سفید، صحت مند جنکے غیر معمولی بھاری سینے اور کولہے عباؤں سے بھی چھلکے پڑتے تھے۔ نوجوان لڑکی نے سکارف اور کھلے بازوؤں والی لمبی سی قمیض نما میکسی پہن رکھی تھی۔ سینوں پر لہراتی بل کھاتی صلیبی زنجیروں نے مجھے بتا دیا تھا۔ میں خوشدلی سے ان کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ جواباً انہوں نے بھی محبت بھری مسکراہٹ بکھیری۔ حوصلہ پا کر میں ان کی ٹیبل پر گئی اور تعارف کے مراحل طے ہوئے۔

ڈیلی کریم اور جوزفین سیاب جن کے آباؤ اجداد کوئی 1604 کے لگ بھگ ایران سے یہاں آئے تھے۔ ڈیلی کریم شمالی عراق کے شہر موصل سے تھی یوں دونوں کی پیدائش اور بچپن جوانی سب بغداد سے منسلک تھے۔ ڈیلی کی شادی موصل میں ہوئی۔ اور وہ ابھی بھی وہیں تھی جبکہ جوزفین 1998 کے بعد سویڈن چلی گئی۔ کوئی نو دس سال بعد وہ بغداد آئی تھی۔ دونوں سہیلیاں بغداد کے نوسٹلجیا میں مبتلا تھیں۔ انہیں اپنے بچپن کا وہ بغداد نہیں بھولتا تھا۔ اُنکی یادوں میں بسا وہ شہر جو کوسموپولیٹن تھا۔ جو بڑا ماڈرن اور ملٹی کلچرل تھا، جس میں رواداری اور برداشت کا عنصر بدرجہ اتم موجود تھا۔ مختلف مذاہب کی رنگا رنگی جس کا حسن تھا۔ دُکھ تھا۔ کرب کا واضح اظہار تھا جوزفین سیاب کے لہجے میں۔ آنکھوں میں اُتری نمی بھی بہت کچھ کہتی تھی۔

ہمارے آبائی گھر یہیں اِس پرانے بغداد کی اِسی شاہراہ رشید کی اطرافی گلیوں میں

تھے۔ہماری عیدیں، رمضان، کرسمس، گڈ فرائی ڈے سبھی مشترکہ تھے۔یہیں ہماری یہودی خالہ رہتی تھی جو بعد میں بغداد کے جنوبی حصّے میں بنے جیوش کواٹر میں چلی گئی تھی۔

میری ماں کی جگری سہیلی جسے ملنے کیلئے جانے کا ہمیں کتنا ارمان اور جنون رہتا تھا۔جب کبھی ان کے ہاں جانے کا پروگرام بنتا ہم بہنیں اُچھل اُچھل کر ایک دوسرے سے کہتیں۔

''سوق حنونی (حنونی بازار) میں پھریں گے۔ہائے فوابینز (Fawa Beans) بھی کھاہیں گے۔''

میری چھوٹی بہن زبان تالو سے لگاتے ٹخ ٹخ کی آواز نکالتے ہوئے مستی میں آنکھیں نچاتی۔''کتنا مزہ آئے گا۔''

بلند و بالا خوبصورت بالکونیوں والے گھروں کی گلیوں میں غریب عراقی عورتیں Fawa Beans بیچا کرتی تھیں۔اُسے چولہوں پر دھرے بڑے بڑے پتیلوں میں پکی فوابین کھانا کتنا پسند تھا؟ جوزفین تو ہمیشہ اُوپر سادہ دہی ڈلواتی پر میں کو Dibis (کھجوروں کی چٹنی) ڈلوانا مزہ دیتا تھا۔

''میرے اُس بغداد کو نظر لگ گئی ہے۔''نمی موتیوں کی صورت نچلی پلکوں میں ٹھہر گئی تھی۔

میرے اندر سے ہوک سی اٹھی تھی ہائے میرا لاہور اور کراچی بھی پچاس، ساٹھ ستر 70 کی دہائی میں ایسے ہی تھے۔میرا کراچی تو عروس البلاد تھا جس کی راتیں جوان رہتی تھیں۔میرے لاہور کا کیا کہنا تھا۔مارڈالا ہمیں فوجیوں، سیاستدانوں کے مفادات اور ملاؤں کی انتہاپسندی نے۔کچھ ایسا ہی رونا یہ ڈیلی رو رہی تھی۔

خلیجی جنگ میں بھی بہت نشانہ بنے۔عراق پر امریکی حملے سے ہماری کیمونٹی بہت

متاثر ہوئی۔صدام کے بارے میں بات ہوئی تو کہنے لگی ''ہماری کمیونٹی کو اُس کے زمانے میں بہت سہولتیں حاصل تھیں۔بہت آزادی تھی ہمیں۔صدام جانتا تھاہم امن پسند لوگ ہیں۔''

کیتھولک عیسائیوں اور آرتھوڈوکس آرمینیاؤں کی عراقی کلچر ولٹریچر اور موسیقی میں بڑی خدمات ہیں جنہیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

ہماری جوانی میں ہی جیوش کوارٹر ویران ہوگیا تھا کہ ہمارے سب ملنے والے یہودی اپنی جائیدادیں بیچ باچ کر اسرائیل چلے گئے مگر ہم عیسائی کہاں جاتے ؟

ڈیلی کریم کی آنکھیں گیلی سی ہوگئی تھیں۔

''موصل میں ہمارا ٹورزم کا بڑا بزنس تھا۔نینوا میں میرے سسرال کے عالیشان ہوٹل تھے جو تباہ و برباد ہوگئے۔اب انہیں بیچنا مسئلہ بنا ہوا ہے۔موصل میں عیسائی کمیونٹی خاصی تعداد میں تھی جو اب بہت تھوڑی رہ گئی ہے جن میں ہمارے جیسے عراق کی محبت میں لتھڑے لوگ ہیں۔

یہ کیسا اندھا تعصب پھیل گیا ہے کہ جسنے اُن ساری حسین روایات کو نگل لیا ہے؟ چرچوں کے خلاف نفرت بھڑکائی جا رہی ہے۔موصل میں دو بڑے چرچ نشانہ بنائے گئے۔گذشتہ ماہ رمضان میں ایک ہینڈ بل چرچوں میں پھینکا گیا کہ جسمیں عیسائی کمیونٹی کو اپنے گہنگار سروں کو ڈھانپنے کیلئے کہا گیا ورنہ دوسری صورت میں موت کا سامنا کرنے کی دھمکی تھی۔یہ دھمکی القاعدہ یا زرقاوی کی طرف سے نہیں تھی بلکہ مسلم عراقی سٹوڈنس موصل کی جانب سے دی گئی تھی۔

خوبصورت لڑکی ملتی پہلی بار گفتگو میں شامل ہوئی۔

''فرانس میں جن دنوں حجاب کا مسئلہ حکومتی سطح پر زیر بحث تھا۔اُن دنوں زیادہ

شدت تھی ۔سوچنے کی بات ہے کہ وہاں موت کی دھمکیاں تو نہیں دی جارہی تھیں ۔

میں نے لمبی سانس بھرتے ہوئے اُن تینوں کو دیکھااور کہا تھا۔’’میرے ملک کو بھی کسی کی نظر کھا گئی ۔ہم تو خود اسی ظلم کا شکار ہورہے ہیں۔‘‘

مغرب کی اذانیں گونجنے لگیں ۔بتیوں کی پھیلتی جگمگاہٹوں میں منظروں کی دل ربائی بڑی اپنایت لیے ہوئے تھی ۔لاہور کی مال روڈ کے منظر رقص کرنے لگے تھے۔

میں نے ڈیلی اور راُس کی عزیزہ جوزی سے اجازت لی ۔مسجد آئی ۔مغرب کی نماز پڑھی ۔باہر نکلی افلاق انتظار میں تھا۔

باب نمبر 6:

1۔ **سُنّیوں اور شیعوں کے ازلی جھگڑوں نے ان بیچارے معصوم مقبروں کے ساتھ بربریت اور سکھا شاہی کی عجیب و غریب اور انسانیت سوز تاریخ منسلک کردی ہے۔**

2۔ **جناب امام ابو موسیٰ کاظم، جناب امام محمد تقی الجواد دونوں دادا پوتا متقی، صاحب علم و صاحب کردار ہستیاں کاظمین کو روشن کیئے ہوئے ہیں۔**

3۔ **کمبخت نے کیمرے کا چار تحریرپرس میں سے نکال کر ہوا میں یوں لہرایا جیسے کوئی کوبرا سانپ میں نے جان بوجھ کر اُس قلو پطرہ کو ڈسنے کیلئے اُس میں رکھا ہوا تھا۔**

میری بھی بے شرمی اور ڈھٹائی کی انتہا تھی کہ نبیوں، ولیوں اور خدا کے برگزیدہ بندوں کی سرزمین پر تھی اور سب سے پہلے ان کے درباروں، مزاروں اور مقامات مقدسہ پر جانے، وہاں نفل پڑھنے، خُدا کے حضور سجدہ شکر بجا لانے اور دعائیں مانگنے کی بجائے کہیں دجلہ کے پوسٹ مارٹم میں گم تھی۔ کہیں بغداد میوزیم کی تباہی پر ماتم کناں تھی۔ چلو امام اعظم، غوث اعظم اور باقی اللہ کے مقرب بندے ذرا فاصلے پر تھے پر یہ امام ابو موسیٰ کاظمین اِن کے تو پہلو میں بیٹھی تھی۔ ہوٹل واپس آتے ہوئے خود سے شرمندہ شرمندہ میں کل کے پروگرام پر اپنے آپ سے باتیں کرتی تھی۔

"تو بھئی صبح ہر صورت اُن کے حضور حاضری دینی ہے۔ چلو یہ بھی اچھا کیا کہ

افلاق کو ساڑھے دس کا وقت دیا تھا۔سکون سے نفافل، فاتحہ اور قرآن خوانی ہوگی۔

کمرے میں داخل ہو کر اِدھر اُدھر نہیں دیکھا۔سیدھی باتھ روم گئی۔برش کیا اور واپس آ کر لیٹنے کی کی کہ ایک تو تھکن سے چور تھی دوسرے کمرے میں موجود عورتوں کی متجسس کھوجتی آنکھوں سے مجھے چڑ تھی۔

علی الصبح جب نہانے کے بعد تولیے سے بالوں کو خشک کرتے باہر نکلی تو گفتگو کی یہ ٹیپ زور شور سے چل رہی تھی۔

''نگوڑے اللہ مارے بیڈ تو ایسے ہیں جیسے سزائے موت کے قیدیوں کے ہوں۔کمبخت سارا بدن تختے کی طرح اکڑا پڑا ہے۔لوڈشیڈنگ نے ساری رات سیاپا ڈالے رکھا۔گردن اور گدی کے بال پسینے میں ہی بھیگے رہے۔ایک پل چین نہیں آیا۔''

کمرے کے عین بیچ والے بیڈوں پر دو نک چڑھی اچھے گھروں کی بوڑھیاں اپنے اپنے بستروں پر بیٹھی اُباسیاں لیتی، کبھی غار جیسا منہ کھولتے، کبھی ہلکے سے ہاتھ کی اوٹ سے اُسے ڈھانپنے کی فضول سی کوشش کرتے، کبھی براچھوں کے آخری کناروں سے لعاب صاف کرتے، جلے دل کے پھپھولے پھوڑے چلی جاتی تھیں۔گلے شکوے، بے آرامی، گندہ ہوٹل۔پیکیج پر نکتہ چینی۔ماضی کے حوالوں سے گفتگو کہ جب عراق کی زیارتوں پر ایرانیوں کے دروازے بند تھے۔تب کی کھُل ڈُھل۔بڑی موجیں تھی اُن دِنوں۔ہائے آگ لگی آج جیسی مہنگائی بھی نہیں تھی اور آرام داریاں بھی بہت تھیں۔

پہلے والی نے بکھرے بالوں کو جو بیچارے بے حد چھدرے چھدرے سے تھے دونوں ہاتھوں میں سمیٹتے اور اُن کی منڈھی سی مروڑتے ہوئے کہا۔

''پانی تو رات کو بھی انڈے اُبالنے جیسا ہی تھا۔یقیناً اب بھی ویسا ہی ہوگا۔''

دوسری ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے نظروں کو دور کونے میں لے جاتے اور وہاں

بیڈ پر لیٹی سوتی یا جاگتی مسکین سی عورت پر جماتے ہوئے بولی۔''اِس کے خراٹے تھے کوئی۔مولا علی بچائے۔مانو جیسے وقت نزع کو بھگت رہی ہو۔''

''اور یہ''

اب توپوں کے دہانے میری طرف مُڑ گئے تھے۔''اِس نے تو افیون کھائی ہوئی تھی۔خراٹے تو اِس کے بھی ایسے تھے کہ اللہ گواہ ہے لگتا تھا جیسے ابھی حُر یہ قبرستان کے مُردے قبریں پھاڑ کر نکل آئیں گے۔''

مجھے غُصہ تو بڑا آیا۔مگر سویرے سویرے میرا کسی سے منہ ماری کرنے کا قطعی کوئی موڈ نہیں تھا۔میں سر کی پنیں شاید واش روم میں بھول آئی تھی وہ لینے اُٹھی۔ساتھ ہی نشانے پر دھر لی گئی تھی۔

یوں ٹھیک کہتی تھیں وہ۔میری رات تو پوستیوں کیطرح سے کٹی تھی۔دُھت سوتی رہی۔بیڈ کیسا ہے؟ اور بجلی کتنی بار گئی؟ کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔کمرے میں چھ عورتیں کیا کیا باتیں اور کِس کِس کے بخیئے اُدھیڑتی رہیں؟اللہ جانے یا وہ جانیں۔رہے میرے خراٹے۔یہ بے چاریاں پھر بھی تھوڑی سی دید اور لحاظ میں حُر یہ قبرستان تک ہی رہیں۔کوئی پُوچھتا میری یار غار نیلم احمد بشیر سے جو کانوں پر ہاتھ رکھتے کہتی ہے۔

''میرے مولا دنیا بھر کے مُردوں کے جگانے کیلئے یہ ہی کافی ہے۔ناحق اسرافیل کی ڈیوٹی لگائی تُو نے۔''

پٹیالہ(انڈیا)یونیورسٹی کے سیمینار میں ہم دونوں مدعو تھیں اور کمرہ بھی دونوں کو ایک ملا۔بچاری رات بھر میرے انجن کو ٹے جیسے شور کو کس دل گردے سے جھیلتی رہی یہ اُس کا دل جانتا تھا یا اُسکی لال بوٹی آنکھیں۔

نماز کا بیڑہ پار رہوا کہ نور پیر کے ویلے غُسل خانے میں گُھس گئی۔چلو خضوع و

خشوع سے غسل ہوگیا تھا۔بار بار کنڈی نہیں بجی تھی۔صحرائی علاقے کا پانی رات بھر بعد بھی اچھا خاصا گرم تھا۔جب باہر نکلی تھی۔کمرے میں زندگی پیچانی انداز میں جس کا اوپر ذکر ہوا ہے سانس لے رہی تھی۔

دو غریب اور ماٹھی سی عورتیں پوری آنکھیں کھولے اُن سے مرعوب سی یہ رنگ رنگیلے تبصرے سُنتی تھیں۔وہ بے چاریاں پائی پائی جوڑ اور دعائیں مانگ مانگ کر مولاعلی کے در پر آ گئی تھیں۔اِسی میں اُن کی خوشی سنبھالی نہ جاتی تھی۔ایک ستاروں اور کڑھائی سے سجا سفید سوٹ پہن کر اہتمام سے تیار ہوئی بیٹھی باتیں کرتی تھی۔ایک بازار سے سمون اور دودھ لائی تھی۔

''ہائے اتنی مہنگائی''۔دروازے سے اندر آتے ہی اُس نے بُرقعے کا اپر اُتارتے ہوئے کہا۔

''کمبخت بڑے ذلیل ہیں یہ عراقی۔میں نے کہا ایک دے دو۔میری اکیلی جان۔چلو آدھا اب کھالوں گی آدھا سنبھال لوں گی۔مانا ہی نہیں۔یہ پورا پیکٹ مجھے پکڑا دیا۔''

''آپ لے لیں''وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔

''کل پانچ سو پاکستانی بدلوایا تھا۔سویرے سویرے سارا خرچ ہوگیا''۔لہجے میں دُکھ کا واضح عنصر گھلا ہوا تھا۔

جی چاہا گتھلی کا منہ کھول کر کوئی سو پچاس ڈالر کا نوٹ اُسے دے دوں اور کہوں کہ دفع کر فکر کو۔کھلا ڈُلا کھا پی۔

پھر رُک گئی۔بہت سے خیال آئے۔اِن میں تھوڑی سی نہیں بہت ساری کمینگی کا بھی دخل تھا۔

''میں تو خود پردیس میں ہوں۔شوق بھی میرے انوکھے اور نرالے۔اللہ جانے کرایوں بھاڑوں میں ہی کتنا اُٹھے گا پھر کس کی ماں کو ماسی کہوں گی۔ہوش سے، سُوچ سے میاں۔''

''ناشتہ کا کیا ہوگا؟'' نسرین تو ابھی بھی اینٹھ رہی تھی۔توجہ کو فوراً دوسری طرف منعطف کیا۔

دُودھ کی بوتل نکالی۔گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ساتھ والی نے سمون کی پھر پیش کش کی تھی۔اُس کی پیشکش کو قبول کرلیا تھا۔

''بے چاری کا ضائع ہوگا۔چلو کل میں منگوالوں گی۔''

کہیں اندر سے بڑی ہتک آمیز آواز آئی تھی۔

''بڑی ہی کمینی اور شودی ہو۔'' اب اس کا جواب دینا بھلا کوئی ضروری تھا۔پُوری بوتل اور آدھا سمون۔چلو پیٹ پُوجا ہوگئی تھی۔

جب باہر نکلی سویرے سویرے کا سُورج اتنا روشن اتنا چمکدار تھا کہ آنکھوں میں چُبھا جاتا تھا۔

حضرت امام ابوموسیٰ کاظم کے در پر جانا تھا۔ان کے پوتے حضرت امام محمد تقی الجواد کو سلام کرنا تھا۔

اندر داخل ہونے سے قبل چیکنگ کے مرحلے تھے۔کیمرہ لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔سوچا پہلے تصویریں بنالوں۔پھر سوچا کہ ہمسائے میں تو بیٹھی ہوں کسی بھی وقت یہ کام ہوسکتا ہے۔بغداد کو تو بھگتاؤں پہلے۔

اپنے حسابوں میں نے بڑی پھرتیاں ماری تھیں پر وہاں قطاریں لگی پڑی تھیں۔وہ بھی ایک نہ دو چھ لمبی لمبی قطاریں موٹے موٹے لوہے کی راڈوں میں پھنسی۔

صبر آزما انتظار کے بعد جائے ہدف پر پہنچی ۔میں نے سیکورٹی گارڈز کو دیکھا۔وہ تین بڑی چنڈال پکی پیٹھی صورتیں تھیں۔عُمریں تو کچھ خاص نہ تھیں پر جانے اللہ ماریوں کے چہروں پر ٹپکتی رعونت کی کہاں سے اتنی بہتات برس رہی تھی۔آنکھ میں چھلکتا جلال کمبختیں گھور کر جسے دیکھیں اُس کا کلیجہ پھڑک کر لمحوں میں باہر آجائے۔

چیکنگ بڑی سخت تھی ۔ماڑی قسمت بیگ کے اندر کیمرہ تھا۔بیگ چیک ہوا۔حکم حاکم تھا کہ جاؤ اور اسے امانت والے سیل میں رکھواؤ۔

''کیا وہاں جاؤں ۔''اپنے آپ سے پُوچھا۔پھر فوراً خود سے کہا۔

''اللہ میرا اتنا قیمتی کیمرہ ۔مُلک شام اسمیں قید کر کے لائی ہوں ۔''

لوٹ مار کے منظر پہلے دن مروان کے کمپیوٹر پر تفصیلی دیکھے تھے۔گو اب صورت وہ تو نہ تھی مگر خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو۔ہوٹل کونسا دُور ہے۔بھاگ کر جاتی ہوں۔

سوگئی اور آئی۔ پھر بھوں کیطرح سرکتی لائن میں لگی۔جب باری آئی۔پرس اُس کے ہاتھوں میں گیا۔

''ہائے وے میریا ربا''جی چاہا سر پیٹ لوں۔کمبخت نے کیمرے کا چارجر اُسمیں سے نکال کر ہوا میں یوں لہرایا جیسے کوئی کوبرا سانپ جان بوجھ کر پرس میں رکھا گیا ہے جس نے اُس قلوپطرہ کو فوراً ڈس لینا ہے۔اُس کے چہرے پر بکھرے تاثرات اور دوسری نگرانوں کو دیکھتے ہوئے عربی میں کی جانے والی بکواس سُن کر میرا جی چاہا تھا پرس اُٹھا کر اُس کے سر پر ماروں اور بھاگ جاؤں۔

خود کو بھی پھٹکارا۔''تیزیاں۔ہائے نی تیریاں تیزیاں۔دروازے پر تیرے انتظار میں کوئی رانجھا کھڑا تھا نا جسے جا کر تُو نے چُچھی ڈالنی تھی۔

اُس نے چارجر کو رول کرتے ہوئے کہا۔''امانتاً۔''

اب پھر واپس جانے اور دوبارہ لائن میں لگنے اور جُوں کی طرح رینگنے کا یارانہ تھا۔چُپ چپاتے آگے بڑھ گئی تھی پر دل تو جیسے چارجر میں ہی چھوڑ آئی تھی کہ اگر کہیں ادھراُدھر ہو گیا تب کروں گی کیا؟ تصویروں کا تو خانہ خراب ہو گیا نا۔قہر درویش بر جان درویش ہی تھا نا۔اور کچھ ہو نہیں سکتا تھا۔

''چل دفع دور کر۔گولی مار۔کتنا سیاپا اور کرنا ہے۔''

متوجہ ہوئی کہ اسلامی فن تعمیر کا خوبصورت اور نادر نمونہ میرے سامنے تھا۔بڑے محرابی دروازے سے اندر صحن کی کشادگی صبح سویرے ہی عقیدت مندوں سے بھر گئی تھی۔روضہ مبارک والا حصّہ اپنی محرابی دیواروں سے قوسی چھت تک لشکارے مارتا تھا۔ نقاشی میں نیلا رنگ غالب تھا۔شیشہ گری کا کمال انتہائے عروج پر تھا۔درمیانی گنبد کی نقاشی دل پذیر رنگوں سے آنکھوں کے ساتھ ساتھ دل کو بھی چھوتی تھی۔عمارت کے تین حصّے محرابی ڈھانچے پر کھڑے تھے۔چوتھے حصّے میں چوبی گیلری تھی۔فانوس اپنے حجم اور ساخت دونوں کے اعتبار سے حیران کرتے تھے۔

چاندی کی جالیوں سے آنکھ لگائی۔امام آرام فرماتے ہیں۔ہری روشنی اور لوگوں کی آہ و بکا نے عجیب ساسحر باندھ رکھا تھا۔کہیں تلاوت ہو رہی تھی۔کہیں نفل پڑھے جارہے تھے۔کہیں ہاتھ دعاؤں کیلئے اُٹھے تھے۔کہیں آنکھیں گریہ میں کُتی تھیں۔محبتوں اور عقیدتوں کی ایک دنیا اپنے رنگ میں موجود تھی۔عقیدت مندوں کی تمناؤں کی تکمیل کے اظہاریئے کپڑوں کی لیروں اور تالوں کی صورت بندھے ہوئے تھے۔

سری لنکا کا مقدس مقام سری پاڈا یاد آیا تھا۔ایسے ہی رنگین کترنیں وہاں بھی لہراتی تھیں۔انسانوں کے عقیدوں کی مشترکہ نشانیاں۔میں بھی اُس چوٹی پر اپنے بچوں کی سلامتی کیلئے تالی باندھ کر آئی تھی۔

ساتھ میں لیٹی دوسری بڑی ہستی حضرت امام محمد تقی الجواد کی ہے ۔اپنے دادا کے پہلو میں لیٹی ہوئی ۔بڑی متقی، صاحب علم وصاحب کردار ہستی ۔ہارون الرشید نے اُنکے تقویٰ اورعلم سے متاثر ہوکر اپنی بیٹی اُنکے عقد میں دی ۔پاؤں کی سمت کھڑی ہوئی ۔خدا کی پسندیدہ ہستیاں ۔ظلم و جبر کے خلاف ڈٹ جانے والے لوگ، نہ دُنیاوی آسائشوں کی تمنا، نہ صلوں کی پرواہ، نہ جاہ وحشمت کی آرزو، خدا اوراُس کی رضا کے طلب گار۔

فاتحہ پڑھی ۔نفل پڑھے ۔اللہ سے ایمان کی سلامتی مانگی ۔خدا کی پسندیدہ ہستیوں کے روضہ مبارک کی زیارت اوراِس مقدس سرزمین پر لانے کا شکر یہ ادا کیا ۔اپنے اُن تمام پیارے لوگوں کی تمناؤں کی بارآوری کیلئے خدا سے دعا گو ہوئی ۔

فرش پر دُور تک بچھے خوبصورت اور دبیز قالین پھولوں کی مانند نظر آتے تھے ۔میں ٹانگیں پسار کراُن پر بیٹھ گئی ۔کہنے کو ابھی صُبح تھی ۔سورج تو گھر سے نکل کر اپنی گلی میں ہی آیا ہوگا مگر گرمی کو جوانی چڑھ گئی تھی ۔گرمی کے ساتھ کربلا تھی ہوگیا تو آل علی پرظلم وستم کی کہانیاں یاد آئیں ۔پھر جن کے دروازے پر بیٹھی تھی ان پر ہونے والی سختیوں اورزیادتیوں پر بین ڈالتے تاریخ کے صفحات سامنے آگئے ۔

ایک تو اللہ مارے ہر عہد کے حاکموں کے حالی موالی حسد وبغض کی پنڈیں ۔شاہ سے زیادہ شاہ کی خیر خواہی کے دعوے دار ۔اوپر سے حکمران کچے کانوں اورتاج وتخت کے بھوکے ۔ہر لمحے سلطنت چھن جانے کے عذاب میں گرفتار ۔کسی نے ہارون الرشید کے کان میں پھونک ماری ۔

''خلیفہ ابن خلیفہ عالی مقام کچھ ہوش کیجیے کہ امام کاظم کے معتقد اپنے مال و اسباب کا پانچواں حصہ ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں ۔آپ کی بجائے انہیں اپنا امام اور خلیفہ سمجھتے ہیں ۔بس کوئی دن جاتا ہے وہ سلطنت عباسیہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے ۔

احتیاط لازم اور تدارک لازمی ۔سرکش کا سر سرکشی کے اظہار سے پہلے کُچل دینا ضروری ۔''

ہارون الرشید تو پہلے ہی علویوں سے جلا بھُنا بیٹھا تھا ۔غصہ چڑھا ۔بدظنی بڑھی ۔ مدینہ پہنچ کر پہلا کام ہی امام کی گرفتاری تھی ۔پھر بغداد لا کر سندی بن شاہک کی تحویل میں دے دیا اور ساتھ ہی حکم صادر کر دیا ۔

''دماغ میں خلافت کا کیڑا کُلبلا رہا ہے ۔بس ٹھکانے لگانا ہے ۔''

موت کے بارے میں دو روایتیں ہیں ۔سندی بن شاہک نے قتل کر دیا ۔یا زہر دے دیا ۔کون سی درست ہے؟ تاریخ خاموش ہے ۔

اللہ کے نیک بندوں کا انجام ۔

خدا ان کی پارسائی اور استقامت کو قبول فرمائے ۔

سُنیوں اور شیعوں کے ازلی جھگڑوں نے ان بیچارے معصوم مقبروں کے ساتھ بھی بربریت اور سکھا شاہی کی عجیب و غریب اور انسانیت سوز تاریخ منسلک کر دی ہے ۔

مسلک کے اعتبار سے مقبروں کی سجاوٹ اور ان پر نذر و نیاز کے چڑھاوے شیعوں کے عقیدے کا لازمی جز ہے ۔یہ اکثر سُنیوں کی لوٹ مار کے ہتھے چڑھتے ۔

ویسے یہ سُنی لوٹ مار میں کتنے تگڑے ہیں؟ مجھے اپنا چترال جانا یاد آیا تھا ۔جہاں بریر اور بمبوریت کی وادیوں کے کیلاشیوں نے مجھے بتایا کہ اُن کی ہمسایہ وادی آیون کے سُنی اُنکے قبرستانوں سے ان کی قیمتی چیزیں راتوں کو لوٹ کر جاتے ہیں جو وہ اپنے عقیدے کے مطابق اپنے مردوں کے ساتھ دفن کرتے ہیں ۔

443ھ 1051ء کا فساد بڑا تباہ کن تھا ۔بات تو چھوٹی سی تھی کرخ کے دروازے پر شیعہ لوگ حضرت علی کی ثنا میں مدح کندہ کروانے کے متمنی تھے ۔سُنیوں کی ضد کہ اِس سے تو شرک کی بو آتی ہے ۔بس جھگڑا ہو گیا ۔لڑائی اور قتل و غارت اِس پائے کی ہوئی

کہ مدح لکھوانے والے اور وحدانیت کے علمبردار بھی نیزوں پر چڑھ گئے۔بہترین ساگوان کے ستون و گنبد جل گئے۔

مقبروں میں لگا نایاب پتھر اور چڑھاوے کا سونا چاندی بھی لٹ لٹا گیا۔آگ اتنی زیادہ پھیلی اور تباہی کا کچھ یہ عالم ہوا کہ خاندان بو یہ کے قبرستان کے ساتھ خاندان قریش کی قبریں بھی متاثر ہو ہیں۔

''پروردگار مسلمانوں میں یہ برداشت اور رواداری کب پیدا ہوگی؟عقیدوں کا احترام کرنا وہ کب سیکھیں گے؟صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی تعصب اور تکبر کا وہی عالم ہے۔کشت و خون کی ندیاں بہتی ہیں اور مسلمان کا گلا مسلمان کاٹتا ہے۔خود سے کڑھتی اُلجھتی دعائیں مانگتی کھڑی ہوئی۔

آسمان کو دیکھا۔دھوپ تھوڑی سی نیچے اُتری تھی۔ربّ کائنات کے حضور پھر سجدہ ریز ہوئی۔اُٹھی۔آنکھوں میں آنسو تھے۔ہونٹوں پر سوال تھا۔کب؟کب؟میرے مولا یہ مسلمان تعصبات کے حجروں سے نکلیں گے۔کب اُنہیں عروج نصیب ہوگا؟

باہر آئی۔جُوتے لیے۔چیکنگ ایریا میں چادر لینے گئی تو ہکا بکا رہ گئی۔وہاں تو بساط ہی اُلٹی ہوئی پڑی تھی۔سارے نئے چہرے۔بس اسی ہونی کا ڈر تھا مجھے۔اب احمقوں کی طرح دیدے پھاڑ پھاڑ دیکھتی ہوں کہ کوئی شناسا چہرہ نظر آجائے۔

قسمت اچھی تھی میری۔جس نے لیا تھا وہ کونے میں کھڑی تھی۔وہ بھی ڈیوٹی ختم کرکے شاید باہر نکل رہی تھی۔نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔مار دھاڑ کرتی آگے بڑھی۔اُس کی طرف لپکی۔کیسی ظالم تھی؟چہرے پر انجان پنے اور کچھ یاد نہیں جیسے اثرات کے اتنے رنگ تھے کہ میں تو ساری جان سے لرز گئی۔

میرے چہرے پر ناچتی مسکینی دیکھ کر شاید پسیج سی گئی۔اب پاس پڑے بڑے سے

ڈرم کی طرف اشارہ ہوا۔میں دل میں گالیاں نکالتی ڈرم کی جانب لپکی جہاں کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔تیزی سے ہاتھ مارنے شروع کر دیئے۔

''میرے اللہ'' جی چاہا تھا اپنا سر پیٹ لوں۔کمبخت ماری نے میرا جانِ جگر یہاں پھینک دیا تھا۔

دفعتاً میز کے کونے پر دھرا نظر آ گیا۔لمبی سانس کھینچ کر میں نے اوپر والے کا شکریہ ادا کیا۔

لپ سٹک بھی یہیں پڑی تھی۔اُسے بھی اُٹھایا اور شکر شکر کرتی باہر سڑک پر آ گئی۔

باب نمبر:7

1۔ مدرسہ مستنصریہ ایک عظیم اور قدیم درسگاہ صدیوں کا اثاثہ سنبھالے اُس عہد کو خراج پیش کرتا تھا جو کبھی تہذیب وثقافت کا دنیا بھر میں مرکز تھا۔
2۔ عراق کی جون آف آرک منال الشیخ کی بے باک شاعری سُننا بڑا پر لطف تجربہ تھا۔
3۔ مستنصریہ یونیورسٹی علمی درسگاہ سے زیادہ سیاسی داؤ پیچوں میں اُلجھی ہوئی ہے۔
4۔ عباسی پیلس بھی بغدادی چہرے کا ایک دلکش نقش ہے۔

مستنصریہ میں داخل ہونا گویا ایک عہد میں داخل ہونا تھا۔ عباسی خلفاء نے محل مینارے بنائے۔ تجارتی منڈیوں اور مرکزوں پر توجہ دی۔ فصیلوں کو کھڑا کیا۔ نظم ونسق کو مضبوط اور امن و امان کی صورت بہتر بنائی۔ ہسپتال تعمیر ہوئے۔ لائبریریاں بنائیں۔ دُنیا بھر کی اہم زبانوں سے تراجم کے سلسلے شروع ہوئے مگر درسگاہوں پر توجہ نہ دی۔ یہ اعزاز مستنصر کو ملا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی افلاق نے مجھے پروگرام بتایا جس میں سرفہرست مدرسہ مستنصریہ، عباسی پیلس، مستنصریہ یونیورسٹی تھے۔ میں نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''افلاق مجھے آرمینین چرچ دیکھنا ہے جس کے پاس ہی قبرستان میں وہ جرٹروڈ بیل دفن ہے۔'' افلاق کھلکھلا کر ہنسا۔

''آپ تو لگتا ہے اُس پر عاشق ہوگئی ہیں۔''

''ارے نہیں۔ یوں ایک دلچسپ تاریخی کردار تو ہے نا۔ اُس کے بارے میں اتنا کچھ بتا کر تم نے اور مروان نے مجھے مشتاق کر دیا ہے۔''

سچ تو یہ تھا کہ مجھے تو تصویر کشی کا جنوں بھی نچلا بیٹھنے نہیں دے رہا تھا کہ عراق کی بانی خاتون کی قبر پر اپنی تصویر بنواؤں گی۔

''آپ ڈیڑھ گھنٹہ لے لیجیے۔ چرچ دیکھ لیں۔قبرستان کا چکر لگا لیں۔مدین Midan Square سے گاڑی کو داہیں ہاتھ پر موڑتے ہوئے افلاق مجھ سے مخاطب تھا۔

''رشید سٹریٹ بغداد کی خوبصورت شاہراہوں میں سے ایک اہم شاہراہ ہے۔ دجلہ کے ساتھ ساتھ چلتی عالیشان ہوٹلوں اور شاپنگ پلازوں سے سجی گاڑیوں سے لبالب بھری۔

چرچ کی شاندار عمارت کا بڑا حصّہ سفید اور دیگر حصّے زردی رنگے تھے۔مٹیالے سے آسمان کے نیچے سنہری دھوپ میں خوش رنگ پھولوں اور سبزے میں گھرا چرچ بہت خوبصورت نظر آتا تھا۔

سر پر تنی چھتری کو نیچے کرتے اور چھاؤں میں چلتے ہوئے میں نے تصویر کیلئے جگہ کا انتخاب کیا اور کیمرہ پاس سے گزرتے دولڑکوں کو تھما دیا۔

اندر تھوڑا سا گھومی پھری۔ یہ بغداد کا قدیم ترین چرچ تھا تو بھئی بہت شاندار تھا۔ بروشر جو حاصل کیا اُس کے سرسری سے مطالعے نے بتایا کہ یہ پہلے نستورین لوگوں کا تھا۔

''یہ نستوری کون ہیں؟ بروشر میں تو کچھ نہیں تھا۔نام کی حد تک اور تھوڑی سی یہ

جانکاری مجھے ضرور تھی کہ یہ عیسائیوں کا ہی ایک فرقہ ہے مگر تفصیلی آگاہی نہیں تھی۔چلو افلاق سے پوچھوں گی۔''

اب قبرستان اور جبرٹروڈ کی قبر کی طرف نکلی۔

''خدایا سورج تھا کہ جیسے سوا نیزے پر آیا ہوا تھا۔دہل کر واپس بھاگی۔گولی ماری قبرستان اور قبر کو۔بھاڑ میں جائیں تصویریں۔کہیں اپنی قبر نہ بن جائے بغداد میں۔درخت کے نیچے کھڑی ہوئی۔لوگوں کے پُرے تھے جو موسم کی شدت سے بے نیاز چرچ کے راستوں پر آگ برساتی دھوپ میں چلتے پھرتے تھے۔

اور جب گیٹ سے باہر نکلی تو خدا کی کس قدر ممنون ہوئی کہ افلاق کی گاڑی دھوپ میں کھڑی سڑتی تھی۔اتنی خوبصورت سڑک پر افسوس کوئی درخت نہیں تھا۔

گاڑی میں بیٹھی کچھ سکون میں آئی تو پوچھا ''یہ نستوری کون ہوتے ہیں؟''

افلاق کو پیشہ ورانہ گائیڈوں کی طرح جھوٹی اور بے تکی کہانیاں گھڑنے کا ذرا شوق نہیں تھا۔اُس نے آنکھیں پٹپٹاتے کچھ سوچنے کا تاثر دیتے ہوئے بالآخر اتنا کہا۔

''شاید مسیح کی بطور خدا اور انسان کی حیثیت کے تعین کا ہیر پھیر ہے۔بہر حال اس کا پتہ کرتے ہیں۔اچھا ہے میں بھی کلیر ہو جاؤں گا۔

''آج درجہ حرارت 58 پر پہنچا ہوا ہے۔مگر مستنصریہ کے کمرے ٹھنڈے اور ہوا دار ہیں۔سہ پہر کو وہاں چلیں گے۔'' دھوپ کی جوانی اور سرکشی آنکھیں چُندھیائے دیتی تھی۔

یہاں دو گھنٹے آرام کیجیے۔سوق الغزل کی ایک مسجد کے سامنے اُتارتے ہوئے افلاق نے کہا تھا۔

مجھے خلیل جبیر سے ملنا ہے۔وہ بغداد کی ماڈرن یونیورسٹی جو مستنصریہ ہی کے نام پر ہے کے انجینئرنگ کالج میں اُستاد ہے۔ذرا بات کر آؤں کہ آپ کو یونیورسٹی دکھانے کی

کوئی صورت نکل سکتی ہے۔ آج کل گرمائی تعطیلات کی وجہ سے وہ بند ہے اور کچھ معلومات بھی ہو جائیں۔

ہاں کوئی چیز چاہیے تو بتایئے آپ کو لا دوں۔''

میں انکار کرتے ہوئے مسجد میں داخل ہوگئی۔ آج صبح دن بھر کا سامان ساتھ لے کر چلی تھی۔ سچی بات ہے جب سے گھر سے نکلی تھی کھانے پینے کا کوئی ڈھنگ کا سلسلہ ہی نہیں تھا۔ صبح ناشتے کی کسمپرسی پر تو اپنے آپ پر رحم آنے والی بات۔ کیا کھانا ہے؟ خود ہی سوچو۔ خود ہی بھاگتے پھرو۔ چائے پینی ہے تو برتن بھانڈے دھوؤ اور چولہوں چونکوں میں سر کو گھساتے پھرو۔ نذر حسین نیاز حسین کے نام پر اگر دوپہر یا رات کو کچھ تقسیم ہوا تو نسرین نے میری چھنی کٹوری میں لے کر سنبھال لیا۔ رات کو مجھے بتا دیا جی چاہا تو کچھ منہ ماری کر لی وگرنہ اللہ بیلی۔ شام میں چودہ دن یہی سلسلہ چلا اور اب عراق میں بھی وہی کچھ ہو رہا تھا۔ افلاق کے ساتھ تو ابھی آغاز ہی ہوا تھا۔

ہمہ وقت تو بس ایک چنتا ساتھ چلتی تھی کہ ڈی ہائیڈریشن نہ ہو۔ صبح ناشتے میں تربوز پھاڑنا ہے چاہے جی نہ چاہے کھانا ضروری۔ گرمی کو ٹھنڈ سے مارنے کی اپنی سی کوشش۔ رات کو بند گلاس میں تخم ملنگا اور قتیرہ گوند بھگونا سانس سے زندگی ہے جیسی سوچ کی طرح اہم۔ پانی دودھ کی بوتلیں وافر مقدار میں خریدتے چلے جانا بھی ضرورت۔

خواتین کے حصے میں داخل ہوتے ہی میں نے اپنے پرانے کام کیے۔

پیٹ بھرنے سے کہیں زیادہ یہ تسکین تھی کہ یہ نسخہ بہت کارگر رہا ہے۔

کروٹ کے بل لیٹ گئی۔ ہاتھوں کا سینے کے گرد ہالہ بنا لیا کہ بغداد کے چوروں کی چاروں کھونٹ دھومیں ہیں۔ فلموں نے بھی شہرت کو چار چاند لگا رکھے ہیں۔

ظہر کی نماز بغیر وضو کے پڑھی۔ ہمت ہی نہیں ہوئی کھولتے پانی میں ہاتھ ڈالنے

کی ۔اب اِسے نماز کہہ لو یا اُس اُوپر والے کو یونہی پرچانے کی کوشش ۔

عصر کے سجدے بھی بس ایسے ہی تھے ۔

خلیل جبیر افلاق سے عمر میں تو کہہ نہیں سکتی پر تن وتوش میں ضرور بھاری تھا۔

ذاتی تعارف کے مراحل سے گزرے تو مستنصریہ مدرسہ کا تعارف شروع ہوگیا ۔

مستنصریہ رصافہ Rusafa کے علاقے میں ہے شُہدا برج کے پاس ہی ۔

گاڑی پارک ہوئی ۔کشادہ راستے پر چلتے ہوئے میں اُس انتہائی بلندو بالا محرابی دروازے کے سامنے جا کھڑی ہوئی جس کی پورپور تعمیری بناوٹ کی گُھتی ہوئی ڈیزائن داری کے ساتھ ساتھ نقاشی اور قرآنی آیات سے سجی ہوئی تھی ۔بیرونی کرسی اونچی تھی ۔سیڑھیاں اترتے ہوئے میں رکتی تھی ۔گردن پشت پر پھینکتے ہوئے اوپر دیکھتی تھی اور اس کی پروقار ڈیزائن کاری کو سراہتی تھی ۔

مرکزی گزرگاہ ایک وسیع وعریض صحن میں لے آئی تھی جہاں پودوں کی جابجا کیاریاں تھیں ۔کھجور کے درخت تھے ۔بائیں ہاتھ عمارات کا لمبا چوڑا سلسلہ تھا جس کا مستطیل صورت میں چاروں طرف گھیراؤ تھا ۔اندرونی ڈیوڑھی میں بورڈ پر تفصیلات درج تھیں ۔جنہیں میں نے پڑھنا وقت ضائع کرنا سمجھا کہ افلاق میرے ساتھ تھااور میری سمجھ بوجھ نے اُسے مستند جانا تھا ۔اِس تپتی سہ پہر میں اِکّا دُکّا انسان ہی نظر آئے تھے ۔ماحول سنجیدگی کی ایک گھمبیرتا کے تاثر میں تھا ۔

جبیر زوروشور سے بولے چلے جارہا تھا ۔میں چُپ چاپ سُنتی تھی ۔پتہ نہیں کیوں اس وقت میرا جی چاہا کہ کوئی مجھ سے بات نہ کرے ۔مجھے تاریخ نہ پڑھائے ۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا ۔بندہ تنہائی اور یکسوئی چاہتا ہے ۔جگہوں اور کرداروں سے باتیں کرنے کا متمنّی ہوتا ہے ۔چیزوں کو اپنی نظر ،اپنے انداز اور زاویے سے دیکھنے کا

خواہش مند ہوتا ہے ۔جہاں چاہے بیٹھنے اور ماضی میں گُم ہونے کی آرزو کرتا ہے ۔پر مجبوری تھی ۔دو بندے ساتھ تھے اور دونوں ہی معلومات کی بارش میں مجھے بھگوئے جارہے تھے۔

سچی بات ہے میں ایک ٹرانس میں تھی۔مرکزی دروازے سے دروازہ در دروازہ کی سحر انگیزی سے لُطف اُٹھاتی، آنکھیں پھاڑتی، ان پر کی گئی نقاشی اور اس کے طغرائی کام جس کی صورت گری جیومیٹری کی شکلوں کے سنگ سنگ پتے پھولوں سے سجی عباسیوں اور اُمویوں کے طرزِ تعمیر کے بنیادی تصورات کی آمیزش کی دل کش انداز میں نمائش کرتی تھیں۔

میں پہلے ایوان سے پہلے صحن میں داخل ہو کر ساکت کھڑی اپنے سامنے زردی مائل مٹی رنگ کی اینٹوں سے بنی دو منزلہ عمارت کی بالکونیوں، اُن پر کندہ بھاری پٹیوں کو دیکھتی تھی ۔دُنیا کا عظیم ترین ،قدیم ترین صدیوں کا اثاثہ سنبھالے میلوں کے رقبے میں پھیلی یہ تعلیمی درسگاہ اپنی عظمتوں کے ساتھ اُس عہد کو خراج پیش کررہی تھی جو کبھی تہذیب وثقافت کا دُنیا بھر میں مرکز تھا۔جہاں پڑھنے کیلئے پوری اسلامی دُنیا سے طلبہ آتے اور ریاضی، ادب، طِب، فلسفہ، انجینئرنگ، قانون اور قرآن کی تعلیم حاصل کرتے ۔یہی وہ جگہ تھی جہاں سُنی مسلک کے چاروں عقائد حنبلی، شافعی، مالکی اور حنفی کیلئے الگ الگ ڈپارٹمنٹ تھے۔

اب وسیع وعریض تا حدِ نظر پھیلی عمارت کا مستطیل صحن سامنے تھا۔حُسنِ تعمیر سے لدی پھندی غلام گردشیں، اُوپر تنا آسمان تاریخ کھولے کھڑے تھے۔وہ سُناتے تھے اور میں سُنتی تھی۔

تعمیر کا سال 526ھ یا 1226 کہہ لیجیے۔بننے میں کوئی چھ سال لگے۔ بنانے والے کا ذوق کہ دجلہ کو ہمسایہ بنایا۔

کشادہ کمرے طلبہ کے کلاس روم تھے۔انکی اقامت گاہیں تھیں ۔انکے لیکچر ہال

تھے۔عمارت میں قرآن کریم کی تعلیم کے لئے اگر خصوصی حصہ تھا تو وہیں ان کی تربیت سازی کے لئے بھی الگ عمارت تھی۔کاغذ، قلم، روشنائی کی فراہمی مدرسے کی ذمہ داری۔ہوسٹل میں طلبہ کو کھانے پینے سے لے کر میڈیکل تک کی سہولت بھی حاصل تھی۔

شاہی کُتب خانے سے 160 اونٹوں پر لاد کر کتابیں یہاں لائی گئی تھیں۔انہیں اِس انداز میں ترتیب دیا گیا تھا کہ طلبہ آسانی سے جو کتاب نکالنا چاہتے نکال لیتے۔خیال کیا جاتا ہے کہ اُس کی لائبریری میں اسّی ہزار کتابیں تھیں۔یہ کتابیں بھی اگر دجلہ کے پانیوں میں گر جاتیں تو پھر پانیوں کا رنگ اور سیاہ ہو جاتا۔پتہ نہیں مدرسہ کیسے ہلاکو خان کے ہاتھوں سے بچ گیا؟

اب سچی بات یہی ہے کہ یہ سب تاریخ کے المیے ہی تو ہیں۔مستنصر کو علم سے محبت تھی جس کا اظہار مستنصر کے ہر انداز سے تھا کہ مدرسے میں ایک بار ہر صورت اس کی حاضری لازمی ہوتی۔

سینئر اُستاد سیاہ عبایا پہنتا۔سر پر عمامہ ضروری۔چوبی اونچی چوکی پر تمکنت سے بیٹھ کر درس دیتا۔داہیں باہیں دو معاون اساتذہ کا موجود ہونا ضروری، تفصیلی لیکچر، بحث مباحثہ، سوالات کے جوابات۔ذرا آج کے جدید تعلیمی انداز اور طریق سے مقابلہ کرلیں۔ ماڈرن تعلیم کے انداز گاؤن، ہڈ، روسٹرم، لیکچر، بحث مباحثہ اور سوال جواب۔

اس کے تینوں ایوان تینوں صحنوں میں کُھلتے ہیں اور مَیں پہلے میں کھڑی تھی اور چاہتی تھی کہ ٹپوسی مار کر اُس رُخ پر چلی جاؤں جہاں سے دجلہ کا نظارہ کرسکوں۔

خلیل جبیر نے درمیانے وقت کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔

پندرھویں صدی کے بعد عمارت بہت نظر انداز ہوئی۔کبھی اسپتال بنے کبھی سرائے اور کبھی فوجیوں کی بیرکیں حتیٰ کہ 1945ء میں نوادرات کے عراقی ڈائریکٹر نے اِس

تاریخی ورثے کو محفوظ کرنے کیلئے با قاعدہ مہم کا آغاز کیا۔

بہت سے لوگوں، بہت سے مُلکوں کے تاریخی و ثقافتی مراکز نے اِس پر توجہ دی۔عراق تو مجھے بہت اچھے لگے۔صدیوں پُرانے اِس ورثے کو تباہ ہوتے دیکھ کر دُہائی تو مچائی۔ہم لوگ تو سچی بات ہے بےحس اور خودغرضیوں کے مارے ہوئے ہیں۔جہانگیر کے مقبرے کا کارونا روؤں، شاہی قلعے پر آہ وزاری کروں۔ملکہ نور جہاں کے مقبرے کا سیاپا کروں۔کہیں گتے کو مُتے پھرتے ہیں۔شاہی قلعے کی بیرونی عقبی دیواروں کو کنجریوں کی پاتھیوں نے ہار پہنا رکھے ہیں اور نور جہاں کا مقبرہ، لوگوں کے جھونپڑوں نے چہار جانب سے گھیر لیا ہے۔

بالکونیوں سے دجلہ کو دیکھنا بہت مزے کا کام تھا۔ پختہ کناروں سے نیچے نرسلوں کی لمبی قطاریں تھیں جو پانیوں میں تمکنت سے سر اُٹھائے کھڑے تھے۔دریا کے پار سے ال وزیر مسجد کے گنبد اور مینا نظر آتے تھے۔مجھے سچی بات ہے شیش محل کے جھروکے یاد آئے تھے۔ساتھ اپنا بچپن بھی یاد آیا تھا جب تاریخ میں عباسی خلفاء کو گھوٹے لگتے تھے۔مستنصر باﷲ تو کبھی نہیں بھولتا تھا کہ اس کے نام کا اختتام ہی ایسا تھا کہ گرمیوں اور سردیوں میں آدھی رات آگے اور آدھی پیچھے ہماری چھت پر موٹے تازے باگڑ بلّے اپنی خوفناک غرّاتی آوازوں سے وہ سماں باندھتے کہ میدان جنگ آنکھوں کے سامنے آجاتا اور ساتھ ہی مستنصر باﷲ بھی۔

مستنصر انداز جہانبانی میں بھی کم نہ تھا۔ بیٹے کی تربیت میں کہاں جھول رہا؟ سپہ گری میں کیوں نہ طاق کر سکا کہ جب مسند پر بیٹھے ہلاکو خان کے سامنے پیش ہوا اُس نے نفرت سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

’’تمہارے اجداد تو بڑے بہادر اور جیالے تھے۔بادشاہ بن گئے تھے پر بڑے

دلیر سپاہی تھے۔مفتوحہ علاقوں میں مرے اور وہیں دفن ہیں۔

''تم''

اُس نے طنزاً ہنستے ہوئے بلند و بالا بھاری بھرکم دھاتی دروازوں اور اُن پر کی گئی مینا کاریوں کو دیکھا۔

''دروازوں کو یہ سب پہنا دیا ہے۔اِس سے تیر و تفنگ بناتے اور میرا مقابلہ کرتے۔''

جواباً مستعصم بولا تھا۔

''بس خدا کو ایسے ہی منظور تھا۔''

''تو اب جو سلوک تم سے ہونے والا ہے اسکی منظوری بھی خدا نے دی ہے۔

قالین میں لپیٹ کر ٹھڈے مارے گئے اور ہڈی پسلیوں کا قیمہ بن گیا۔

عروج وزوال کے المیوں پر سوچتی اور موجودہ صورت پر کڑھتی رہی۔

مستنصریہ کی ایک اور وجہ شہرت اسکا وہ Al-qishla clock tower ہے۔جو فلکیاتی حساب سے گھنٹوں کا اعلان کرتا ہے۔سُورج اور چاند کی پوزیشن کے بارے میں بتاتا۔یہ علی بن تغلب کا کارنامہ تھا۔

ساتھ ہی ال آصفہ Al-Asefia مسجد تھی۔کیا شاندار سی مسجد تھی۔نقاشی سے لبالب بھرے نیلے گنبد والی۔کھڑکیوں سے دجلے کے نظارے لوٹے اور پار الوزیر مسجد کا دیدار کیا۔

عباسی پیلس کو دیکھنا بھی ایک خوبصورت اور دل کو چُھو لینے والا تجربہ تھا۔ دریائے دجلہ کے کنارے،اس کی بالکونی سے دجلہ کو دیکھتے ہوئے میں نے بے اختیار سوچا تھا بادشاہ چاہے ماضی بعید کے ہوں یا ماضی قریب کے پانیوں کے قریب گھر بنانا کیوں

پسند کرتے ہیں؟ مجھے باسفورس کے کنارے استنبول کا دولما باشی یاد آیا تھا۔ دریائے ینوا کے ساحلوں پر زاروں کا ونٹر پیلس یادوں میں ابھرا تھا۔

شاید پانیوں میں حرم کی باغی سرکش عورتوں کو دھکے دینا آسان ہوتا ہے۔ میرے اندر سے ایک جواب یہ بھی تھا۔

1179اور1225 کے درمیانی وقت میں خلیفہ ال ناصرلدناللہ Al.Naseer Lidinillah نے اِسے بنایا۔ عمارت کے بہت سے حصّے State Establishment of Antiquities and heritage نے اُسی پیٹرن پر دوبارہ بنائے ہیں۔ مرکزی صحن اور دومنزلہ عمارت جس کی بالکونیوں محرابی جھروکوں اور ان کی اندرونی پیشانیوں پر گھتا ہوا کام آپ کو بے اختیار روکتا تھا۔ اور طرز تعمیر کی خوبصورتی آپ کو فوراً جکڑ لیتی ہے۔ مستنصریہ سے اس کی کافی مشابہت ہے۔ اینٹ کے چوکور ستونوں پر جو محرابیں مبنی تھیں وہ کس کمال کی تھیں۔ نیم قوسی صورت کی یہ تہہ درتہہ ڈیزائن داری کے ساتھ فنِ تعمیر کا وہ نادر نمونہ کہ بقول خلیل جبیر یہ سلجوقی سٹائل ہے۔ تو کمال کا ہے۔ میں باربار انہیں دیکھتی تھی۔ جیسے ایک کے بعد ایک پردے کی تہیں کھلتی جائیں۔ کہیں اس کے انداز دورِ جدید کے پردوں کو اطراف سے باندھنے سے پیدا شدہ تصویر کے سے لگے۔

اس گھتی ہوئی تعمیری کندہ کاری میں کہیں ستارے، کہیں جیومیٹریکل ڈیزائن نظر آتے تھے۔ صحن میں تالاب اور فرش پر دانہ دنکا چگنے میں مصروف کبوتر۔ بڑا دلکش منظر تھا۔

عمارت کے جس حصے نے مجھے حیران کیا تھا وہ اُس کا پرانا کولنگ سسٹم تھا۔ انتہائی موٹی فصیلوں جیسی اینٹوں والی دیواروں میں دائیں بائیں محرابی شکل کے دریچے نما شگاف جو ہواؤں کو کھینچ کر اندر لاتے تھے۔

عباسی محل اور مستنصریہ کو دیکھنے کی میری یہ کاوش اُس نائی جیسی ہی تھی جو بھری پُری دیگ میں سے چند دانے ہی چکھ کر شاندار ہے کا سگنل دیتا تھا۔ میں باہر آ گئی پیلس کے سامنے وسیع و عریض میدان میں دونوں لڑکوں کے درمیان اب یہ بحث چھڑ گئی کہ شام کا وقت نامعلوم شہدا کی نئی یادگار کو دیکھنے کیلئے زیادہ موزوں ہے۔افلاق کا خیال تھا کہ وقت تھوڑا ہے۔اُس کے کیلئے زیادہ وقت چاہیے۔

''جبیر اس وقت تو میں یونیورسٹی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کو ترجیح دوں گی۔کافی تھک گئی ہوں۔چلو وقت ملا تو پھر اندر بھی چلے جائیں گے۔بحث کو میں نے سمیٹ دیا تھا کہ واقعی میں اُس وقت چلنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

''Caliphs مسجد کے عقب میں پالتو جانوروں کی مارکیٹ ہے۔کبوتر ،تیتر ،بٹیر دیکھیے گا کسی وقت'' افلاق نے کہا۔

''میرے بچے مجھے زندگی میں کبھی بھی کتے ،بلیوں ،طوطوں ،میناؤں ،کبوتروں اور بٹیروں سے دلچسپی نہیں رہی۔

افلاق نے گاڑی چرچ کے سامنے سے گزاری اور میں نے جگہ جگہ رکاوٹیں کھڑی کرنے کے باوجود لوگوں کے ہجوم دیکھے کہ فٹ پاتھوں والی دوکانوں کا یہاں بھی زور تھا۔آوازیں تھیں اور شور وغل میں شام کی ڈوبتی ساعتیں بھرپور زندگی کا احساس دیتی تھیں۔

دائیں بائیں آگے پیچھے ہر جانب سڑکیں ایک دوسرے کو کاٹتی تھی۔اطراف میں شاندار اور خوبصورت عمارات کا پھیلاؤ تھا۔جمہوریہ سٹریٹ پر میں نے نشان دہی پر خلیفہ Caliphs مسجد دیکھی۔جی چاہا اس میں دو نفل پڑھ لوں۔مگر حوصلہ نہ ہوا۔بالکل سامنے رومن کیتھولک چرچ کی شاندار عمارت تھی۔

مستنصریہ سکوائر دیکھا۔گاڑی میں بیٹھے بیٹھے تقریباً بارہ فٹ اونچی اُس دیوار کے

گرد چکر لگایا جو یونیورسٹی کے گرد حفاظتی نقطہ نظر کے تحت تعمیر کی گئی ہے۔جدید علوم کے ہر شعبے میں کفیل 24000 طلبہ کی تعلیم کا بار اُٹھائے بغداد کے شمال مشرق میں میلوں پر پھیلی ہوئی ہے۔صدام کے زمانے میں اس کے ڈنڈے کے بَل بوتے پر اطمینان بخش کام کرتی تھی۔پر اب منفی سیاست، مذہبی تعصب اور بیرونی شازشوں میں اس طرح اُلجھی ہوئی ہے کہ جہاں ایک طرف یونیورسٹی کے ذہین دماغوں کو گولیوں کی سان پر چڑھایا جا رہا ہے وہیں سینکڑوں بچے بچیوں کو موت کے گھاٹ اُتارا گیا۔ساڑھے تین سو کے قریب طلبہ یا مارے گئے یا وہ معذور ہوئے۔بہت سی طالبات ریپ ہوئیں۔

پچھلے سال کے خوفناک حادثے کی تفصیلات بڑی دل خراش تھیں۔

بچے بچیاں گھروں کو جانے کیلئے منی بسوں اور پارکنگ ایریا میں پارک کی ہوئی گاڑیوں کی طرف بڑھتے تھے جب مین گیٹ پر آکر کھڑی ہونے والی گاڑی میں بم پھٹا۔دوسرے گیٹ پر خودکش بمبار نے تباہی مچائی۔زیادہ نشانہ طالبات بنیں۔

میرے پوچھنے پر خلیل جبیر نے کہا۔شیعہ سُنی اختلافات تو بہرحال ہیں۔ ماضی میں ایران کے حوالے سے بھی معاملہ ذرا خراب تھا مگر اب تو اسی پر سیاست کا کھیل ہو رہا ہے۔کل سُنیوں کو غلبہ حاصل تھا۔اہم کلیدی پوسٹوں پر وہ راج کرتے تھے۔آج شیعہ پاور میں ہیں۔

یونیورسٹی کے مین گیٹ پر سیاہ جھنڈا جب جی چاہے لہرا دیا جاتا ہے۔یونیورسٹی کے پروفیسروں کی اکثریت بھی مذہبی و سیاسی گروہ بندیوں کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ خوف زدہ اور پریشان بھی ہے۔سٹوڈنٹس لیگ جس کی پُشت پناہی شیعہ عسکری تنظیمیں کرتی ہیں نے بڑی مار دھاڑ مچا رکھی ہے۔پروفیسروں کو قتل کی دھمکیاں دینا معمول ہے۔بہت سے مُلک چھوڑ گئے ہیں۔سُنی باغی گروپ، ہڑتالوں کلاسوں کے بائیکاٹ ،ذہین لوگوں اور

سائنسدانوں کو بچاؤ جیسے نعرے لگاتے اپیلیں کرتے رہتے ہیں۔ ایک رائے ہے کہ نورالمالکی کی غیر جانب داری کچھ اتنی موثر نہیں ہے کہ ان کے مشیروں با تدبیروں کی دلی ہمدردیاں مسٹر مالکی کی شیعہ پارٹی Dawa اور سٹوڈنٹس لیگ کے سرکردہ طلبہ سے ہیں۔

اان حالات میں غیر جانب دار ذہین لوگوں کا کام کرنا کس قدر مشکل ہے۔چُپ چاپ یہ سب سُنتے ہوئے میں اپنے مُلک کی کٹھن گھیریوں میں اُلجھی ہوئی تھی۔

اور جب بغداد کی سڑکیں اور بازار برقی روشنیوں سے جگمگاتے تھے۔میں نے افلاق سے کشری (Kushari) کا پوچھا تھا۔دمشق میں تو یہ کھانا میری کمزوری بن گیا تھا۔ترکیب بھی میں نے جان لی تھی۔

''ارے پسند ہے آپ کو۔تو چلیے کھلاتا ہوں۔وہیں التحریر میں ہی اور اس کے بعد ایک ایسے کیفے میں چلتے ہیں جہاں ہر ہفتے کی شب پرانے اور نئے شاعروں کا کلام ترنم سے پڑھا جاتا ہے۔

''مجھے کیا سمجھ آئے گا۔ظاہر ہے عربی میں ہوگا۔''

''ماحول تو دیکھیں گی۔ترجمہ میں کرتا جاؤں گا۔''

سعد بن ابی وقاص روڈ پر ایک چھوٹے سے قہوہ خانے میں چوبی صوفوں پر دھرے میٹرس کے گدوں پر بیٹھے لوگوں کی محفل عروج پر تھی۔ہم داخل ہوئے اور چپکے سے خالی جگہ پر بیٹھ گئے۔لوگوں نے دیکھا ضرور مگر کسی نے تعجب کا اظہار نہیں کیا۔شاید میں پہناوے کے اعتبار سے عراقی خاتون لگتی تھی۔

کسقدر مترنم آواز تھی۔دھیمی نغمگی سے بوجھل۔افلاق نے جیب سے کاغذ قلم نکالا۔اُس پر حازم ال تمیمی Hazim Al-Temimi کا نام لکھا۔اُس کی نظم ''ایک دن'' پڑھی جارہی تھی۔بغداد کے جنوب کا یہ شاعر جسنے دلدلی علاقے کے ایک انسان کی

خواہشات کو بہت دل پذیر انداز میں بیان کیا تھا۔ایک دن جب بچہ بڑا ہوگا۔اس کے بڑا ہونے سے اُسکی خواہشات کے تانوں بانوں میں اُلجھی ایک لمبی داستان۔نظم ختم ہوئی۔اس پر تعریفی انداز میں تھوڑی دیر بات ہوئی۔

اب منال الشیخ Manal-Al-Sheikh کو پڑھا جا رہا تھا۔شاعرہ کا تعلق نینوا سے تھا۔ایک دلیر، جی دار اور بے باک شاعرہ۔میں افلاق کے گھٹنے پر رکھے کاغذ پر لکھے لفظوں کو پڑھتی، پھر آنکھیں اٹھاتی اور پڑھنے والے کے چہرے پر ٹکا دیتی۔

وہ عراق کی جون آف آرک ہے۔جس نے ملک چھوڑ دیا کہ اُسے دھمکیاں ملتی تھیں اٹھانے جانے کی، قتل کی مگر جو اپنی پوری قوت سے چلا کر کہتی تھی۔

''یہ جس آگ کی تم مجھے دھمکی دیتے ہو۔تمہارا خیال ہے کہ یہ مجھے کھا جائے گی۔اطمینان رکھو مجھے کالے جادو کا علم آتا ہے۔یہ جان لو کہ میرے ملک میں آنے والا انقلاب مجھ جیسوں کی رہنمائی میں آئے گا۔تمہاری لگائی ہوئی آگ کو اتنی اجازت نہیں دوں گی کہ وہ مجھے کھا سکے۔میں نے کیا نہیں دیکھا۔پارٹیوں کی اقتدار کی کشمکش، بم باری، ٹکڑے ہوئے انسان یہ سب آپ کو کتنا غم زدہ کرتا ہے۔میری شاعری اسی کا تو اظہار ہے۔

داد و تحسین کے ڈونگرے برستے تھے اُس کے اشعار پر۔جب دس (10) بج رہے تھے۔محفل تو اپنے عروج پر تھی۔مگر مجھے ڈر تھا اپنے لوگوں کا کہ جنہوں نے بتیاں گل کر دینی ہیں۔میں نے کاغذ پر جھک کر لکھا۔

افلاق اب چلنا چاہیے۔اور ہم جیسے خاموشی سے داخل ہوئے تھے اُسی طرح اٹھ کر باہر نکل آئے۔

باب نمبر:8

1۔ بلندی والی ناک اور ذہین آنکھوں والا منصور جس نے بغداد بنایا
تو سوچا بھی نہ ہوگا کہ عروج کے آخری پوڈوں پر بیٹھنے والا یہ شہر زوال
کے پاتال میں بھی گرتا رہے گا۔
2۔ عرب دنیا اپنے قابل فخر سپوتوں کے ساتھ منصور کوارٹر میں موجود تھی۔
3۔ کل یہ صدام کا بغداد تھا آج امریکیوں کی کالونی ہے۔

کچھ نام عجیب سی رومانیت، ایک پرفسوں سا سحر اور بے نام سی اپنایت کی خوشبو اپنے اندر لپیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ منصور نام بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ میں تو سمجھتی تھی کہ میں ہی اس کے عشق میں مبتلا ہوں۔ مگر نہیں جی بہت ساری اس کی محبت میں گرفتار ہیں۔ زاہدہ حنا نے ایک بار باتوں کے دوران اپنی حد درجہ پسندیدگی کا اظہار کیا تو میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ تم جیسی انٹیلکچوئل اگر اس کی اسیر ہے تو پھر ہم جیسے جاہل تو قابل معافی ہیں۔''

تو اس وقت جب بغداد صبح نو بجے کی دھوپ میں ہی جلنا شروع ہو گیا تھا۔ ہم کاظمیہ سے شاہراہ چودہ جولائی پر چڑھے۔ الفارس چوک سے گزرے۔ بہت مانوس سے اپنایت والے منظر تھے۔ صفائی ستھرائی میں لاپروائی کا عنصر، شاپروں کے خالی پیکر میرے ملک کی طرح شتر بے مہار کی طرح یہاں وہاں اڑتے پھرتے حفظان صحت کے اصولوں کی

زبوں حالی کا رونا روتے تھے۔

افلاق نے مجھے المتنابی کا علاقہ دکھاتے ہوئے سڑکوں کے دو موڑ کاٹے اور شاہراہ منصور پر گاڑی ڈال دی۔ہلال احمر کی عمارت سے آگے چوک میں جعفر منصور کی یادگار ہے۔

منصور سکوائر میں عرب شہسوار کا مجسمہ جو گھوڑے پر سوار اُسے اڑائے لیے جا رہا تھا۔عربوں کی دلیری، شجاعت، حُسن پرستی اور کریم النفسی جیسے جذبات واحساسات چہرے اور وجود کے ہر حصے سے ہویدا تھے۔میری آنکھوں میں شوق واشتیاق کی دنیا نے انگڑائی لی تھی۔

میران ال سیدن کی فنکاری کی داد دی تھی۔عربی روایات اور عربی خصوصیات کا حامل گھوڑا اور گھڑسوار۔کیا بات تھی؟

عرب کواٹر منصور میں منصور کا عربی وضع قطع لیے دھڑ کے بغیر مجسمہ اُس ٹاور پر رکھا ہوا ہے جو راؤنڈ سٹی وال کے ٹاورز کی خوشگوار یادوں کو تازہ رکھنے کیلئے بنایا گیا ہے۔

ٹاور طغرئی اور نقشی کام سے سجا ہوا ہے۔افلاق سے ہی پتہ چلا تھا کہ یہ موورش سٹائل ہے۔یہ ابھی دو سال پہلے بغداد میونسپلٹی کلچر کے ٹیکنیکل ماہرین کی مدد سے اِس منصور سکوائر میں دوبارہ نصب کیا گیا ہے۔پہلا والا ماڈرن آرٹ کے بانی ال راحل Al-Rahhal کا شاہکار جسے تخریب کاروں نے شدید نقصان پہنچایا تھا۔

آرٹ، لٹریچر اور سائنس میں دلچسپی لینے والا روشن خیال، بلندی والی ناک اور ذہین آنکھوں والا منصور جس نے شہر بنایا تو کہیں سوچا تھا کہ یہ اگر عروج کے آخری پوڈے پر بیٹھے گا تو ایک دن زوال کے پاتال میں بھی گھرے گا اور سامان عبرت ہوگا۔

اس کی آنے والی نسلوں میں لوگ لسانی اور مسلکی گروہوں میں بٹ کر اُس

اخلاقیات سے محروم ہوجائیں گے جہاں اپنے اسلاف سے محبت ،لگاؤ اور احترام کے جذبات ان چیزوں کی حفاظت کرنا سکھاتے ہیں جن کا کسی نہ کسی رنگ میں تعلق اُن سے جڑا ہوتا ہے۔

منصور سٹی کا شاپنگ مال بھی دیکھنے کی چیز تھا۔منصور عراقی تہذیب و ثقافت کا قدیمی مرکز ،کبھی یہ ڈپلومیٹ، غیر ملکیوں کی رہائش گاہوں اور ملکی اور غیر ملکی پیشہ وروں کا گڑھ ہوتا تھا۔مگر اب بموں کے دھماکوں، kid napping اور تشدد پسندوں کی کاروائیوں نے اِسے بہت غیر محفوظ بنا دیا ہے۔

''ہائے ری میّا وقت کی یہ نئی چیرہ دستیاں۔''

تو میں اس وقت وہیں کھڑی تھی جہاں بغداد کی تاریخ نے جنم لیا۔ جہاں اُس بہادر، جیالے، ستاروں پر کمندیں ڈالنے کی خواہش رکھنے والے، منفرد سوچ اور خیالات کے حامل میسو پوٹیمیا کے تہذیبی ورثے سے شناسا فرات، دجلہ کی زرخیزی اور انکی اہمیت سے آگاہ ، نئے رنگوں اور نئے رجحانات کے ساتھ تاریخ میں بھی کوئی کھڑاک کرنے کا شوقین عباسی خلیفہ جعفر منصور نیا پایہ تخت چاہتا تھا۔یہ تھوڑی کہ دارلخلافہ نہیں تھا۔

تھا

دمشق جیسا خوبصورت شہر تھا۔لیکن اُس پر چھاپ امویوں کی تھی امویوں اور عباسیوں کا اینٹ کتے والا بیر۔مرو اور زاب کے دونوں معرکوں میں امویوں کے سارے بل کس نکل گئے تھے۔مروان بن محمد کو آخری اموی حکمران کے طور پر تاریخ میں درج کروانے کے بعد اُن کے برتے ہوئے محلوں میں گھس جانا تو فاتح خلیفہ کیلئے ہتک کی بات تھی نا۔

اب مصاحبوں سے صلاح مشورے اور گھوڑوں کی ننگی پیٹھوں پر بیٹھ کر جگہوں کے

معائنے اور بحث وتکرار کے مرحلے ضروری ٹھہرے تھے۔حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں کوفہ بھی پایہ تخت کی فہرست میں نام درج کروا چکا تھا۔کسی علی ابن طالب کے چاہنے والے نے کوفے کو تجویز کردیا۔ سبھی لٹھ لے کر پیچھے پڑ گئے۔

''اللہ بچائے ان کوفیوں سے تو۔ایسے خبیث،بدطینت اور دو غلے۔چوری کیلئے چوروں کو بلائیں اور کوتوالوں کو بھی آواز دے ڈالیں کہ'' ارے آؤ بھاگو، دوڑو ہم تو لٹ گئے۔''

یوں قدیم میسوپوٹیمیا Mesopotamia قوموں کے پایہ تخت بھی تھے۔غوروخوض اُن پر بھی ہوا۔

بابل(Babylon) دجلہ وفرات دونوں کے پانیوں سے فیض اٹھاتا تھا۔کسی نے رائے دی۔

دوسرے نے پل نہیں لگایا اور بات کے گلے پر اعتراض کی تیز دھار والی چھری پھیر دی۔

''اے لعنت بھیجو۔مُردے کو مکھن کی مالش والی بات ہوگی۔کھنڈروں پر جتنے مرضی محل کھڑے کردیں گے بیچ میں سے کہیں سامیوں کے نشان نکلیں گے۔کہیں سمیری بولیں گے۔

پھر اشواریوں Assyriaa کا پایہ تخت آشور(Ashur) زیرِ بحث آیا۔

''ارے بابا۔کسی نے ناک بھوں چڑھایا۔شمال مشرق میں ذرا سا چھینکے گا بھی تو خراسان بھاگا آئے گا۔''

نینوا کا کسی مصاحب نے ذکر کیا۔یہ بھی ردّ ہوا۔

''لو شاہ پلسیر سوم Pileser III کی جھوٹ کھانے ہم سادات ہی رہ گئے

ہیں۔"

سکندر اعظم کے جانشین سیلوکس کے سلوکیا Seleucia پر کُھل کر بحث ہوئی۔ یہاں ایک نہیں تین چار نے نتھنے پھیلائے۔ آنکھیں چڑھائیں اور غصے سے بولے۔

''توبہ کرو۔ کانوں کو ہاتھ لگاؤ۔ سکندر اعظم اور سیلوکس دونوں کو کھا گئے۔ بڑا منحوس مارا۔"

بس تو دجلہ ہی معتبر ٹھہرا تھا اور بغداد بسانے کا آغاز اِس کی مغربی جانب سے ہوا۔ تاریخی حوالے سے زمانہ ۱۴۵ ہجری کا تھا۔ اس کا بنیادی پتھر 672 AD میں منصور نے اپنے ہاتھوں سے رکھتے ہوئے قرآن مجید کی آیت پڑھی تھی۔

''اے خدا زمین تیری ہے اور تو جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔"

پھر اس کیلئے دعا گو ہوا۔

سارے تعمیراتی اور ریاضی کے ماہرین اکٹھے کر لیے اور حکم دیا کہ عمارتیں علم ہندسہ کے مطابق تعمیر ہوں۔ روایت ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ کو نگران اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ امام اعظم ہی وہ ہستی تھے کہ جنہوں نے جگہ کو گزوں سے پیمائش کر کے خشت شماری کا طریقہ رائج کیا۔

گول دائروں کی صورت میں اس کی تعمیر ہوئی۔ یہ تعمیر کا نیا رنگ تھا۔ یہ ایک نیا اور انوکھا اندازِ تعمیر تھا۔

جب بیٹا مہدی خراسان سے جنگی مہم میں کامیاب لوٹا۔ باپ نے دجلے کے مشرقی کنارے پر اُسے محل کیلئے جگہ دیتے ہوئے Divide and rule کی پالیسی سمجھائی اور حکمرانی کے زریں اصولوں پر روشنی ڈالی۔

''محل بناؤ۔ فوجی بیرکیں تعمیر کرواؤ۔ عجمی (ایرانی) فوج اور لوگوں کو اُدھر بساؤ۔ اگر مدینتہ المنصور کرخ Karakh کے عربی شورش یا بغاوت کریں تو

رصافہ Rusafa کے عجمیوں (ایرانیوں) سے پٹواؤ۔اگر رصافہ Rusafa کے عجمیوں کو امن وآشتی کی گرانی لڑنے لگے تو کرخ Karakh کے عربوں سے مرمت کرواؤ۔سدا سکھی رہو گے۔

بہت قلیل عرصہ میں یہ جگہ جو صرف ایک گاؤں تھا ایک عظیم الشان شہر میں تبدیل ہوتا گیا۔عالیشان محلات، باغات، پارکوں سے وہ صورت گری ہوئی کہ جو اس وقت کی عظیم اسلامی ریاست جو ہندوستان اور سارے بحر اوقیانوس کے کناروں تک پھیلی ہوئی تھی کیلئے باعث مثال اور باعث رشک تھا۔

یہ منصور کا بغداد، عباسیوں کا بغداد، ہارون الرشید کا بغداد، یہ جسے مشرق کا وینس کہتے تھے، یہ جس کے مقدر میں بار بار اُجڑنا اور لٹنا لکھا گیا۔

ہارون الرشید کے زمانے میں مشرقی کنارے پر بھی پھیلنا شروع ہوا اور اپنی معراج کو پہنچا۔

کل یہ صدام کا بغداد تھا آج یہ امریکیوں کی کالونی ہے۔

کتنی لمبی ہوک تھی جو میرے دل سے نکل کر میری آنکھوں کو بھگو گئی تھی۔

یہیں الکندی Al-Kindi دیکھا عرب دنیا کا عظیم فلاسفر، ریاضی دان، طبیب اور موسیقار۔ابو یوسف اسحاق الکندی جنکی تین سو کتابیں کچھ ترجموں کی صورت اور بقیہ طبع زاد۔ان کے تخلیقی کام نے عرب افکار پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

یہ کیسے روشن خیال اور عالی دماغ لوگ تھے جو موسیقی سے محبت کرتے تھے اور فن کی اس صنف سے ان کی محبت اور وابستگی سے ان کے مذہب پر چوٹ نہیں لگتی تھی۔عراقی فنکار محمد الحسینی کا یہ شاہکار۔میں نے بھی اُس عظیم شخصیت ابو یوسف اسحاق الکندی کو خراج پیش کیا۔سچ تو یہ ہے میری آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

عرب شاعروں میں دسویں صدی کے وسط کا وہ عظیم ترین شاعر المتنابی ۔کوفے میں پیدا ہونے والا صحرا کا باسی ۔ابوریحان گیلانی کے فن کا پارہ۔

طب کی دنیا کا وہ بہت بڑا نام، 230 کتابوں کا مصنف محمد زکریا الرازی۔جس کی شہرہ آفاق کتاب (Comprehensive medicine Al-Hawi) دنیا بھر میں مقبول رہی۔

ایک عظیم لسانیات کا ماہر، حرف ونحو گرامر کا ماہر، پہلی عربی ڈکشنری بنانے والا جس نے Melody اور rhythm پر بہت لکھا اور شاندار لکھا۔

ال فراہیلی Al-Faraheli عربی شعروں کو لکھنے کا سٹائل دینے والا۔

یہ اگر پیغمبروں کی سرزمین تھی تو عرب دنیا اپنی قابل فخر سپوتوں کے ساتھ یہاں موجود تھی۔اب ایسے میں دیکھتی کہ سُورج بہت گرم ہے۔اور مجھے اتنا چلنے سے تھکن ہوگی اور میرے گوڈے ذرا بیمار ہیں۔نہیں یہاں میرے ماضی کا جو ہر قابل ،میرے گزرے کل کا شاندار قابل فخر ورثہ جس انداز میں سجا ہوا تھا مجھے اُسے دیکھنے دیوانہ وار بھاگنا ہی بھاگنا تھا۔اور میں بھاگی ۔میرا آج کا دامن خالی تھا۔تو اگر میرا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہتا تھا تو کیا غلط تھا۔میرے دل میں درد تھا تو بجا تھا۔میرے ہونٹوں پر اگر آہیں تھیں تو وہ بھی درست تھیں۔

قریب ہی کرخ Karkh تھا۔عباسی عہد کا تجارتی مرکز۔اس کی بنیاد رکھنے والا بھی خلیفہ جعفر منصور ہی تھا۔

جہاں کشادگی تھی اور گاڑی آسانی سے جا سکتی تھی وہاں تک افلاق نے مجھے اُترنے نہیں دیا۔

اور میں دیکھتی تھی یہ تو ماٹھے لوگوں کا علاقہ تھا۔کہیں اگر گلیاں ذرا کشادہ تھیں تو

وہیں دو بالشت چوڑی گلیوں کی بھی کمی نہ تھی۔ دروازوں کے آگے پھٹے پُرانے پردے لٹکتے تھے۔ مٹیالے ایک منزلہ دومنزلہ گھر۔ خستگی اور کہنگی میں لپٹے ہوئے۔ بازار بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ جہاں چوڑی سڑکیں تھیں وہاں آدھی دوکان سڑک کے کناروں پر بکھری ہوئی تھی۔ کہیں گیس کے چولہوں پر قہوہ پکتا تھا اور کھلونے جیسے شیشوں کے گلاسوں میں لوگ قہوہ پیتے تھے۔ کہیں صفائی ستھرائی کا دھیان نہیں تھا۔ کاغذ اور پلاسٹک کے شاپر اُڑتے پھرتے تھے۔ ایک دوکان میں شیشہ پیتے لوگوں کی بھیڑ تھی۔ خریداری کرتے زیادہ لوگ تو مجھے ایرانی نظر آرہے تھے۔ افلاق نے میری طرف دیکھتے ہوئے پُوچھا تھا ''کہ مجھے کچھ خریدنا تو نہیں۔''

''افلاق شاپنگ کبھی میرا کریز نہیں رہا۔ ہاں یہ کرخ بلاشبہ خوش قسمت ہے کہ اپنے ماضی کی پہچان کے ساتھ زندہ تو ہے۔''

''یہ ماضی میں باہر سے آنے والے سوداگروں اور امراء کا بازار تھا۔ اب غریبوں کا بن گیا ہے کہ ان کچی نیم پکی گلیوں میں بڑے لوگوں کے آنے سے اُن کا دم گھٹتا ہے۔''

''افلاق پرانی چیزیں ہمیشہ سے غریبوں کا مقدر رہوتی ہیں۔''

مجھے قدیم لاہور کا دلی دروازہ، کشمیری بازار، رنگ محل، گمٹی بازار، پانی والا تالاب یاد آئے تھے۔ غریبوں کے بازار اور محلّے۔

پہلے منڈی اور بازار سب مدینتہ المنصور میں تھے۔

افلاق کرخ کو کاروباری مرکز بنانے سے متعلق دلچسپ کہانی سُناتا ہے۔

جعفر منصور کے نئے پایہ تخت کا بڑا شہرہ تھا۔ ہمسائے ملکوں کے ہوں، چاہے گھروں کے۔ سدا ٹوہ لینے والے، خوشحالی سے جلنے سڑنے والے، بظاہر میٹھے پر اندر سے چھریاں چلانے اور جڑیں کاٹنے کیلئے مشہور۔ اُس وقت بغداد کی مسلم دنیا کی مدِ مقابل تو

صرف اُندلس ہی تھا۔ پر کلمہ گوامویوں اور عباسیوں کا اٹ کتے والا بیر مشہور تھا۔

شہنشاہ روم بڑا نک چڑھا اور خودسر سا حکمران ۔خراج تو دیتا تھا پر حال تو وہ والا تھا کہ بکری دودھ تو دے گی پر مینگنیں ڈال کر۔ جب موقع ملتا سرکشی پر اُتر آتا۔ پھر تواضع کروانا اور سیدھا ہوتا۔

مغربی یورپ کے حکمران جزیروں میں سمٹے ٹکڑوں میں بٹے کبھی اس عظیم الشان مملکت جس کی حدیں ہندوستان سے بحراوقیانوس کے کناروں تک پھیلی ہوئی تھیں کے فرمانروا منصور کے کارنامے کو دیکھنے اور اندر خانے کی خبریں لینے باری باری آئے تھے۔ بادشاہ بھی نرگیست کے مارے ہوئے کہ ہردم چاہیں تعریفوں کے پُل بندھیں اور قصیدے گائے جائیں۔

اِس کارنامے پر تو بڑے گڈے بندھے تھے۔ واہ واہ اور بلّے بلّے ہوئی تھی۔ پر جب قسطنطنیہ کا سفیر آیا۔ حسب معمول اُسے بھی شہر دکھانے کا حکم ہوا۔ اُس نے شہر دیکھا۔ بلاشبہ تعمیر کا ایک نیا رنگ لیے ہوئے تھا۔ تین دائروں کی صورت میں جو تین دیواروں کی صورت چکر کاٹتی تھیں۔ چار دروازے، باب بصرہ، باب کوفہ، باب شام اور باب خراسان۔

بیرونی دیوار کے گرد خندق تھی۔ جس میں پانی بہتا تھا۔ پُل پر کھڑے ہو کر چند لمحوں کیلئے اُس نے منظر کی رعنائی دیکھی اور خوب کہا۔ دروازوں کے پٹ تنوں کے حساب سے بھاری اور ان کی بلندی دیکھنے کیلئے گردن پُشت کی جانب آخری حد تک لیجانی پڑتی تھی۔

بیرونی اور درمیانی دیواروں کے ہر دروازے پر بادشاہ کے بیٹھنے کیلئے بالا خانے۔ تینوں دیواروں کے درمیان سڑکیں، چوک، گلی کوچے، مکانات، تجارتی مرکز اور

منڈی دیکھی۔بھانت بھانت کا تاجر سوداگر اور خریداروں کے ڈھیر نظر آئے۔کہیں اگر بدخشاں کے لعل چمکتے تھےتو وہیں یمن کے زمرد وموتی بہار دکھلا رہے تھے۔سر زمین حجاز کے عود وعنبر پرلوگ ٹوٹے پڑتے تھے۔

اونٹوں کے کجاوں میں پھل تھے۔سبزیاں ،خشک میوے اور دیگر سوغاتیں تھیں۔ایک گہما گہمی رونق میلہ۔خوبصورت اور حسین عورتیں سیاہ لبادوں اور سیاہ نقابوں میں لشکارے مارتی ریشم اور موتیوں کے تاجروں کے گرد بھاؤ تھاؤ کرتی تھیں۔کیا موہ لینے والے منظر تھے۔

بادشاہ کے حضور دربار میں سفیر قسطنطنیہ کی حاضری ہوئی۔تعریف تو ہوئی مگر۔۔۔۔کے بعد جملہ اُدھورا چھوڑ دیا گیا۔

منصور چونکا۔

''مگر کیا۔''

وہ تو قصیدہ سننے کا متوقع تھا۔

''تجارتی مرکز شہر کے اندر۔سخت غلطی۔ملک ملک کے لوگ آتے ہیں۔سو سجن بیلی،سو بیری دشمن۔کسی کے دل کا حال کون جانے؟کسی کی نیت کا کھوٹ کون پرکھے؟حضور محفوظ نہیں۔

منڈی تو باہر ہونی چاہیے۔

اور یوں یہ کرخ بنا۔تجارتی مرکز۔ماضی کا بھی اور آج کا بھی۔تو میں جب تاریخ کی صحرا نوردی میں گم تھی دفعتاً مجھے جیسے یاد آیا اور میں نے خود سے کہا۔

''ارے ماسکو کی تعمیر بھی تو دائروں کی صورت میں ہوئی۔پہلا چکر کریملین کا ،کلومیٹر بعد دوسرا دائرہ اوکھتونی ریاد کا،تیسری کول حفاظتی دیوار کی فصیل

پھر چوتھی، پانچویں ۔ان میں گلی کوچے مکان اور سڑکیں ۔

آپ کو بھوک لگ رہی ہے ۔ بہت سپیشل چیز آپ کو کھلانے لے جارہا ہوں ۔یہ عراقی آرمینین لوگوں کی ڈش ہے ۔باسٹرما Basturma ۔

سعدون سٹریٹ کے ایک بڑے خوبصورت سے ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے ۔ڈیکوریشن ایسی منفرد سی تھی کہ چند لمحوں کیلئے میں مبہوت کھڑی دیکھتی رہی ۔لگتا تھا جیسے کسی نگارخانے میں آگئی ہوں ۔

مدھم سروں میں موسیقی کی دلنواز دھنیں سارے ماحول پر بکھری ہوئی تھیں ۔یہ باسترماڈش تھی ۔اُسے کھاتے ہوئے اُسے بنانے کی جو تفصیل افلاق نے مجھے سنائی تھی اُس کے حسابوں سے تو گویا اسکی تیاری چند گھنٹوں میں کیا دنوں میں بھی نہیں کہیں ہفتوں میں جا کر ہوتی تھی ۔

اب جب اُس نے اپنی مرحومہ بہن کے حوالے سے کہ اُسنے اپنی کسی آرمینیائی سہیلی سے اسکی ترکیب اس کے اصلی رنگوں کے ساتھ سیکھی تھی اور وہ اُسے پکا پکا کر بہت ماہر ہوگئی تھی ۔میں نے اِسے سُنا ضرور مگر نہ میری آنکھوں میں کوئی اشتیاق تھا اور نہ کانوں میں ۔آنکھیں لوگوں کو دیکھتی تھیں ۔کان نامانوس آوازوں کو سُنتے تھے ۔اور دل کی دُنیا رنگینیوں کو دیکھتے ہوئے ہمک سی رہی تھی ۔اب مجھے یہ تو یاد رہا تھا کہ قصائی سے بہترین گوشت لینا ضروری ہے ۔پر بہترین گوشت جوئے شیر لانے کے برابر خاص طور پر میرے ملک میں جہاں بے ایمانی ایمان کا حصّہ بن گئی ہے ۔اب اسے نمک لگا کر کوو کر فرج میں رکھے اور نکالے پھر رکھے اور پھر اُسے سائے میں خشک کرے ۔

''ہائے اتنے سیاپے ۔ارے اس سے بہتر نہیں کہ وہ اپنا آلو گوشت ہی کھا لو''

اور جب افلاق مجھ سے پوچھتا تھا آپ کو میں لکھ دوں گا اس کی ترکیب ۔

''توبہ کرو افلاق میں تو انتہائی پھوہڑ عورت ہوں ۔میں اور گوشت کو سات دن ہوا سے بھری چھاؤں میں خشک کروں ناممکن ۔''

افلاق آرام کیلئے مجھے اُم اطبول کی مسجد شہدا میں لے آیا۔ام اطبول کا علاقہ قادسیہ کے پاس تھا۔

بہت خوبصورت مسجد تھی ۔افلاق نے گاڑی پارک کی ۔قالین قدرے بوسیدہ تھے ۔تاہم رنگوں کی شوخی غالب تھی ۔دو بوڑھی اور ایک جوان عورت بیٹھی باتیں کرتی تھیں ۔میری طرف دیکھا ۔مسکرائیں ۔ہاتھ بڑھائے ۔اھلاً وسہلاً کہا۔مگر کچھ بولنے اور سمجھنے سے قاصر تھیں ۔میں نے ٹانگیں آرام کیلئے پساریں اور امریکہ کہا۔

لفظ امریکہ کہنے کی دیر تھی ۔دونوں بوڑھیوں نے انگشت شہادت آسمان کی طرف اُٹھا دیں ۔کیسا حزن و یاس آنکھوں میں اُبھرا تھا ؟کیسی بے بسی کا اظہار تھا چہرے پر؟ نوجوان لڑکی غُصّے سے سُرخ تھی ۔کاش مجھے عربی آتی ۔ٹوٹی پھوٹی ہی ۔

باب نمبر:9

1۔ میرا بچپن بغداد کی شاہراہوں، گلی کوچوں اور چوکوں میں بکھرا پڑا تھا۔

2۔ سلام میوزک گروپ کا پروگرام عراقی نیشنل تھیٹر میں دیکھنا بہت خوبصورت اور شاندار تجربہ تھا۔

3۔ سیدون سٹریٹ کی اندرونی گلیوں میں جیسے لاہور کے رنگ محل جیسے نظاروں کی پھلجڑیاں روشن تھیں۔

سچ تو یہ تھا میری آنکھوں میں میرے بچپن کی ساری ہنسی چھلکی تھی۔میرا وجود کسی معصوم بچے کی طرح کلکاریاں مارنے لگ گیا تھا۔مسرت کے بے پایاں احساس سے نہال میں نے اپنے سامنے چوک کو دیکھا تھا۔

اللہ میں ٹرامانہ Kahramana سکوائر میں کھڑی تھی۔اسے علی بابا سکوائر بھی کہتے ہیں۔

دھوپ اور سہ پہر کی شوخی تھوڑی سی ڈھیلی پڑی ہوئی تھی۔ہواؤں کی تیزی میں میرے لئے گرمئی استقبال تھا جسنے میرے وجود سے ٹکرا کر اس رومانوی اور اساطیری جگہ پر مجھے خوش آمدید کہا تھا۔میری اور ہم سب کہانیاں پڑھنے والے پاکستانیوں کی وہ محبوب مرجانہ سامنے کھڑی اپنے قدموں میں رکھے چالیس گھڑوں میں چُھپے چوروں پر اپنے ہاتھ میں پکڑے فوارہ نما برتن میں سے بظاہر پانی پر دراصل کھولتا ہوا تیل ڈال رہی تھی۔

مجھے آج بھی یاد تھا۔ایسی ہی لُو برساتی دوپہر تھی۔گھر کی چھت تھی۔میرے کی

ذرا سی اوٹ تھی۔آنہ لائبریری سے ایک پیسے کرایے پر حاصل کردہ الف لیلیٰ کی کہانیاں تھیں۔

مرجانہ تھی۔علی بابا بوڑھا لکڑ ہاراغریب سا۔جس کا گزارہ بھی نہیں ہوتا تھا۔میرے ابا جیسا مزدور آدمی۔کیسے ایک دن کایا کلپ ہوگئی تھی۔کوئی ایسا ہی خزانہ میرے ابا کے ہاتھ بھی لگ جائے۔ہائے موجیں ہوجائیں۔کتنا مزہ آئے؟اِن موجوں اور مزوں کی جو تفصیلات تھیں ان کی ایک اپنی داستان تھی۔

اور وہ مرجانہ ہماری آئیڈیل ہائے جو وہ اتنی ہوشیار اور سمجھ دار نہ ہوتی تو بنتا کیا؟اور جب اُس کا گھر نشان زدہ ہوا تو مجھے اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

''اللہ وہ تو پار ہوگئی۔''

مگر وہ سب جب جل مرے تو ننھا سا دل کتنا خوش تھا؟وہ خوشی آج بھی یاد تھی اور وہی خوشی آنکھوں سے نکل کر اس وقت علی بابا سکوائر کے پورے مرجانہ چوک میں بکھری ہوئی تھی۔

کھل جا سم سم۔بغداد کے علی بابا کے ہونٹوں سے نکلنے والے الفاظ اِسم اعظم کی کُنجی جیسے ہی لگتے۔کوئی ایک دو بار تھوڑی سینکڑوں بار کھل جا سم سم زیرِ لب کہا جاتا اور کسی غار کا منہ کھلنے کی خواہش کا اظہار لبوں پر آتا۔الف لیلیٰ کی کہانیوں کا بھی کیا طلسم تھا کہ لُو برساتی سہ پہر میں کیسی سرشاری سے ہم کنار ہوتی تھی۔

اُس لمحے سارا بغداد، علی بابا سکوائر، اِس کی دوکانیں، یہاں کا علی بابا ہوٹل۔دُوکانوں میں داخل ہوتی باہر نکلتی سیاہ عباؤں اور حجاب میں ملبوس بچوں کو اُٹھائے عورتیں،جینز اور حجاب اوڑھے نوجوان لڑکیاں،اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے ڈشداشا پہنے اور کفایہ اوڑھے اور پینٹ ٹی شرٹوں میں ملبوس مرد اور لڑکے،شور مچاتی بسیں، ہارن بجاتی

ویگنیں، تیز رفتار ٹیکسیاں، چوبی ریڑھیاں سب مجھے بے حد اپنے لگے تھے۔

میں نے اپنے بچپن کی اِس یادگار کو پانچ زاویوں سے دیکھا۔ پہلا نظارہ اُس دوکان کے سامنے کھڑے ہو کر ہوا تھا۔ جہاں سے مجھے مرجانہ کا چہرہ نظر آتا تھا۔ دوسرا اُس کی پشت کی جانب سے تھا۔ چھدرا سا درخت نظارے میں حائل ہوا تو میں سڑک کے سامنے والی رخ پر چلی گئی۔ سیاہی مائل پتھروں کا گول چبوترہ اور سیاہ لمبوتری صورت مرتبانوں کا ہجوم تھا جو ایک دوسرے میں ٹھنسے پڑے تھے۔ چوک میں گاڑیوں کا رش تھا۔ یہاں یک منزلہ، دو منزلہ دوکانوں کے عقب میں بلند و بالا عمارتوں کے نظارے چمکتے تھے۔

کیاریوں میں خوش رنگ پھول کھلے ہوئے تھے کہ تالاب کا پانی شاید انہیں اِس شدید گرمی میں تر و تازہ رکھتا تھا۔

میری یہ خوشی اور سرشاری مزید بڑھی جب میں نے ایک ہزار ایک داستانوں والی شہرزاد کو دیکھا تھا۔

کچھ زیادہ دور نہیں۔ ابونواس روڈ پر ہی دجلے کے عین کنارے پر۔

شہرزاد میری بلوغت کے دِنوں کی آئیڈیل۔ بہت خوبصورت، بہت ذہین، دھیمی سی میٹھی سی، ہمدرد، غم گسار۔ پہلی بار شہرزاد کو پڑھا تو جیسے دل میں کھُب گئی۔ آنکھوں میں سما گئی۔ اُس رات شہرزاد کی جگہ میں خود شہریار کی خوابگاہ میں تھی۔ بہت مہینوں یہ سلسلہ چلا جب تک کہ مجھے کوئی نیا تصوراتی شکار نہ ملا۔ لیکن شہرزاد کبھی نہ دل سے اوجھل ہوئی نہ دماغ سے۔

آج یہاں اِس خوبصورت یادگار کے کونے میں کھڑی شہرزاد ہاتھوں کو تمثیلی انداز میں پھیلائے جانے کن اجنبی دنیاؤں کی داستانیں سنانے میں جتی تھی اور وہ کہانیوں کا رسیا شہریار سنگ مرمر کے وسیع و عریض چبوترے پر بنے چار پانچ سیڑھیوں والے ایک اور بڑے

سے چبوترے پر بچھے تخت پر تمکنت سے نیم دراز سا ایک ٹانگ چبوترے پر دھرے دوسری کو فرش پر پھیلائے کس محویت سے ہمہ تن گوش تھا۔ کیسا چھچھڑ سا تھا یہ شہریار۔ اگر تب اسے دیکھتی تو کبھی اس کی خوابگاہ میں جانے کی غلطی نہ کرتی اور نہ اسے کہانیاں سُناتی۔

وہ خوبصورت شہرزاد چہرہ اُس پر جمائے اُسے جانے کن دنیاؤں کے اِسراروں میں اڑائے لیے جاتی تھی۔ داستان جو صُبح ہونے پر بھی تشنگی سے بھری ہوتی۔ آگے کیا ہونا ہے؟ ایک تجسّس سے بھرا سوال جو شہریار کو دُلہن قتل کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتا تھا۔ ذہین عورت نے کس خوبی سے اونگی بونگی خواہشوں والے مرد کو نکیل ڈال دی تھی؟ اف میں نے اپنے گرد و پیش کو دیکھا تھا۔ یہ گدلے گدلے سے پانیوں کا بہاؤ، یہ ٹیالے ٹیالے سے آسمان کا پھیلاؤ، یہ کھجوروں کے پتوں کا جھکاؤ، یہ قرب و جوار میں پھیلی ہریالیوں میں سانس لیتے رنگا رنگ پھولوں کا دہکاؤ سب اتنے حسین تھے کہ میرا دل اٹھنے کو نہیں چاہتا تھا۔ میں شہرزاد کے سامنے کھڑی تھی۔ اُسے دیکھتی تھی اور اُسے کہتی تھی۔

''شہرزاد میں غریب سے باپ کی بیٹی بچپن ہی سے ملکہ بننے کی متمنی رہتی تھی۔ جب فکرمند وزیر نے تم سے دل کے دُکھ کا اظہار کیا تھا۔ تم نے جس اعتماد سے کہا تھا۔

''میں سب سنبھال لوں گی۔'' تو وہ تم نہیں میں تھی جس نے کہا تھا ''بابا تم کیوں فکر کرتے ہوں۔ میں ہوں نا۔ سب سنبھال لوں گی۔''

آرٹسٹ محمد غنی کا شکریہ۔ بغداد کی وزارت سیاحت اور اں جہانی صدام کا بہت شکریہ کہ جس کی کاوشوں نے میرے بچپن کی وہ پُر مسرت یادیں مجھے لوٹائی تھیں جواب گچھوں کی صورت دماغ کے کسی کونے کھدرے میں پڑی تھیں۔

سچی بات یہی تھی کہ میری سیری نہ ہو پا رہی تھی۔ تصویریں کہیں شہریار کو چھپیاں ڈال کر بنوائی تھیں اور کہیں شہزادکو کلاوے میں بھر کر۔ آخر دونوں میرے پیارے، دونوں

میرے بچپن کے سنگی ساتھی جو تھے۔

یہ کمرشل بغداد ہے۔یہ ڈاؤن ٹاؤن ہے۔اسی کی گلیوں میں پرانا بغداد بستا ہے۔
بلند و بالا عمارتوں ،جدید وضع کے ہوٹلوں،خوبصورت نئے کشادہ چوراہوں جنکے اکثر تاریخی نام حال کا ماضی سے رشتہ جوڑتے ہوئے اِس کی قدیم یادوں کو زندہ رکھتے ہیں۔

''سندباد جہازی سے کتنی واقف ہیں؟''افلاق نے مُجھ سے پوچھا تھا۔

''میرا خیال ہے مجھے کہنا چاہیے تم بغدادیوں سے کہیں زیادہ۔ہائے میرے اللہ افلاق اُس کی مہماتی سفروں کی داستانیں پڑھتے ہوئے جذبات کا کیا عالم ہوتا تھا۔کیا بتاؤں تمہیں۔''

خوبصورت جمہوریہ پُل پر گاڑی بھاگی چلی جارہی تھی۔پل سے نیچے اُترنے پر گاڑی نے رُخ بدلا اور کچھ آگے جا کر رُک گئی۔

ایک خالی جگہ پر اترتے ہوئے افلاق کہتا تھا روایت ہے اُس کا گھر یہاں تھا۔

''تو یہاں بھی کچھ بننا چاہیے تھا۔کوئی میوزیم کوئی یادگار۔بیچارے نے سات مہموں میں کتنے دُکھ اٹھائے تھے۔کتنی بار مرا اور جیا۔''

بہت دیر تک وہاں کھڑی اُسے یاد کرتی رہی۔

عبدالُمحسن السیدون کا مجسمہ۔افلاق مجھے ناصر سکوائر میں لے آیا تھا۔مصروف ترین سکوائر جو شاہراہ سیدون پر ہے۔قریب ہی بس اسٹیشن تھا۔ہجوم اور خلقت امنڈی ہوئی تھی۔چوک میں عبدالُمحسن السیدون کا مجسمہ تھا۔یہ عبدالُمحسن السیدون کون تھے؟ افلاق روشنی ڈالتا ہے۔۱۸۸۹ءا ناصریہ میں پیدا ہوئے۔مُحسن پہلی جنگ عظیم میں عراق کی بڑی طاقتوں کی کالونی بننے والے زمانوں میں وزیر انصاف تھے۔1922 میں وزیر داخلہ بھی رہے۔چار مرتبہ وزیراعظم کا عہدہ سنبھالا۔اپنی چوتھی وزارتِ عظمٰی کے دوران سامراجیوں سے سمجھوتہ

مشکل ہو گیا تو خود کو گولی مار لی ۔یہ کسی اطالوی ماہر تراش کا شاہکار ہے جو۱۹۳۳میں یہاں رکھا گیا ۔یہاں قریب ہی لبریشن سکوائر میں نامعلوم سپاہی کی یادگار تھی ۔

یہ دراصل ایک بلند و بالا دیوہیکل محرابی صورت تمکنت سے کھڑی عراقی فنکار عبداللہ احسان کمال اور رفعت کا اپنی او رقوم کی طرف سے نذرانہ عقیدت تھا اُن سپاہیوں کیلئے جنہوں نے ۱۹۵۹میں اپنی جانیں ملک وقوم کی عزت ووقار کیلئے قربان کیں ۔

سیدون سٹریٹ اور ملحقہ Al Jamoun سٹریٹ کی اندرونی گلیوں میں پرانے بغداد کی وہ جھلکیاں تھیں جنہیں دیکھنے کیلئے میں مری جارہی تھی ۔وہی تنگ تنگ گلیاں، چھجے دار بالکونیاں محرابی لمبی کھڑکیاں ،گلیوں میں کھلتے تنگ تنگ دروازے، گھروں پر برستی کہنگی کہیں کہیں کوئی نیا بنا ہوا گھر ۔قہوہ کیفے کی دوکانیں ۔حقہ پیتے ، تاش کھیلتے لوگ ۔سارا ماحول اپنائیت میں ڈوبا جیسے میں رنگ محل کے کوچہ بازار میں پھرتی ہوں ۔

پاس ہی 14 رمضان مسجد اپنی خوبصورتیوں کے ساتھ فوراً توجہ کھینچی تھی ۔رات کی روشنی میں مسجد کے گنبد او رمینار چمکتے تھے ۔کھجور کے درختوں کی بلندی روشنیوں میں کچھ اور بلند دکھتی تھی ۔قرب و جوار کی بلند و بالا عمارات چمکتی تھیں ۔شاہراہوں کے گول چکر ایک دوسرے کو دا ہیں با ہیں سے کاٹتے تھے ۔روشنیوں کا ایک طوفان امنڈا ہوا تھا جو ہراساں کیئے دیتا تھا۔

عراقی آرٹسٹ جواد سلیم کا یہ شاہکار رات کی روشنیوں میں چمک رہا تھا۔آرٹسٹ کی فنکاری سے سجا دیر تک دیکھنے کی دعوت دیتا تھا ۔یہ آرٹ کا بہت بڑا شاہکار ہے ۔میں سُن رہی تھی ۔۱۴جولائی ۱۹۵۸ کے تاریک دنوں کو روشن دنوں میں بدلنے کی جدوجہد کا عکاس ۔انقلاب ، آزادی، خوشحالی اورامن کا نمائندہ یہ شاہکار ۔جس میں لوہے کی سلاخیں ظلم وجبر کی علامات ہیں تو اُن سلاخوں کوتوڑا جا رہا ہے ۔لوہے کی سلاخوں کے گھتے تعمیر وترقی کے

علامتی نشان ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ عراق اپنی خوشحالی اور تعمیر و ترقی کیلئے کس قدر کوشاں ہے۔اس کی ۱۹۶۱ میں نقاب کشائی ہوئی تھی۔

بغداد کے ڈاؤن ٹاؤن میں افلاق کی ٹیپ سے سُنی ہوئی نظم نے مجھے بار بار یاد آ کر افسردہ بھی کیا۔

افلاق مجھے عراقی نیشنل تھیٹر دکھانا چاہتا تھا۔"یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ سیلام Saalam میوزک گروپ وہاں پروگرام کر رہا ہے۔آپ یقیناً لطف اٹھائیں گی۔"

دس ہزار عراقی دینار داخلہ ٹکٹ تھا۔افلاق صرف ایک ہی ٹکٹ لایا تھا۔میری زبان کیا میرا تو مُومُو اُس کا شکر گزار ہوا تھا۔

یہ گروپ عراق کے بہت سے شہروں میں پرفارم کرتا ہوا آیا تھا۔امیر السفر عراقی باپ اور امریکن ماں کا بیٹا جس نے جاز ٹرمپیٹ، عراقی مکام (Maqam) اور سنتور جیسے سازوں سے وہ دھنیں کمپوز کی ہیں کہ لگتا ہے اُس کے گلے میں خدا بولتا ہے۔اُس کی انگلیوں سے نغمے پھوٹتے ہیں۔ڈینا السفر اس کی بہن بھی ایسی ہی صلاحیتوں کی مالک ہے۔

بڑی دل خوش کن معلومات تھیں جو افلاق نے صبح ہی میرے گوش گزار کردی تھیں۔

پانچ بجے اُس نے شیخ عمر کی مسجد سے مجھے لیا اور گاڑی میں بٹھاتے ہوئے بولا۔

''آج آپ کا امتحان ہوگا۔نقشہ کھول کر دیکھیے فتح سکوائر کیلئے کون سی سڑک لیں۔''

مجھے افلاق کی معصومیت پر ہنسی آئی۔پانچ دنوں سے میں اس کے ساتھ تھی۔جوانی میں تو میرا وہ حال تھا کہ ایک بار کسی راستے سے گزر گئی تو راستہ بے شک مجھے بھول جائے مگر کیا مجال جو میں اُسے بھولوں۔اب تو نقشہ سامنے تھا۔

''چلومیاں ابھی تو شیخ عمر سٹریٹ پر چلتے چلو۔یہی سٹریٹ جب ندال میں بدلے اور عین فتح سکوائر میں جا کر اُترے تو وہیں پاس ہی تھیٹر ہو گا۔''

خودستائشی ہرگز نہیں پر نقشے دیکھنے میں مجھے خصوصی مہارت حاصل ہے۔شوق بھی ہے اور سیاحت کی مجبوری بھی ہے۔اس کے بغیر تو چارہ ہی نہیں۔

نیشنل تھیٹر کی کیا بات تھی۔اتنی خوبصورت اور دیدہ زیب عمارت۔ایک ہزار سیٹوں کا ہال جس کی سٹیج دیکھ کر مجھے تو غش سا پڑنے والا ہو گیا تھا۔15 ڈایا میٹر کا متحرک سٹیج جو جدید ترین ساز و سامان سے آراستہ تھا۔میوزک گروپ کے افراد سیمی سرکل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ان کے پاس کون سے کون سے آلات موسیقی تھے میں تین چار تو پہچان سکتی تھی مگر بقیہ کا مجھے کچھ علم نہ تھا۔

افلاق مجھے بیٹھا کر چلا گیا تھا۔مسرّ وری میں اپنے چاروں طرف دیکھتی تھی۔ہال کچھا کھچ بھرا ہوا تھا۔سٹیج کی چھت سے لٹکتی روشنیوں کے منعکس ہونے کے انداز کس قدر رومینٹک تھے۔موسیقاروں کی صورتیں،ان کے پہناوے میرا حال کچھ ٹک ٹک دیدم و دم نہ کشیدم والا تھا۔تین گھنٹے کے اس پروگرام میں مجھ پر کتنی ہی داخلی اور خارجی کیفیات کا نزول ہوا۔کبھی مجھے لگتا جیسے میں بلند و بالا پہاڑوں سے گھری ایک ایسی وادی میں بیٹھی ہوں جس کے پہاڑوں سے بہتی آبشاروں کی طرح سرمدی نغمے پھوٹ پھوٹ کر سارے میں بہہ رہے ہیں۔پَل بھر کیلئے لگتا جیسے تاحدِ نظر پھیلے دریا کے پانیوں میں سُر کی لہروں کے مدّ و جزر مجھے اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہے ہیں۔

اُس ماحول میں مکمل اجنبی ہوتے ہوئے بھی میں اجنبی نہیں تھی۔میرا دل ساتھ ساتھ ڈوبتا اور ابھرتا تھا۔

میں جب باہر نکلی تو عجیب سے سحر میں تھی۔افلاق باہر میرا منتظر تھا۔اُس نے مجھ

سے میرے تاثرات پوچھے تھے۔ میرے پاس کہنے کو یہی تھا کہ تمہارے بہت سے احسانوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تم نے مجھے یہ پروگرام دکھایا۔

سچ تو یہ ہے کہ امیر السٹر پر قوم کو ناز ہے۔ اُس نے اپنے اجداد کے موسیقی ورثے کو نئے رنگوں میں جذب کر کے چار چاند لگا دیئے ہیں۔

باب نمبر:10

1۔ بغداد یونیورسٹی کے اساتذہ سے ملاقات۔

2۔ دنیا کی سُپر پاور بے غیرت اور جھوٹ کی پنڈ۔ حملے کیلئے بہانے کتنے جھوٹے گھڑے۔

3۔ عراق کا نظام صحت، تعلیم، ٹی کس جی این پی سب قابلِ رشک تھے۔لٹیروں نے سب کا بٹرہ کر دیا۔

4۔ بے نظیر بھٹو کو صدام سے ملاقات کیلئے ویٹنگ لاونج میں پون گھنٹہ انتظار کرنا پڑا تھا۔

ہمارے لیے زبیدہ ہمیشہ سے تاریخ میں نور جہاں کی ٹکر کی رہی۔نور جہاں کی کہانیوں نے اگر مسحور کیا تو ہارون کی چہیتی زبیدہ بھی کسی سے پیچھے نہیں تھی۔اُس انجینئر کی آنکھوں کی چمک اور لہجے سے چھلکتا اشتیاق مجھے اکثر یاد آتا ہے جو میرے سکول میں پڑھنے والی بچی کا باپ تھا اور جسکی خدمات سعودی عرب نے نہر زبیدہ کے سلسلے میں حاصل کی تھیں۔

کیا عورت تھی۔جی دار،پُر عزم،شعر و ادب کی دلدادہ اُس کی سرپرست،سخی اور سماجی بھلائی کے کاموں میں پیش پیش۔ہارون الرشید کے ساتھ جب حج کیلئے گئی تو راستے کی مشکلات سے ذاتی طور پر آگاہ ہوئی۔حکم دیا کہ جن راستوں سے حج کیلئے زائرین کے قافلے آتے ہیں وہاں مناسب فاصلوں پر سرائیں بنائی جائیں اور کنویں کھودے جائیں۔

دوسرا حکم زائرین کے ٹھہرنے کیلئے ایک بے حد وسیع و کشادہ عمارت کی تعمیر کا تھا۔

اور تیسرا اُس نہر کیلئے جو مدینہ منورّہ کے چشمے سے مکہ تک پانی لے جائے کہ اہلِ مکّہ کو پانی کی شدید تنگی تھی۔ گورنر مکّہ دم بخود تھا۔ ایسا مہنگا پروجیکٹ۔ عرض کی۔ ملکہ عالیہ فاصلہ بہت زیادہ ہے اور خرچہ بھی بہت۔

''جو میں نے کہا کرو۔ خرچ لاکھوں چھوڑ کروڑوں میں بھی ہو پرواہ مت کرو۔''

تو اِس وقت میں اُسی عظیم خاتون کو خراج پیش کرنے جارہی تھی۔

یہ امت العزیز تاریخ میں زبیدہ ہارون کی چچا زاد بیوی کی حیثیت میں بڑی زبردست اور تاریخ ساز ملکہ تھی۔ ازدواجی زندگی کا ایک پہلو کتابوں میں سے نکل کر اُڑتے ہوئے میرے سامنے آگیا تھا۔

دونوں میں اگر محبت مثالی تھی تو اختلاف رائے میں زبیدہ کے ہاں لحاظ یا مروت میں چُھپ رہنے والی کسی حکمت کا کوئی تصور تک نہ تھا۔

بات تو معمولی سی تھی۔ زبیدہ درست تھی۔ اس کی بات میں وزن بھی تھا اور دلیل بھی۔ ہارون البتہ کج بحثی پر اُتر آیا تھا۔ مردوں والا جھوٹی انا اور حاکمانہ رعب دوب کا عنصر بھی بیچ میں شامل ہوگیا تھا۔ اسی لیے زچ کرنے پر تُل گیا تھا۔

وہ شوہر پرست ضرور تھی۔ پر فضول اور غلط بات برداشت سے بھی باہر تھی۔ غصے میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے اٹھی اور بولی۔

''جہنمی ہو تم۔ دوزخی ہو۔''

مردانہ انا کو شدید زک پہنچی تھی۔ اعصاب قابو میں ہی نہ رہتے تھے۔ غصے کی انتہا پر سے دھاڑا۔

''اگر میں دوزخی ہوں تو تجھے طلاق دیتا ہوں۔''

ایک کربناک چیخ زبیدہ کے اندر سے نکلی اور وہ چھاتی پیٹتی اپنے حصے کی طرف بھاگ گئی۔

غصہ اُترا تو اُسے احساس ہوا کہ زبیدہ تو سانسوں کی آمد و رفت کی طرح اُس کے اندر اُتری بیٹھی ہے۔وہ جیئے گا کیسے؟ بات محل سے دربار اور دربار سے بغداد کے گلی کوچوں میں اُتر گئی تھی۔ہر خاص و عام انگشت بدندان تھا کہ یہ ہوا کیا؟

بغداد کے علما اکٹھے ہوئے۔ہر ہر پہلو سے غور و خوض ہوا۔کامیابی کا کہیں کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔حضرت امام محمد کو بلایا گیا۔وہ بھی ناکام رہے۔اِسی دوران امام محمد شافعی کے کانوں میں بھی اُڑتے اُڑتے یہ خبر پہنچی۔انہوں نے اپنے استاد امام محمد کو کہلا بھیجا۔میرے پاس اِس مسئلے کا حل ہے۔

درباروں میں حاضری دینا امام محمد شافعی کا طریق نہ تھا۔امام محمد نے کہا کہ اس وقت خلیفۂ وقت سے کہیں زیادہ یہ انسانی مسئلہ ہے۔آپ کا میرے ہمراہ چلنا ضروری ہے۔اُستاد کا احترام کرتے ہوئے دربار میں حاضر ہوئے۔سوال کیا۔

''کیا آپ کی زندگی میں کبھی ایسے لمحے آئے جب آپ گناہ کرنے پر قادر تھے لیکن صرف خوفِ خدا کے باعث گناہ سے باز رہے۔''

ہارون الرشید کی آواز میں اضطراب تھا۔جوش تھا۔وہ بے حد جذباتی تھا۔

''میں خدا کو حاضر جان کر قسمیہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ بہت بار ایسا ہوا میں گناہ پر قادر تھا مگر خدا کے ڈر سے باز رہا۔''

''تو پھر سُن لیجیے کہ میں فتویٰ دیتا ہوں۔آپ ہرگز دوزخی نہیں۔اہلِ جنت میں سے ہیں۔''امام شافعی کی آواز متانت اور عالمانہ وقار سے بوجھل تھی۔

دربار میں جو علماء بیٹھے تھے وہ کونسا کم تھے۔بول اُٹھے تھے۔

''دعویٰ دلیل سے خالی ہے ۔ بے وزن ہے ۔''

آپ مسکرائے ۔قرآن مجید کی ایک آیت تلاوت کی ۔مطلب تھا۔

''جو گناہ کا ارادہ کرے اور خوفِ خدا سے باز رہے اس کا مقام جنت ہے ۔''

علماء دنگ تھے ۔ہارون الرشید کا چہرہ مسرت سے سُرخ تھا اور امام کی آواز گونجتی تھی ۔

''جب امیر المومنین دوزخی نہیں تو پھر طلاق بھی واقع نہیں ہوئی ۔''

ماں کے رُوپ میں بھی ایک گوشے نے نقاب میں سے جھانک کر متوجہ کیا تھا۔ایک ماں کے جذبات واحساسات کا نمائندہ واقعہ۔

امین زبیدہ کا بیٹا کوخوبصورت ،ادب نحو وفقہ میں باکمال پر عیش پرست اور آرام طلب بھی بہت ۔وہیں مامون بارغیس (ہرات) کی مراجل نامی کنیز کے بطن سے ۔شکل و صورت میں بالکل عام سا مگر متانت ،بُردباری ،حلم ،علم وکمال ،آداب فرزندی میں اپنی انتہا کو پہنچا ہوا۔

باپ کے جذبات کا اظہار اکثر و بیشتر دونوں بیٹوں کی عادات و خصائل کے مقابلے کی صورت میں نہ چاہتے ہوئے بھی ہو جاتا ۔زبیدہ رنجیدہ ہوتی ۔ہارون الرشید سے جھگڑتی اور طعنے دیتی ۔

''تم ایک کنیز زادے کو میرے عربی النسل بیٹے پر ترجیح دیتے ہو۔''

ہارون صفائی پیش کرتا ۔اکثر دونوں کا امتحان لیتا اور دلیل سے اُس فرق کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا جو دونوں میں تھا۔

زبیدہ شرمندہ ہوتی مگر ماں تھی نا ۔

زبیدہ کی شخصیت کا ایک اور رُوپ میرے سامنے تھا۔امین کو تخت تو مل گیا مگر اس کی ہوس اقتدار کا پھیلاؤ بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔باپ کی نصیحت کہ امین کے بعد مامون

خلافت کا حقدار ہوگا امین سے زیادہ اس کے بدخواہ خیر خواہوں سے ہضم نہیں ہو رہا تھا کہ مامون کی صورت ایرانی غلبہ پا لیں گے۔ مامون کی ماں ایرانی نسل تھی نا۔

کعبے میں آویزاں وصیت نامہ منگوا کر ٹکڑے کر دیا گیا۔

جنگ کا طبل بجا تو آغاز میں امین کا پلّہ بھاری تھا۔

مامون کا کمانڈر علی بن عیسیٰ خراسان مامون کی سرکوبی اور اس کی گرفتاری کے لیے روانہ ہونے لگا تو زبیدہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

''علی تمہیں خدا کے بعد میری قسم جو تم اس پر رتی برابر سختی کرو۔ یاد رکھو اگر امین میرے دِل کا ٹکڑا ہے تو وہ بھی مجھے کم پیارا نہیں۔ جب تم اس پر قابو پا لو تو اُسے اُسی شان اور احترام سے لانا جو اُس کے لیے ضروری ہے۔ وہ اگر تم سے تلخ ہو جائے تو برداشت کرنا۔ اس کے سوار ہونے سے پہلے خود نہ سوار ہونا اور ہاں تم نے صرف یہ پہنا کر اُسے قید کرنا ہے۔''

زبیدہ نے خوبصورت چاندی کی زنجیر اس کی طرف بڑھائی۔

اور علی بن عیسیٰ نے آداب بجالاتے ہوئے کہا ''آپ کی ہر بات کی تعمیل ہوگی'' پر اس کا تو وقت ہی نہ آیا۔

محلوں میں رہنے والی اُس عظیم ملکہ پر وقت پیغمبری پڑا۔

امین قتل ہوا۔ جوان بیٹے کی موت۔

بیوہ ماں کے نالے۔

وہ محل مینارے سب اس لڑائی میں زمین کا رزق ہوئے اور بغداد کی شہزادی گلی کوچوں میں اُڑتے پھرتے تنکوں سے بھی ہلکی ہوئی۔

انقلابات زمانہ تیرے رنگ کیسے کیسے؟

ٹیکسی سٹینڈ پر افلاق موجود تھا۔ بتاتا تھا کہ اُسے کوئی تین گھنٹوں کیلئے اپنے عزیز

کے کسی کام کے لیے بغداد یونیورسٹی جانا ہے۔

پاس کھڑے دو نوجوانوں کی طرف اشارہ کیا۔

''اپنا خیال رکھیے گا۔آپ کا پروگرام حریہ اور کرخ کا ہے۔آپ سے میں رابطے میں رہوں گا۔اگر کچھ اساتذہ وہاں ہوئے تو پھر سعدی آپ کو وہاں لے آئے گا۔''

افلاق کی مجھے عادت ہوگئی تھی۔کو دن تو ابھی چار ہوئے تھے۔پانچویں کی آج صبح تھی پر تقریباً دس بارہ گھنٹے کا ساتھ مجھے تو لگتا تھا میں زمانوں سے اُسے جانتی اور اُس کے ساتھ رہتی چلی آرہی ہوں۔

گاڑی نے رفتار پکڑی اور ٹیپ بھی آن ہوگئی۔مجھے موسیقی کے سازوں کی تھوڑی سی شد بُد ہوگئی تھی۔اُس وقت عراق کا مشہور گائیک جوڑا سلیمہ مراد اور ناظم الغزالی مکام Makam جیسی نغمگی والی موسیقی کے ہمراہ نہ سمجھ آنے والی شاعری کو کس دلنشین انداز میں گا رہے تھے کہ بے اختیاری میں ایک سرور والی کیفیت میں ڈوب رہی تھی۔

شاہراہ حیفہ جس کے ایک طرف سوق الجدید (جدید بازار) ہے وہیں سے طلا سکوائر میں داخل ہوئے۔چھوٹی سڑک پر پڑے۔یہ شیخ معروف ڈسٹرکٹ کا علاقہ تھا۔غربت کے دھول دھبّوں سے اٹا پڑا۔ریت مٹی ملے کچے راستے اور میدان میں کاغذ اور جا بجا اُڑتے پھرتے شاپر ایک عجیب سی کسمپرسی کے احساسات کو جنم دیتے تھے۔چھوٹے بچے تھالیوں میں رکھی کھجوریں بیچ رہے تھے۔ایک تو صحرائی علاقے کا دھوپ میں اُداسی کی جھلکیاں مارتا تاثر،اوپر سے غربت کا تڑکا،دل پریشان کیوں نہ ہوتا۔

بغداد تو اُن وقتوں کا پیرس تھا جب اُس ہارون کا ڈنکا بجتا تھا۔اس کے عالیشان محلوں میں رہنے والی وہ ملکہ کہ نام جس کا زبیدہ تھا اس وقت کیسے اُجڑے پُجڑے شہر کی زینت بنی ہوئی ہے۔

کبھی یہاں کے دن اور راتیں جاہ وحشمت والی ہوں گی۔خلیفہ منصور کے بیٹے کے نام پر یہ جگہ جب زبیدہ کے نام الاٹ ہوئی تو اس نے یہاں محل بنایا تھا۔جس میں اُسکے ملازم رہتے تھے۔زبیدیہ بہت بارونق علاقہ تھا۔

سیاہ بُرقعہ نما عباؤں میں ملبوس تین عورتیں اور چند بچے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔اُس وقت ایک عجیب سی بات ہوئی۔دو پڑھے لکھے لڑکے بھی وہاں آ گئے تھے۔جنہوں نے انگریزی میں بتایا تھا کہ یہ تو زمّرد خاتون کا مقبرہ ہے۔

زمرّد خاتون کون تھی؟ میں نے اُنکی طرف دیکھا۔ایک نے تو ہنستے ہوئے دانت دکھا دیئے دوسرے نے تھوڑا سا بتایا کہ خلیفہ المستعدی بامراللہ AL.MUSTADHI Bi Amr illa کی بیوی تھی۔

یہ نقش ونگاری سے سجی ہشت پہلو عمارت کے عین وسط میں بنے مینار کے ساتھ منفرد سی نظر آئی تھی۔پستہ قامت سنگ مرمر کی قبروں کے درمیان یہ مقبرہ کسی پھول کی طرح کھلا نظر آتا تھا۔بعد میں افلاق سے معلوم ہوا کہ سلجوقی سٹائل ہے۔اب میں وہاں کھڑی پوچھتی ہوں کہ پھر وہ بغداد کی نور جہاں کہاں ہے؟''کاظمیہ کے قریش قبرستان میں۔''

تو بھئی اب وہ کہیں بھی ہو وہاں جانا تو لازمی تھا۔پر جانے سے قبل میں نے زمرّد خاتون کے اِس مقبرے کو بغور دیکھا۔مقبرہ بند تھا۔کھجور کے درخت بھی کیسے بے نیاز سے ہیں۔اپنی چھاؤں سے کسی کو مستفید نہیں ہونے دیتے۔

تپتا میدان اور اس میں ٹپکتی ویرانی اپنے عروج پر تھی۔پاس گنبد کے بغیر ایک چوکور عمارت اور تھی اس کے سامنے زیتون کے چھدرے سے درخت کے پاس کھڑے ہو کر میں نے فاتحہ پڑھی اور بھاگی۔

اور جب سعدی مجھے حُریہ کے قدیم راؤنڈ سٹی میں گھمار ہا تھا اور میں کھڑکی سے

باہر منظروں کو دیکھتی لُطف اٹھاتے کبے چلی جارہی تھی۔

''ارے یہ تو بالکل اپنے دیس جیسا ہے۔دستی چوبی ریڑھیاں اور گدھا گاڑیاں سامان کی ڈھویا ڈھائی میں مصروف سڑک کو تنگ کرتی تھیں۔بچ بچا کر راستہ بنتا تھا۔

سعدی افلاق کا ساتھی باتوں کا شہنشاہ تھا۔موبائل پر افلاق سے بات کی تو اُس نے ڈانٹ پلائی''ارے احمق وہیں پاس ہی اہلِ قریش کا قبرستان ہے۔

میں نے خود کو پھٹکارہ''لو تم کیا چھَنی کاکی بنی بیٹھی ہو۔وہ بغدادی ہوتے ہوئے بھی پاگل سا ہے تو تم خود ہوشیار ہو جاؤ۔گاڑی سے نکلی۔زبان کا بھی مسئلہ تھا مگر میرے ٹامک ٹوئیاں مارنے سے پہلے ہی اُس نے مجھے گاڑی میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی تو جگہوں کو نئے نئے نام دینے لگ جاتے ہیں۔ہم تو اِسے زبیدیہ کہتے ہیں۔''

تو میں قریش قبرستان یا زبیدیہ جاتی ہوں۔تاریخ کی یہ دونوں نامور خواتین جن کے بارے میں بلا مبالغہ کہا جائے کہ دنیا کے دو عظیم حکمرانوں کے پیچھے دو عظیم عورتیں تھیں تو غلط نہ ہوگا۔اِن دونوں شخصیتوں میں کتنی بہت سی باتوں کی مماثلث تھی۔زبیدہ اگر امین کی خلافت کیلئے مری جاتی تھی تو وہیں نوجہان لاڈلی بیگم کو شہزادہ خرم سے بیاہنے کو کہ جانتی تھی کہ تاج و تخت کا وارث اُسے ہی ہونا ہے۔تو دونوں کا انجام کیسا المناک تھا؟

تو یہ بھی ویسا ہی مقبرہ تھا اور پورا قبرستان وقت کے پھنّے خان قسم کی شخصیتوں سے بھرا پڑا تھا۔کہیں کہیں کھجور کے درخت تھے اور کہیں خودرو جھاڑیاں تھیں اور قبریں دھوپ میں جلتی تھیں۔

مقبرے کی محرابی دروازوں والی راہداریاں اپنی مخصوص ساخت لیے ایک دوسرے میں گھلتی تھیں۔دیواروں پر کیا گیا پینٹ جانے کب کا تھا کہ ٹکڑیاں گرتی تھیں اور

کہتی تھیں کہ دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔شاید انہیں معلوم ہی نہ تھا کہ بغداد ایک بار پھر ڈھے گیا ہے۔جیسا یہاں سونے والی کے زمانے میں ڈھا تھا۔

فاتحہ پڑھ کر یہ شعر پڑھتی باہر آ گئی تھی۔

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نہ گلے　　　نے پرے پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

امام غزالی سے ملنے کیلئے بھی میری جان نکلی جارہی تھی۔

گیلانیہ محلّے میں اُس عالم دین، قانون، تعلیم اور بچوں کی نفسیات کا ماہر اور مفکر تصوف جس کا نام امام غزالی ہے کے مزار کو دیکھنے کیلئے جن گلی کوچوں میں سے گاڑی کو گزرنا پڑا اُن سڑکوں، اُن مکانوں کی زبوں حالی کچھ ویسی ہی تھی جیسی میں روز دیکھتی اور کڑھتی تھی۔ ماحول پر پھیلے سناٹے اور دھوپ کے کوفت بھرے احساس کا پرتو دل میں عجیب سے جذبات ابھارتا تھا۔

ویرانی سے بھرے ایک کشادہ احاطے میں وہ عظیم ہستی دفن ہے۔جس کے کچے صحن میں چھوٹے سے بنے پختہ راستے پر چلتے ہوئے میں ان کے مزار میں داخل ہوئی۔مرکزی دروازے پر نیلے پتھر پر سفید حروف میں مرقد الامام محمد بن محمد الغزالی لکھا ہوا تھا۔جالیدار تعویز خاصا اونچا تھا۔نچلا حصّہ بند اور اوپر والا کھلا تھا۔فاتحہ پڑھی اور اُن دنوں کو یاد کیا جب میں ٹیچرز ٹریننگ میں امام غزالی اور ابن خلدون کو پڑھتی تھی اور ان کے مقابلے کرتی تھی۔

اسی دوران افلاق کا فون آیا اُس نے کہا تھا۔"تم سیدھے بغداد یونیورسٹی آجاؤ۔"

میں گھونٹ گھونٹ دودھ پیتی باہر منظروں کو دیکھتی تھی۔گاڑی اُسی راستے پر بھاگی جاتی تھی جس پر گزشتہ دنوں سے بار بار گھوم رہی تھی۔اب تو مجھے خود راستوں کی خاصی پہچان

ہوگئی تھی۔

''سعدی امریکی حملے کے وقت تم کہاں تھے؟''

''میں نے کہاں ہونا تھا۔اِسی تپتے جلتے بغداد میں ہی تھا۔''

''کچھ بتاؤ گے نہیں اُن شب و روز کا احوال۔''

وہ زہر خندی ہنسی ہنسا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔

''میں بہت حسّاس اور جذباتی لڑکا ہوں۔جب سے ہوش سنبھالا ہے جنگوں میں ہی اُلجھے ہوئے ہیں۔امن سکون اور خوشحالی کوتر سے ہوئے۔میری پیدائش 1982 کی ہے۔میرے باپ نے گیارہ ماہ بعد میری شکل دیکھی تھی۔غریب محاذِ جنگ پر تھا۔مجھے دیکھنے کیلئے دو دن کی چھٹی پر آیا۔میرا دادا اکثر کہا کرتا تھا اگر تمہارا باپ زندہ سلامت آ گیا تو میرا شمار زندوں میں ہوگا نہیں تو میں مر جاؤں گا۔آٹھ نو سال کی اِس ایران عراق جنگ نے ہمیں کیا دیا۔جنگ بندی ہوئی تو دونوں قومیں فتح کا جشن منا رہی تھیں۔کوئی پوچھتا کس بات کا جشن؟ کلمہ گو نے کلمہ گو کا گلا کاٹا۔عام لوگ تو بیچارے اپنے بیٹوں، بھائیوں،شوہروں اور باپوں کے زندہ سلامت بچ جانے پر خوش تھے۔وہ ان کے رخساروں پر بوسے دیتے اور انہیں چھیاں ڈالتے ہوئے آنسو بہاتے تھے۔اب امن ہوگا۔دعائیں کرتے تھے۔مگر امن تو ہم سے روٹھ گیا ہے۔

ایک صدام ذلیل اوپر سے یہ لعنتی امریکہ جن کے ٹینک تو پیں بغداد کی چھوٹی موٹی سڑکوں پر بھی یوں بھاگی پھرتی تھیں جیسے ہلکائی ہوئی کُتیاں گندے گلیوں میں بدحواس پھرتے ہیں۔بجلی کا پٹروں کے اُتار چڑھاؤ نے فضاؤں کو دھواں دھار بنا رکھا تھا۔وہ گرد اُڑتی تھی کہ بغداد دُھول مٹی میں غوطے مارتا نظر آتا تھا۔بغداد ایرپورٹ پر تو ان کی مٹرگشت کچھ یوں جاری تھی جیسے یہ اُن کے باپ کا ہو۔ ''لوگوں کا ردِّعمل کیا تھا؟''

''وہ جوصدام کے حمایتی تھے۔صلاح کار تھے۔اُسے پسند کرتے اور چاہتے تھے وہ تو سہمے ہوئے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔مخالف ٹولے خوش تھے۔جن پر ظلم وستم ہوئے وہ بھی بغلیں بجاتے تھے۔تیسرا طبقہ اُن محبِّ وطن لوگوں کا تھا جنہیں صدام سے کتنا بھی اختلاف کیوں نہ تھا۔وہ نہیں چاہتے تھے کہ یوں اُن کا وطن تاراج ہوجائے۔''

میرے اس سوال پر کہ آیا امریکی سپاہیوں نے عام گھروں کے اندر مداخلت کی۔سعدی نے بتایا تھا۔

''انہیں تاکید تو تھی لیکن اس کا انحصار ان کی مرضی پر ہوتا تھا۔کسی بھی گھر میں جانے کیلئے یہی دلیل کافی تھی کہ صدام کے حامی یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔''

''معاف کیجیے گا۔میں نے خلیفہ سٹریٹ میں کسی کو کچھ کاغذات دینے ہیں۔بس تھوڑی سی دیر کیلئے معذرت چاہتا ہوں۔''

''ارے نہیں بچے جو کرنا ہے کرو۔میں بھی تو سیر پر ہی نکلی ہوئی ہوں۔''

خلیفہ سٹریٹ کس قدر خوبصورت تھی۔کشادہ،شاندار، سرکاری عمارات اور خوبصورت مسجدوں سے گھری ہوئی۔

اِسی علاقہ میں عباسیوں کے مدرسے اور محلات ہیں۔

''کبھی اِن شاہراہوں پر بڑے بڑے پوسٹروں پر صدام چمکتا تھا۔آج صدام کہاں تھا؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

پھر میں نے باہر سے ہی الرشید ہوٹل کا دیدار کیا۔مجسموں،فواروں، بوٹوں، درختوں، پھولوں سے سجا جدید طرزِ تعمیر کا حامل۔جنگ کے دِنوں میں دُنیا بھر کے صحافیوں کا جائے مرکز۔

سعدی کی آواز مجھے باہر سے اندر کھینچ لائی تھی۔

''افلاق کے ساتھ آیئے کسی وقت یہاں ۔مرکزی گزرگاہ میں صدام کے پوٹریٹ کو پاؤں سے روندتے ہوئے آگے بڑھیں۔''

''کیا؟''

میری آواز میں حد درجہ حیرت تھی۔

کس قدر طنز سے بھری ہوئی ہنسی تھی جب وہ بولا۔

''منافق لوگ ہیں ۔ایک دوسرے کو استعمال بھی کرتے ہیں اور انہیں ذلیل بھی کرتے ہیں۔صدام نے اپنے وقتوں میں داخلی دروازے کے فرش پر جارج بُش کی تصویر کندہ کروائی تھی۔پہلے لوگوں کے جوتے بُش کو روندتے تھے۔بغداد کو فتح کرنے کے بعد فاتح افواج کیلئے پہلا اہم کام بُش سنٹیر کو اکھاڑ کر صدام کے پوٹریٹ کو بچھانا تھا۔''

''بڑے لوگوں کی عامیانہ حرکتوں کا اتنا چیپڑا انداز۔''میں تو دم بخود تھی۔

کسی شام یہاں آیئے۔ بلکہ کوئی میوزک کنسرٹ اگر ہو رہا ہو تو اُسے دیکھیے ۔میں پتہ کرتا ہوں ۔ہمارے خوبصورت ہوٹل، ہمارے شاندار دفتر سب جل رہے تھے ۔المنصور جیسے شاندار ہوٹل کو آگ لگائی گئی۔گلی کوچوں میں موت ناچتی تھی یا چور ڈاکو ناچتے پھرتے تھے۔ہمارے بینک لُٹ رہے تھے۔بمباری سے ہلاک ہونے والی لاشوں کا کوئی پُرسان حال نہ تھا۔چھوٹے خستہ حال گھر تو پَل جھپکنے میں زمین بوس ہوگئے تھے ۔میرے چھوٹے چچا کا گھر وہیں راونڈ سٹی میں ہی تھا جو ایک جھٹکا برداشت نہ کرسکا۔شکر ہے وہ بچ گئیں۔اسپتال تک اُن سے محفوظ نہ تھے اور وہ جو صدام کی قید میں جکڑے ہوئے عراقیوں کو آزاد کروانے آئے تھے ۔بغداد کے در و دیوار پر چُھوٹتی پھلجھڑیوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔

دجلہ کے کنارے خوبصورت ترین عمارتوں کے ساتھ آباد ہیں ۔صدام کا صدارتی

محل میں نے سعدی کی نشان دہی پر دیکھا۔یہ دجلہ کی دوسری سمت تھا۔کس قدر شاندار ایک انتہائی خوبصورت ٹاؤن کا تاثر اُبھرتا تھا۔میں حیرت سے گنگ بظاہر نظر آنے والے پھیلاؤ کو ہی دیکھ کر گُم سُم تھی جو دجلہ کے ساتھ ساتھ بہتا چلا جاتا تھا۔

''تو یہ گرین زون ہے اور یہاں وہ رہتا تھا ایکڑوں میں پھیلے اِن پُرتعیش جگہوں پر جسے وقت نے چیونٹی کی طرح مَسل دیا ہے۔رہے نام اللہ تیرا۔باقی سارا رولا رولا۔''

سعدی کا کہنا تھا کہ صدام نے قارون دور کی کھدائیوں سے حاصل کردہ محلاتی نمونوں کی طرز پر اِسے بنایا تھا۔اِس محل کے نیچے ایسی خندقیں اور بنکر ہیں کہ جن کی مضبوطی کے بارے میں جتنا جھوٹ بولا جائے اتنا سچ ہے۔

کچھ حاصل ہوا میں نے بے اختیار اپنے آپ سے کہا؟امریکی جب اپنے ٹینکوں کے ساتھ محل میں داخل ہوئے تھے اُس کی شان وشوکت دیکھ کر گنگ رہ گئے تھے۔

"اتنا بڑا ہے۔اتنا پھیلا ہوا ہے کہ اندر شٹل سروس چلتی ہے۔

آج کل امریکیوں کا ہیڈ کواٹر ہے۔وہ کمرے جن میں کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی وہ عام امریکیوں کے بوٹوں نے روند ڈالے۔

عام لوگوں نے اندر جا کر اُسے لوٹا بھی بہتیرا۔

گاڑی میں بیٹھے مجھے کیا نظر آنا تھا۔بس سُنتی رہی۔

Chadiria برج سے ذرا آگے عظیم الشان بغداد یونیورسٹی ہے۔جدید طرزِ تعمیر کی حامل۔سعدی مجھے کیمسٹری ڈپارٹمنٹ میں لے آیا تھا۔ڈپارٹمنٹ میں اُن دِنوں سیمینار ہو رہا تھا۔چھٹیاں ہونے کے باوجود طلبہ و طالبات کی خاصی بڑی تعداد حاضر تھی۔ڈرائیووے پر بسیں کھڑی تھیں۔ایک میں سٹوڈنٹس بیٹھ رہے تھے۔عباؤں کے ساتھ ساتھ لونگ سکرٹ پہننے والی لڑکیاں بھی تھیں۔شارٹ سکرٹ میں صرف ایک لڑکی میں نے

اُوپر چڑھتے دیکھی تھی۔بیشتر لڑکیاں سکارفوں سے سر ڈھانپے ہوئے تھیں۔جنگ سے پہلے یہ ماحول نہیں تھا۔آزادی اور کُھل ڈُل خاصی تھی۔

''اب کیا لوگ مذہبی ہو گئے ہیں؟''

''نہیں۔القاعدہ اور انتہا پسندوں کی طرف سے ملنے والی دھمکیوں کا اثر ہے۔''

میں ہنس پڑی تھی۔

''اِس القاعدہ اور اس کے بھائی طالبان نے جگہ جگہ کیا وختہ ڈالا ہوا ہے؟''

ڈیپارٹمنٹ بہت خوبصورت نظر آیا تھا۔پھولوں اور گھاس کے تختوں سے سجا اُس کا فرنٹ نظروں کو یکدم لُبھاتا تھا۔اُس وقت بلند و بالا چوکور ستونوں پر سجی گھڑی بارہ بجا رہی تھی اور سچی بات ہے کہ دھرتی اور فضا پر بکھرا دھوپ کا جوبن شکر دوپہر کا بھرپور تاثر دے رہا تھا۔

یہاں میری ملاقات فیکلٹی کے چند ممبران سے ہوئی۔تعلیم عراق کی اولین ترجیح تھی۔مُلک بھر میں پھیلے ٹیکنیکل ٹریننگ سکول اور کالج بغداد یونیورسٹی سے منسلک ہیں۔

بصرہ موصل اور المستنصر یہ یونیوسٹی عراق کی بہترین یونیورسٹیوں میں شمار ہوتی ہیں۔

وہ مجھے تعلیمی مراحل سے آگاہ کررہے تھے جبکہ میں جاننا چاہ رہی تھی کہ اُن لوگوں کے ردِعمل موجودہ حالات میں کیا ہیں۔

یہ حساس اور ذہین لوگ تھے جنہیں اپنے وسائل کے لُٹنے کا احساس تھا۔

پڑھے لکھے اور ذہین لوگوں سے بات چیت کا یہ دلچسپ تجربہ تھا۔فیکلٹی کے کشادہ کمرے میں صوفے کم اور کُرسیاں زیادہ تھیں۔یہاں گیارہ لوگ تھے۔کچھ اُدھیڑ عمر اور جوان۔مگر جب گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا مجھے احساس ہوا تھا کہ اُن میں سے ایک دو کے علاوہ کوئی بھی نہ صدام کا حامی اور نہ امریکہ کا۔

ذرا کونے میں بیٹھے قدرے گندمی رنگ کے نوجوان کو جس کا نام ابو المنیب الرازی تھا کو جنگ سے بھی زیادہ اقتصادی پابندیوں پر غصہ تھا۔گلف وار سے قبل مُلک کا فی کس جی این پی (Gross National Product) 3000ہزار ڈالر تھا جو 2001میں گھٹتے گھٹتے صرف 500ڈالر پر آ گیا تھا۔مشرق وسطیٰ کے ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں بھی اس کا نظامِ صحت کمال کا تھا۔اس کے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں علاقے میں بہترین خیال کی جاتی تھیں۔بے غیرت لوگ سیال سونے کی دولت سے مالا مال مُلک جسے دُنیا کا غریب ترین مُلک بنادیا گیا۔"

اُس کی آواز میں مجھے اب زیادہ بھراہٹ محسوس ہوئی تھی۔

سوال ذہن میں کنکری کی طرح چُبھ رہا تھا کہ "چلو صدام تو اقتدار میں تھا۔غریب لوگوں کی کیا خطا؟ وہ بیچارے نہ تین نہ تیرہ میں۔انہیں کس بات کی سزا دی گئی؟ کہاں ہیں ان کے انسانی حقوق؟"

کوئی چالیس کے پیٹے میں بڑی سنجیدہ اور مدبّر سی شخصیت نے نام جنکا مقتدیٰ الصدر آبائی شہر موصل تھا نے متانت سے کہا۔"دراصل امریکہ کے پاس کوئی آپشن نہیں تھی۔انہیں صدام کے سوا کوئی موزوں بندہ نظر نہیں آتا تھا۔امریکہ کی یہ کمزوری حکمرانوں کو بھی سمجھ آ گئی تھی۔بنیادی سہولتوں کی فراہمی کیلئے غریب عوام حکومت کی اور محتاج ہوکر رہ گئی تھی۔یوں اُس ظالم کی گرفت اور تکبر اپنی انتہاؤں کو چھونے لگا۔اس ضمن میں ایک چھوٹا سا واقعہ آپ کی دلچسپی کیلئے سناتا ہوں۔آپ کی مرحومہ وزیراعظم بے نظیر بھٹو الجزائر سے وطن واپسی پر صدام سے ملاقات کیلئے بغداد آئیں۔سفارتی آداب کو جانتے ہوئے بھی اِس متکبّر شخص نے انہیں کوئی پون گھنٹے انتظار کروایا تھا۔

مجھے تو سچی بات ہے یہ سُن کر صدمہ ہوا تھا۔

مقتدیٰ الصدر نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

جنوبی عراق میں حکومت کے خلاف ہونے والی سازشوں کا جس بے دردی سے گلا گھونٹا گیا اُس کے بارے میں تفصیلات رونگٹے کھڑے کرنے والی ہیں۔

شمالی عراق کے کردوں کو دم گھونٹ کر جس کیمیائی گیس سے ہلاک کیا گیا۔اُس گیس کو تیار کرنے والے کیمیائی ہتھیار صدام کے پاس کس نے بیچے اور کیوں بیچے؟اب زہریلی گیس بنا کر اُس نے اپنے مخالفوں کے گلے تو گھونٹے تھے۔عراق کے کُردوں کیلئے پریشانی اور دُکھ کا اظہار بھی ہونے لگا۔اس امریکہ اور اس کے اتحادی کا تو وہ حال ہے چوروں کو کہتے تھے نقب لگاؤ اور لوٹ لو اُن کا سب کچھ اور سنتریوں سے کہتے ہیں ما نجاروں جاگو تم تو لٹ گئے۔''

میں نے لمبی سانس کھینچ کر اپنے آپ سے کہا تھا۔ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات۔کوئی پوچھے نیویارک میں جڑواں ٹاورز کا ڈرامہ (اگر وہ ڈرامہ نہیں) تب بھی اُس پر حملہ کرنے والے سب سعودی تھے۔عراقی تو ایک بھی نہ تھا۔مگر سعودی عرب کیلئے باز پرس نہیں۔

''آپ لوگ سمجھتے ہیں صدام امریکی ایجنٹ تھا۔''

دو نے کہا ''سو فی صد تھا۔بقیہ کا کہنا تھا۔''امریکہ سُپر پاور ہے۔دُنیا کے حکمران اس کے ایجنٹ ہیں۔کویت پر حملہ امریکہ کی مرضی کے مطابق ہوا۔''

کلین شیو پر چھوٹی چھوٹی مونچھوں اور ذہانت سے بھری چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا کامل مغیر بولنے لگا تو مجھے محسوس ہوا جیسے اِس چہرے کے پیچھے ہمارا حسن نثار ہے۔دوسری اور تیسری دنیا کے ممالک اور ان کے احمق اور حرص وہوس کے مارے حکمرانوں کے چیتھڑے اڑاتا ہوا۔تاریخ سے گہرے شغف اور عبور کی صورت اُس کے ہاتھ میں پکڑے اُس ریموٹ

کنٹرول جیسی ہی تھی کہ جس سے وہ دنیا کی سکرین پر بٹن پر بٹن دباتے ہوئے منظروں کو بدلنے پر قادر تھا۔اسرائیل کے قیام سے مشرق وسطیٰ کی سیاست کے بکھرے ہوئے تارو پود کے اُتار چڑھاؤ۔ایران میں مصدق کی برطرفی سے ابتک کی صورت، پاکستان میں مارشل لاؤں کی پشت پناہی، بے گویرا بھٹو کی پھانسی کا ذکر مغیر نے جس انداز میں کیا۔متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ میری آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ایسٹ تیمور کیلئے سپر پاور کی ممتا کا پھٹنا،افغان جنگ کے ہیرو پھر زیرو،القاعدہ کی تخلیق۔بخیے اُدھیڑ دیئے تھے امریکہ کے تو۔

پھر مشرق وسطیٰ کے حکمرانوں کے ساتھ ساتھ پاکستان ہندوستان پر بحث ہوئی۔یہاں مغرب کے لوگوں کی انسان دوستی، اُن کا احتجاج اور ان کے رویئے سامنے آئے۔ٹونی بلیئر، اٹلی کے برکونی اور اسپین کے ایزناز پر طعن طعن کرنا، کھلے عام نعرے، مفادات کی لڑائی، طاقت ور کی طرف سے جنگ، نہ انصاف نہ امن۔ان کے پیش نظر عراقی عوام اور معصوم بچے تھوڑی تھے۔کچھ ایسے ہی جذبات کا اظہار مشرق وسطیٰ، مشرق بعید، انڈونیشیا اور ملائشیا حتیٰ کہ انڈیا تک کے لوگوں نے کیا۔

یہ لوگ احتجاج کے لیے سڑکوں پر اس لیے نکلے تھے کہ تیل کی دولت سے مالا مال عرب دُنیا پر سامراجیوں کو مزید دولت سمیٹنے کا موقع نہ ملے۔

سعودی عرب، اُردن اور مصر کے سربراہوں کے بدترین کرداروں اور رویّوں پر بحث ہوئی۔

دُنیا کی سُپر پاور۔بے غیرت اور جھوٹ کی پنڈ۔حملے کیلئے بہانے کیسے جھوٹے گھڑے؟صدام نے کیمیائی ہتھیار تلف کر دیئے تھے اس میں کوئی شک نہیں تھا۔اس کا اعتراف بھی ہوگیا مگر وہ بش کا پلا ٹونی بلیئر اپنی سوانح حیات میں بکواس کیئے چلا جاتا ہے۔ملک تباہ کر دیا۔اُسکے ہزاروں لاکھوں معصوم شہریوں کو بھینٹ چڑھادیا۔اب ٹونی بلیئر

اور ڈک چینی اپنی یادداشتوں میں اپنی غلطیوں کا جواز پیش کرتے ہیں۔لعنت ہے اِن پر۔وہ واہیات ڈبلیو بش کا منہ چڑھا ڈپٹی چیف اف سٹاف کارل رو Karl Rove نے کس قدر نخوت سے کہا تھا۔

ہم ایک ایمپائر ہیں اب۔جب ہم کوئی کام کرتے ہیں ہم اس کے ہونے کا جواز پیدا کر لیتے ہیں۔اور جب دنیا ہمارے اِس جواز پر غور وخوض کر رہی ہوتی ہے۔ہم نئی ترجیحات کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ہم تاریخ کے اداکار ہیں اور تم سب لوگ(یعنی باقی دنیا)صرف یہی جاننے میں لگے رہتے ہیں کہ ہم کر کیا رہے ہیں؟

یاس بھری لمبی سانس لیتے ہوئے مجھے وہ وقت یاد آیا تھا جب تکبر اور نخوت سے بھرے اس بیان کو میں نے غالباً ''دی نیوز''میں پڑھا تھا۔

موجودہ حکومت کے بارے میں پوچھا۔

''دلال ہیں اُنکے۔کسی نے بیچ میں سے لقمہ دیا۔جو چلا گیا وہ بڑا تھا۔یہ ذرا چھوٹے ہیں۔''

''عراق کا مستقبل کیا ہوگا؟''یہ سوال میں نے کیا تھا اور ڈرتے ڈرتے کیا تھا کہ اگر انہوں نے جواباً مجھ سے پوچھ لیا کہ پاکستان کے بارے میں کیا کہتی ہیں؟تو کیا کہوں گی۔میرے سامنے تو اندھیرے تھے۔اُمید کی کوئی کرن نہیں تھی۔اور یہاں بھی مجھے تاریکی ہی نظر آتی تھی۔

جنگ کے بعد ہمیں ایک موہوم سی اُمید تھی کہ شاید امریکہ عراق کو جاپان جیسی حیثیت دے دے۔یقیناً ایسی صورت میں اُس کے سارے خون معاف ہو سکتے تھے۔بات ابھی جاری ہی تھی جب ابوالمنیب نے اُسے کاٹتے ہوئے کہا۔''ہم لوگ جذباتی باتیں کرتے ہیں۔ہمیں جمہوریت راس آئی نہیں۔ہم متحد ہوئے نہیں۔حکمرانوں میں اتنی اہلیت ہی نہیں

کہ وہ خود کو ثابت کر سکیں ۔جاپان کیا ساؤتھ کوریا بھی ہمارے سامنے ہے جو تقسیم کے باوجود ایک بڑی اقتصادی طاقت بن کر سامنے آیا ہے۔یہ غیر مسلم ممالک تھے۔ہم مسلمان ہیں۔افغانستان کو دیکھ لیں۔کچھ کہنے کی ضرورت ہے کیا۔فوج کے چند سینئر افسران کو اگر خریدا گیا تو وہیں ایک عنصر نے اسی سوچ کے تحت کچھ زیادہ مزاحمت بھی نہیں کی تھی وگرنہ قبضہ اتنا آسان بھی نہ ہوتا۔کاش یہ سب نہ ہوتا اِس جنگ نے مذہبی انتہا پسندوں کو اُبھارا۔ایران کو عراقی شیعاؤں کے طاقت میں آنے سے تقویت ملی۔اس وقت تک حالات مایوس کن ہیں۔شیعہ سُنی عنصر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے میں مصروف ہیں۔اور سامراج کے سارے راستے آسان ہوتے جارہے ہیں۔''

قہوہ بڑا کسیلا سا تھا۔ایک گفتگو کا کسیلا پن اور تلخی۔اُوپر سے گرمی موسم اور ستم بالائے ستم قہوے کی کڑواہٹ جو دو چینی کے چمچوں کے بعد بھی قائم تھی ۔

دوپہر کا کھانا کینٹین سے کھایا۔اُبلے چاول اور پتلا سا شوربہ۔

باب نمبر:11

1۔ روشن نظر، روشن فکر، دنیائے اسلام کے ایک عظیم فقیہہ امام ابوحنیفہؒ جن کی حق گوئی و حق پرستی باعث مثال تھی۔

2۔ بغداد کی وہ مثال کہ اینٹ اٹھاؤ تو نیچے سے عہد ساز صاحب علم و فن ہستیاں برآمد ہوتی ہیں۔

3۔ ڈاکٹر قاسمی نے امریکہ سے کہیں زیادہ عرب ممالک کے لئے لیئے۔ ضیاالحق پر اُن کی تنقید بڑی تند و تیز تھی۔

میرا بچپن تضادات کے ماحول میں گزرا تھا۔ سارا گھر عجیب چوں چوں کا مربہ سا تھا۔

ننہال مسلک کے اعتبار سے پکا پیٹھا وہابیت کا علمبردار، کمبخت مارا منشی عالم اور منشی فاضل کی سان پر چڑھا ہوا، تنگ نظر پر لڑکیوں کی نوعمری میں شادیوں کی بجائے اُن کی اعلیٰ تعلیم کا سرگرم حامی۔ اِس خاندان کی لڑکیوں کیلئے موٹے ڈوپٹے اوڑھ کر ایم اے، ایم ایس سی کرنا تو جیسے کھیل تماشے والی بات تھی۔

نوائے وقت گھر میں آئے تو اشتہاروں والا صفحہ غائب ہو جائے کہ لڑکیاں فلموں کا نام نہ پڑھیں اور لڑکیاں ایسی چالاک ، ٹرانٹ اور گھنیاں سی کہ اُنہیں فلمی ستاروں کے ہر ہر سکینڈل کا علم ۔صبیحہ خانم اور سنتوش کمار کا عشق کس مرحلے میں ہے؟ پہلے بیٹے کی ولادت اور شادی کا حساب کتاب سب انگلیوں پر۔ درپن شمیم آرا کی بجائے نیر سلطانہ میں دلچسپی

لے رہا ہے۔نیلو کا مسئلہ کیا ہے؟

چھوٹے بڑوں پر نماز روزے کی سختی اور زبردستی کے مظاہرے عام۔نماز کی ذرا سی کوتاہی پر صلواتیں۔کسی مجبوری پر روزہ نہ رکھنے پر لعن طعن کا ہونا ضروری۔مگر اِن کے ساتھ ساتھ پسندیدہ موضوعات،سیاست پر تبصرے، اُن پر حاشیہ آرائیاں،سعدی کی حکایات،اقبال،حافظ اور مولانا رومی کے اشعاروں کے حوالے اور اُن کے برلب زبان رہنے کو بھی انتہائی پسندیدہ سمجھا جاتا تھا۔

کارل مارکس کو میں اپنے بچپن سے جانتی تھی۔صرف کارل مارکس ہی نہیں لینن اور اینگلز سبھوں سے متعارف تھی۔وجہ اتنی سی تھی کہ اُس لمبے چوڑے وسیع وعریض گھر میں میرا ایک خالو پکا سوشلسٹ تھا۔

میں مذہبی معاملات میں ہڈ حرام اور قدرے باغی سی تھی۔نماز کیلئے مصلّے پر ڈر کے مارے کھڑی ضرور ہوتی پر اگر موڈ نہ ہوتا تو کبھی نہ پڑھتی۔روزے رکھتی اور سکول جا کر توڑ لیتی۔سر پر دوپٹہ لے کر کالج جاتی اور وہاں گلے میں ڈالے گھومتی پھرتی۔جب ڈھاکہ یونیورسٹی گئی تو ساڑھیوں اور سلیولیس بلاوز پہننے کے بھی شوق اور ارمان پورے کیے۔

ہاں پر جب ماں بنی تو بچوں کیلئے دعاؤں نے اس شُتر بے مہار کی ناک میں نکیل ڈال دی تھی۔اُن کیلئے تندرستی اور درازیٔ عمر کی طلب نے سجدوں کو طویل اور رقّت بھرا بنا دیا تھا۔

یوں یہ بات ضرور تھی کہ اُس گھر میں نظریاتی رواداری بھی تھی اور برداشت بھی کہ میرے اُس سوشلسٹ خالو کی "شامیں داس کیپٹل " اور اسلام کے موازنوں میں گزرتیں۔صبحوں کا آغاز ریڈیو سیلون کے گانوں سے ہوتا۔سارے گھر میں "مجھے گلے سے لگالو کہ بہت اُداس ہوں میں" جیسے نغمے گونجتے۔

ایک بار تھوڑی ہزاروں بار یہ سُنا تھا۔ہم حنفی مسلک سے ہیں ۔حنفیوں کی خصوصیات کیا ہیں؟ جانے میری بلا ۔

پر اب بغداد آ گئی تھی کاظمین والے اماموں کی زیارتوں سے مستفید ہو گئی تھی ۔اب امام ابوحنیفہ کی ہڑک اٹھی تھی اور خدا گواہ ہے کہ اس میں اُس لعن طعن اور طعنوں کا خشخاش جتنے دانے برابر ہاتھ نہ تھا کہ جو میری چچی + خالہ نے میرے عراق جانے کا سُن کر کہا تھا۔

''ویسے تو تم پوری مُرتد ہو۔کہنا سُننا فضول ہے پر امام اعظم کے روضہ مبارک پر حاضری دے دینا۔''

میری یہ خالہ + چچی ذرا سی لبرل ہیں۔بقیہ کچھ خاندان تو سعودی عرب والوں کیطرح ان ہستیوں کی درگاہوں پر جانے کو ہی بدعت خیال کرتا ہے۔

اور عراق پر کچھ نہ کچھ پڑھنے کے چکروں میں امام بھی زد میں آ گئے تھے۔پڑھا تو دنگ رہ گئی۔کتنے گوشے ایسے تھے کہ جن پر بے اختیار زبان سے سبحان اللہ نکلا تھا۔

میں تو سچی بات ہے اپنی ہر صبح کا آغاز ایسی ہی مقدس جگہوں سے کرنا چاہتی تھی ۔پر افلاق کا کہنا تھا کہ جب تازہ دم ہوں تو چلنے کا کام بھگتائیں تھکیں تو پھر ایسے مقدس مقامات پر آجائیں۔

موسم کی تلخی میں کمی ،پرسکون ماحول میں آرام ،زیارت نماز نفل وغیرہ سبھوں کی حُسن وخوبی سے ادائیگی ہوجاتی ہے ۔یہ بات عملی طور پر صحیح ثابت ہوئی تھی ۔

تو آج دوپہر اُس ہستی کیلئے تھی جسے دُنیا ایک عظیم فقیہہ کے نام سے جانتی ہے ۔جس کی حق گوئی و بیباکی قابلِ مثال تھی ۔جسکے مسلکی پیروکار دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔

کہیں بھی جانا ہو۔دجلہ کا دیدار تو سانس لینے کی طرح ضروری ٹھہرتا ہے۔دونوں کنارے بڑے معتبر کہ دو جید عالم داہیں بائیں آرام فرماتے ہیں۔اعظمیہ اور کاظمیہ مشرقی اور مغربی بغداد کو ملانے والا پُل ایمہ Aimma برج کے نام سے بھی مشہور ہے۔

عمارتوں، درختوں، دجلے کے پانیوں پر بہتے دوپہر کی تیز دھوپ کے سنہری رنگوں سے لُطف اندوز ہوتے گاڑی ایک وسیع میدان میں رُک گئی۔ایک خوبصورت دیدہ زیب مسجد جسکے عین اوپر راڈوں میں پھنسا اللہ اور نیچے محمدؐ اُس عظیم امام کے مسلک کا عکاس تھا۔مسجد کی خوبصورتی اور رنگ آمیزی میں متانت اور سنجیدگی پنہاں تھی۔عظیم الشان بلندوبالا چوبی کندہ کاری سے آراستہ دروازے پر وردیاں پہنے فوجی بیٹھے تھے۔زنانہ حصّے میں چیکنگ کے بعد اندر وسیع وعریض صحن میں داخلہ ہوا۔اُس وقت میرے مُوموُ میں شکر گزاری تھی۔

دادا زوطی ایران کے آتش پرستوں کی اولاد تھا۔اسلام قبول کیا تو ایران میں رہنا مشکل ہوگیا۔حضرت علی سے خصوصی محبت کی بنا پر کوفے آگئے۔

یہاں شادی کی۔بیٹا ہوا۔ثابت نام رکھا۔دعائے خیر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کی۔ثابت کے ہاں اِس گوہر آبدار کی آمد ۸۰ھ میں ہوئی۔نام نعمان اور کنیت ابوحنیفہ تھی۔

مسجد کی کشادگی آنکھوں کو اچھی لگی تھی۔سامنے والے رُخ سے نظر آنے والا چہار پہلو مینار اپنی نقاشی اور زیبائش کے اعتبار سے بڑا خوبصورت نظر آیا تھا۔بمباری سے مسجد کا داہنی سمت والا مینار متاثر ہوا تھا۔

''اِن کا خانہ خراب ہو۔کل آنے والا اِن کے مقدر کا زوال انہیں آج ہی آجائے۔''

جاہل عورتوں کیطرح کوسنے میری زبان پر تھے۔بیرونی حصّے میں اور اندر بھی

مرمت و تزئین کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ آرائش اور زیبائش میں شوخی نہیں تھی۔ ایک گھمبیرتا کا احساس ملتا تھا۔ دیواریں صرف اللہ کے خوبصورت ناموں سے سجی ہوئیں۔ پوری مسجد میں خوبصورت قالین بچھے ہوئے تھے۔ لطیف سی خنکی تھی۔ عمارت ایرکنڈیشنڈ ہے اور ہر مسجد کی طرح خواتین کا حصہ الگ۔

مزارِ مقدسہ بہت پُر نور اور ایک گوشے میں تھا۔ آئینہ کاری میں بھی بہت بھرمار نہیں ہے۔ نفاست اور قرینے کی جھلک ہے۔ چاندی اور لکڑی کی کندہ کاری سے سجی جالی سے اندر جھانکا۔ لگا جیسے آنکھیں شہد کے ساتھ چپک سی گئی ہیں۔ ایک نہیں دو یادیں حافظے کی سطح پر نمایاں ہو کر سامنے آ گئی تھیں۔ تیز چھناکے سے ایک منظر یادداشتوں میں اُبھرا تھا۔

گلبرگ کا کوئی اٹھ کنال کے رقبے پر پھیلا ہوا گھر تھا جہاں امریکہ سے آئی ہوئی ایک مشہور سکالر لیکچر کیلئے مدعو تھی۔ چاندنی کیطرح جھلملاتی لو دیتی روشنی میں اندر دیکھتے ہوئے اُس صاحبِ علم خاتون کے الفاظ سماعتوں سے ٹکرائے تھے جو اس نے عورتوں کی محفل میں باتیں کرتے کرتے دفعتاً کہے تھے۔

''مسلمان عورت کو محسنِ انسانیت کے بعد امام ابوحنیفہ کا ممنون ہونا چاہئے۔''

کونے میں سے ایک شیریں آواز اُبھری تھی۔

''رُکیے۔ آگے بڑھنے سے قبل کسی ایک واقعے کی تفصیل بتائیے۔''

مجھے یاد ہے میں نے رُخ پھیر کر دیکھا تھا ایک خوبصورت لڑکی اپنی سرمگین آنکھوں میں عقیدت و احترام کی لویں دہکائے کچھ جاننے کیلئے مضطرب نظر آتی تھی۔

اور تفصیل کیلئے بغداد شہر بسانے والے عباسی خلیفہ کے محل جانا پڑا تھا۔ خاتون بڑی کامیاب داستان گو تھی۔ مدینۃ المنصور میں خلیفہ کے شاندار محل کی تفصیلات،

بالکونیوں کا دجلہ کی طرف کھلنا، دجلے کی پُراثر ہواؤں، اس کے پانیوں پر تیرتی کشتیوں اور سامنے مشرقی کنارے کی سمت عسکر المہدی کی عالی شان عمارتیں اور کھجور کے درختوں کا حُسن پچیس تیس عورتوں کا مجمع سحرزدہ سا سُنتا تھا۔

دونوں میں تلخی بڑھ گئی تھی۔حرہ خاتون خلیفہ منصور کی بیوی کو شکایت تھی کہ منصور کسی ایسے فیصلے کا مجاز نہیں جو شرعی لحاظ سے قابلِ قبول نہ ہو۔

جھنجھلا کر خلیفہ نے کہا تھا ''تم ضدی عورت کبھی نہیں مانو گی چلو کسی مفتی، کسی مُنصف کو بلاتے ہیں۔تب شاید تمہیں یقین آجائے۔''

حرہ خاتون نے حتمی لہجے میں کہا تھا۔

''مُنصف تمہارا نہیں میرا تجویز کردہ ہو گا۔امام ابوحنیفہ کو بلاؤ۔''

منصور یکدم خاموش ہو گیا تھا۔صادق القول، نہ بکنے، نہ جھکنے، نہ مرعوب ہونے، حق سچ پر استقامت سے کھڑا ہونے والا،حد درجہ بے باک انسان۔بھلا منصور سے زیادہ کون جانتا تھا کہ عباسیوں کے ظلم و ستم کے خلاف آواز اُٹھانے اور منصور کے مقابلے پر 541ھ میں محمد نفس ذکیہ نے ایک بڑی جمعیت تیار کی۔امام ابوحنیفہ کی بھی انہیں مکمل حمایت و تائید حاصل تھی۔امام مالکؒ نے بھی خلافت کیلئے محمد نفس کے حق میں فتویٰ دے دیا۔محمد نفس ذکیہ جی دار اور دلیر تھے پر فن جنگ میں طاق نہ تھے۔شہید ہو گئے۔اب قیادت کا باران کے بھائی ابراہیم نے اُٹھالیا۔اُن کی تیاریوں کا اِس درجہ چرچا تھا کہ منصور کی نیندیں حرام۔ دو ماہ تک کپڑے نہیں بدلے۔بستر پر لیٹتا۔پل بھر بعد تکیہ اٹھا کر پائنتی پر مارتا پھر سرہانے پھینکتا۔ایک ہی رَٹ تھی۔ابراہیم کا سر میرے سامنے ہو یا میرا سر ابراہیم کے سامنے بس اور کچھ نہیں۔

امام ابوحنیفہ نے ابراہیم کے جذبۂ جہاد کی نہ صرف زبانی حوصلہ افزائی کی بلکہ عملی

مدد چار ہزار درہم بھیج کر کی ۔خط بھیجا کہ تمہارے شانہ بشانہ اس جہاد میں حصہ لینے کیلئے بے تاب ہوں پر چند ناگزیر مجبوریاں پاؤں کی بیڑیاں بن گئی ہیں ۔لوگوں کی بہت قیمتی امانتیں میرے پاس ہیں۔

منصور کو اِن سب باتوں کا علم تھا۔میدان جنگ میں گو اُس نے ابراہیم کو شکست دی پر بہت سارے ذرائع نے امام ابوحنیفہ کے دلی دُکھ کے برملا اظہار کو مرچ مسالوں کے ساتھ یوں پیش کیا کہ کاش میں بھی اُس جماعت میں شامل ہوتا جو ظلم کے خلاف حق و انصاف کے لیے جہاد کر رہی تھی ۔

اور آج اُن کی بیوی اُسی انسان کو مُنصف چاہتی ہے ۔

چند لمحوں تک تذبذب اور گومگو جیسی کیفیت میں رہنے کے بعد منصور نے سر اُٹھایا، بہتر کہا اور اُسی وقت انہیں طلب کیا۔ملکہ حرہ خاتون نے اپنی نشست پردے کے قریب رکھی تا کہ خود اپنے کانوں سے امام ابوحنیفہ کا فیصلہ سُن سکے۔

''شرعی اعتبار سے ایک مرد کتنے نکاح کرسکتا ہے؟''

منصور نے سوال کیا تھا۔

''چار۔''امام کا جواب مختصر تھا۔

منصور نے اپنا رُخ بدلا ۔پردے کے عقب میں بیٹھی بیوی سے مخاطب ہوا۔

''سُنتی ہو۔''

حرہ خاتون نے دھیمی آواز میں سُننے کا اقرار کیا۔

منصور خاموش ہوگیا ۔اُس کے نزدیک تو مسئلہ ہی ختم ہوگیا تھا۔

''لیکن''

امام کی باوقار آواز سے ماحول کا سکوت ٹوٹ گیا۔

بیشک اسلام میں چار نکاح جائز ہیں ۔مگر اجازت اُس شخص کیلئے جو عدل وانصاف پر قدرت رکھتا ہو،وگرنہ ایک سے زیادہ شادیاں مناسب نہیں ۔اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔''

یہ واضح اور مکمل جواب تھا۔

منصور نے اب سر جھکا دیا تھا۔

آپ نے اجازت طلب کی اور گھر آ گئے۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ حرہ خاتون کا ایک خادم پچاس ہزار درہم لے کر حاضر ہوا۔

''خاتون نے نذر بھیجی ہے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ کنیز آپ کی حق گوئی کی انتہائی مشکور ہے۔''

آپ نے وہ رقم واپس کرتے ہوئے فرمایا۔

''خاتون سے کہنا کہ میں نے جو کچھ خلیفہ کے سامنے بیان کیا وہ میرا فرضِ منصبی تھا۔اس میں کوئی غرض پوشیدہ نہ تھی۔''

مجمع میں سے ''سبحان اللہ'' کی چند آوازیں گونجیں۔کچھ مزید بتایئے اصرار ہوا تھا۔

امام اعظم کے نزدیک ایک بالغ عورت اپنے نکاح کی خود مختار ہے۔جبکہ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ عورت کو ولی کی محتاجی میں دیتے ہیں۔انہوں نے عورتوں کے بارے قرآن مجید کے اصول مساوات کو مدنظر رکھا۔

فقہ حنفی نکاح وطلاق اور دیگر بہت سارے معاملات میں عورتوں کی شہادت کو مردوں کی طرح معتبر قرار دیتا ہے۔

''مائی گاڈ اسلام کے یہ روشن رُخ ہمارے سامنے کبھی نہیں آئے ۔عورت کمتر ہے

اُسکی آدھی گواہی ۔نوجوان لڑکیاں زیادہ پر جوش تھیں ۔

امام کے نزدیک قصداً تارک الصّلوۃ کافر نہیں ۔ان کے نزدیک ذمّی (اسلامی ریاست کا غیر مسلم شہری) کا خون مسلمان کے خون کے برابر ہے۔کوئی مسلمان ذمّی کو قتل کرے تو مسلمان اس کے بدلے قتل کیا جائے گا۔

اُس وقت جب میں نفل پڑھتی تھی تو یہی سوچے چلے جاتی تھی کہ ہمارے جاہل ملاؤں نے اسلام کا خوبصورت چہرہ کتنا بھیانک بنا دیا ہے؟اس میں تو حد درجہ لچک اور گنجائش ہے۔

ظہر کی اذان ہوئی ۔مُومُو جیسے سرشار ہوا۔آواز کا اُتار چڑھاؤ ،سریلا پن سبھوں میں حسن و رعنائی تھی ۔عورتیں کوئی اٹھارہ بیس کے قریب آ ہیں ۔یہ سب قریبی محلوں کی تھیں ۔

میری تو کسری نماز تھی ۔چار سجدوں میں مک مکا گئی۔خواتین سے بات چیت کرنی چاہی تو زبان کا مسئلہ بیچ میں کھڑا ہوگیا۔ہم عورتیں بھی کمال کی چیز ہیں ۔راستے ڈھونڈنا جانتی ہیں ۔آنسوؤں اور مسکراہٹوں کا خوب چھڑکاؤ ہوا۔نصف سے زیادہ صدام کی حامی تھیں ۔اکثریت نے حالات کی سنگینی جیسے تاثر کو واضح کرنے کیلئے آنکھوں اور ہاتھوں سے ایسی تمثیل کاری کی کہ جس کیلئے کہا جائے کہ ٹھیک ٹھیک ٹھکانوں پر نشانے لگے۔مجھے ہسپتالوں کی حالت زار کی بھی سمجھ آئی ۔اقتصادی پابندیوں کا زمانہ کتنا بھاری تھا؟امریکہ کیلئے تبرّ وں کی بارش اور ہاتھ اٹھا کر جیسے انہوں نے کسی طوفانِ نوح میں اُسکی غرقابی چاہی میں سب سمجھی۔

میرے پاکستانی جاننے پر مجھے اپنے گھر لیجانے کی پیشکش کم و بیش سبھوں نے کی ۔وہ سُنّی مسلک سے تھیں کہ اس مسجد میں اُن کا آنا ہی سُنّی ہونے کی علامت تھی۔

ہاں ایک دلچسپ اور مزے کی بات بھی ہوئی ۔قالینوں پر ہم سبھی پھسکڑے مارے

بیٹھی تھیں۔عبایا کے نیچے میری شلوار کے پائینچے کہیں تھوڑا سا اوپر اٹھ گئے۔ٹانگوں پر بالوں کا جنگل سا دیکھ کر اُن سبھوں کے ہونٹوں سے ہنسی کے فوارے پھوٹے۔آنکھیں مٹکیں۔چہرے بولے کہ ''ہیں ہیں یہ کیا جنگلی پن ہے۔'' پھر بے تکلفی سے سیاہ عباؤں تلے سے اپنی لش لش کرتی گوری گوری گداز سڈول ٹانگوں کا نظارہ کروایا۔

''دیکھو دیکھو'' پھر چند ایک نے میری بھنوؤں کی طرف بھی اشارے بازی کی ۔میں نے بھنوؤں کے ساتھ زندگی بھر کبھی چھیڑ خانی نہیں کی۔حتیٰ کہ اپنی شادی والے دن بھی نہیں۔جاتے جاتے انہوں نے مجھے یہ دونوں نیک کام کرنے کی تاکید کی۔کچھ سمجھایا جو میں نے زبان نہ آنے کے باوجود سمجھا اور لُطف اٹھایا۔

ان کے جانے کے بعد میں نے فلافل کھایا، کولا پیا اور چاہا کہ تھوڑی دیر لیٹ جاؤں۔تبھی ایک ادھیڑ عمر کے انتہائی خوش شکل اور سمارٹ سی شخصیت کو میں نے تین نوجوانوں کے ساتھ اندر آتے دیکھا۔دیوار کی غربی سمت انہوں نے کچھ نشان دہی کرتے ہوئے اپنے ساتھ کھڑے نوجوانوں کو چند ہدایات دیں۔

یقیناً انتظامیہ کا کوئی اہم بندہ ہے۔'' میں نے خود سے کہا اور کھڑی ہوگئی۔

چند لمحوں کے انتظار کے بعد جونہی مجھے ان کی واپسی کا احساس ہوا میں نے فوراً آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروایا۔تصویریں بنانے کی اجازت مانگی اور اُن سے چند لمحے دینے کی بھی درخواست کی۔

یہ باوقار سی شخصیت ڈاکٹر قاسی کی تھی۔وہ روضہ مبارک کے منتظم اعلیٰ تھے۔مرنجان مرنج سی شخصیت۔سفید براق داڑھی، پُرنور چہرے سے ٹپکتی محبت اور متانت متاثر کرتی تھی۔خوبصورت انگریزی بولتے تھے۔مزار مبارک کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گئے۔

''آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

انہوں نے چہرہ اُٹھا کر مجھے بغور دیکھا۔چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اثبات میں سر ہلایا۔انکے قریب ہی بیٹھنے کی اجازت ملنے پر میں سامنے قالین پر بیٹھ گئی تھی۔

''کچھ روشنی ڈالیے۔کچھ بتایئے آپ کی نظر ان حالات کو کس تناظر میں دیکھتی ہے؟''

کاش میں اُن سے کچھ نہ پُوچھتی۔وہ پھٹ پڑے تھے۔

امریکیوں سے کہیں زیادہ وہ سعودی عرب، اُردن، مصر اور دیگر اسلامی ملکوں کی مفاد پرستیوں پر برہم تھے۔سعودی شاہوں کے وہ لتے لیے تھے انہوں نے کہ میں اُن کے لفظوں کو زبان ہی نہیں دے سکتی۔

کاش ڈوب مرنے کیلئے کوئی جگہ ہوتی۔جنرل ضیاالحق نے فلسطینیوں پر جو ٹینک توپیں چلائی تھیں وہ اُس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل سے آگاہ تھے۔پاکستان کے حکمران کو شرم آنی چاہیے تھی۔جی چاہا تھا سر پیٹ لوں۔ابھی تو یہ مقام شکر تھا کہ ڈالروں کے لالچ میں عراق فوجیں نہیں بھیجیں۔

شاید نہیں یقیناً یہ اُس وقت ابو معصب الزرقاوی کی خوفناک دھمکی تھی جو اسامہ بن لادن کا چہیتا ہونے کے ساتھ ساتھ آئی ایس آئی کا بھی محبوب تھا۔عراقی مزاحمتی گروپوں کے پس منظر میں زیادہ تر اسی گروپ کی توانائیاں تھیں۔جس نے قسم کھا کر پاکستان کو پیغام بھیجا تھا کہ اگر تمہاری فوجیں عراق آئیں تو میں ان کا وہی حشر کروں گا جو صومالیہ میں امریکی فوج کا کیا گیا تھا۔

افسوس صد افسوس یہی سب کچھ ہوتا ہے مسلمانوں کے ساتھ جو ہو رہا ہے۔یہ اُلو کا پٹھا صدام بوسنیا اور کوسوو میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم پر سربیا کے ملاسووچ کی حمایت کرتا تھا۔کبھی جو اُس کے پھوٹے مُنہ سے مقبوضہ کشمیر میں ہونے والے بھارتی مظالم

پر بھارت کی لعن طعن کے لیے چند لفظ نکلے ہوں۔افغانستان پر سوویت یونین کے قبضے پر حمایت ہوتی ہے۔ایران عراق اور خلیجی جنگ میں مرنے والے کون تھے؟مسلمان۔یہی ہونا تھا اس کے ساتھ جو ہوا۔عراق میں تباہی کے مناظر دیکھیں۔غریبوں کی لاشوں کی بے حرمتی۔خدا راضی ہو ہمارے نوجوان رضا کاروں سے جنہوں نے ان کی لاشیں کتے بلیوں سے محفوظ رکھیں۔

درمیانی عُمر کا ایک آدمی ان کے پاس آیا۔نیم الیستادہ ہو کر اُس نے دھیمی آواز میں کچھ کہا تھا۔

انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

''معذرت چاہتا ہوں۔انجینئر آیا ہے کچھ پوچھنا چاہتا ہے؟''

میں نے کھڑے ہو کر اُن کا شکریہ ادا کیا۔اور جب میں خاموش بیٹھی بظاہر محراب و منبر دیکھتی تھی۔دیواروں پر نظریں گھماتی تھی۔فانوسوں کی چمک دمک آنکھیں خیرہ کرتی تھی۔امام اعظم کی زندگی کے چند مزید گوشے سامنے آنے اور آنکھوں کو بھگونے لگے تھے۔

کوفے اور بصرہ کی ممتاز درسگاہوں سے حصول علم کے بعد مدینہ منورہ کا رُخ کیا کہ وہ شہر مقدس حدیث کا مخزن بھی تھا اور اس دلبر کی آخری آرام گاہ بھی۔

یہاں علم کے دریا نہیں سمندر بہہ رہے تھے۔حضرت عطا ابن ابی رباح کی خدمت میں حاضر ہوئے۔انہوں نے عقیدہ دریافت کیا۔جواب دیا۔میں اسلاف کو بُرا نہیں سمجھتا۔گناہ گار کو کافر نہیں کہتا اور قضا وقدر کا قائل ہوں۔

جب یہ پڑھا تھا تبھی بات قربان ہونے کو جی چاہتا تھا۔واہ کیسی روشن خیالی تھی۔یہاں ہمارے مولوی اور علماء حضرات کہ جو دین کو گھر کی لونڈی سمجھتے ہیں۔جسے چاہیں پل بھر میں کافر قرار دے دیں اور جسے چاہیں مسلمانیت کی سند عطا کر دیں۔دین پر اُن کی اور

اسکے نظریات کی اجارہ داری۔

خلیفہ منصور نے بغداد کی بنیاد رکھی تو اپنی پوری مملکت سے نامِ گرامی کاریگر ماہر تعمیرات اور جید ریاضی دان بلوائے کہ عمارتیں اصول ہندسہ کے مطابق تعمیر ہوں۔ان ماہرین کا افسرِ اعلیٰ امام ابوحنیفہ تھے۔امام اعظم نے ایک ایک اینٹ شمار کرنے کی بجائے لکڑی کے لمبے پیمانوں سے اینٹیں ماپنے کا طریقہ رائج کیا۔بعد میں اُنکا یہی طریقہ رائج ہوا۔

مدینہ منورہ میں اُس وقت حدیث وفقہ میں کمال حاصل کرنے والے صرف دو افراد زندہ تھے۔ایک سلیمان اور دوسرے سالم بن عبداللہ۔اِن دونوں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے علم میں نئے باب کے اضافے کیئے۔

امام اعظم کے بارے میں ایک بات مشہور تھی کہ دین میں نئی نئی باتیں نکالتا ہے۔

مدینہ منورہ میں امام باقر بھی آپ کے بارے میں ایسی باتیں سُن چکے تھے۔ایک بار اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔تعارف کے مرحلے سے گزرے۔انہوں نے بغور انہیں دیکھا پھر فرمایا ''تو اچھا تم ہو ابوحنیفہ۔وہی ابوحنیفہ نا جو قیاس کی بنیاد پر ہمارے بڑوں کی حدیثوں سے اختلاف کرتا ہے۔''

آپ نے انتہائی ادب سے جواب دیا۔

''معاذ اللہ حدیث کی مخالفت میں کیسے کرسکتا ہوں۔اگر آپ اجازت دیں تو کچھ پُوچھنا چاہتا ہوں؟''

حضرت امام باقر نے رضامندی کا اظہار کیاتو آپ نے سوال کیا۔

''مرد ضعیف ہے یا عورت۔''

''عورت''

حضرت امام باقر کا جواب تھا۔

''وراثت میں مرد کا حصّہ زیادہ ہے یا عورت کا۔''

آپ کا دوسرا سوال تھا۔

''مرد کا۔''

امام باقر کا جواب تھا۔

''اگر میں اپنے قیاس کا سہارا لیتا تو یہ کہتا کہ عورت کا زیادہ حصّہ ہونا چاہیے کیونکہ ظاہری قیاس کی بنیاد پر ضعیف اِس رعایت کا زیادہ حق دار ہے۔''

امام باقر نے فرطِ مسرت سے آپکی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور طویل عرصہ اپنے ساتھ رکھا اور حدیث وفقہ کے سلسلے میں بہت سی نادر معلومات دیں۔

پھر اُٹھی اور جالیوں سے لگی۔ اُنہیں دیکھنے کی کوشش کی۔ میں نے خود کو سُناتے ہوئے کہا تھا تو یہاں وہ شخص آرام فرما ہے جس نے جابر سلطان کے سامنے ہمیشہ کلمہ حق کہا۔ منصور نے آپ کو قاضی کے عہدے کی پیش کش کی۔ معذرت کرتے ہوئے کہا۔''میں اِس ذمہ داری کا بوجھ اُٹھانے کا اہل نہیں۔'' منصور نے طیش میں کہا۔''تم جھوٹ بولتے ہو۔'' امام جواب دیتے ہیں۔''جھوٹا شخص قاضی جیسے منصب کا اہل نہیں ہوتا۔''

پیشے کے اعتبار سے آپ کپڑے کے بہت بڑے تاجر تھے۔ ریشمی کپڑا خز بناتے بھی تھے۔ مختلف شہروں اور ملکوں میں اُن کا کاروبار تھا۔ عام لوگوں سے میل ملاقات کے مواقع کثرت سے ملتے تھے۔ اسی لیے لوگوں کی روش، ان کے عمومی رویئے، ان کی ضروریات، ان کے معاشی اور معاشرتی مسائل اور تقاضے وہ اُن سے ذاتی طور پر آگاہ رہتے تھے۔ اسی لیے مجتہد مسائل میں عوامی رجحانات اور فطری مزاج کے مطابق فیصلے دیتے تھے۔ اِس غرض کیلئے اُن کے ہاں مجلس مشاورت تھی۔ مجلس کے سامنے مسئلہ پیش ہوتا۔ بعض

اوقات اُس پر ہفتوں بحث ومباحثہ چلتا۔طویل بحث کے بعد جس بات پر سب کی رائے متفق ہوتی اُسے امام ابو یوسف کتاب اصول میں درج کرتے۔

امام اعظم اپنے اراکین بورڈ کی باقاعدہ فکری تربیت اور رہنمائی بھی کرتے۔یہ اُس تربیت کا نتیجہ تھا کہ فقہا کی ایک جماعت تیار ہوگئی۔فقہ حنفی کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ تھی کہ اِن ائمہ کے مختلف اذہان سے جب ایک مسئلہ منقح ہوکر نکلتا تو اُس کی حیثیت فردِ واحد کی سوچ اور فکر سے مختلف ہوتی۔قرآن حکیم میں ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کی وسعت سے زیادہ احکام کا بار اُس پر نہیں ڈالا بلکہ وہ انسانوں کیلئے تنگی اور عسرت کو نہیں آسانی کو پسند کرتا ہے۔

کاروباری اصول اور دیانت آج کے چوراچکّے راتوں رات امیر بننے کے خواہاں تاجروں کیلئے لمحہ فکریہ ہے۔ایک دن ایک عورت ایک قیمتی تھان لائی۔اُس نے اُسے فروخت کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔آپ نے قیمت دریافت کی۔خاتون نے سو درہم بتائے۔آپ نے فرمایا۔''کپڑا تو بہت قیمتی ہے دام کم کِس لیے کہتی ہو؟''خاتون بولی۔''چلیے دو سو درہم سمجھ لیجیے۔'' آپ نے کہا۔

''خاتونِ محترم اِس کی قیمت کسی طرح بھی پانچ سو درہم سے کم نہیں۔''

عورت پریشان ہکا بکا۔''آپ مذاق کررہے ہیں''۔اُس نے کہا۔

''ہرگز نہیں۔میں خرید لیتا ہوں اِسے۔''

پانچ سو درہم اس کے حوالے کیے۔

اصول تو ایسے ہی تھے۔ان کے ہاں گھاٹے کا کوئی سوال نہ تھا۔

کاروبار روز افزوں عروج پر ہی رہا۔نیت نیک تھی نا۔

جب افلاق کے ساتھ باہر آئی بیرونی دیوار کے حُسن کو رُک کر چند لمحے دیکھتی رہی۔بڑے اور چھوٹے دروازوں کی خوبصورتی کو بھی سراہا۔

کافی دیر اردگرد کے جائزے میں گزاری۔ یہ محلّہ ان کے نام نامی پر محلّہ حنیفہ کہلاتا ہے۔ ملحقہ ایک بہت بڑا اسکول بھی ہے۔ سکول سلجوقی بادشاہ ملک ابو سعد الخوارزمی نے ۱۰۶۶ میں تعمیر کروایا۔ مزار کا گنبد بھی انہی کی یادگار ہے۔

رخصت ہونے سے قبل میں نے بہت دھیمے سے جیسے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''میرے بہت پیارے امام اعظم یہ بندی آپ کی بہت شکر گزار ہے۔''

میں نے اُس عظیم ہستی کو خراج پیش کرتے ہوئے عمارت کے حسن کو پھر دیکھا تھا۔ تاریخ بغداد میں یہ واحد عمارت ہے جو بغداد شہر کے عروج و زوال کے المیوں کے باوجود ابھی تک اپنی پوری استقامت سے کھڑی ہے۔ ہلاکو خان کے ہاتھوں سے بچی۔ نادر شاہ نے بغداد پر حملے کے دوران خود اس کا خیال رکھا۔ اسے سلاطین عثمانیہ نے سنوارا۔ اسے جابر صدام نے بھی نوازا۔ وسیع، عریض مسجد کے خوبصورت قالین اسی کی طرف سے بچھائے گئے تھے جو ابھی بھی اُس کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔

اِس مردِ حق کو منصور نے جیلوں میں رکھا۔ بیڑیاں پہنائیں۔

وہ رات بھی تاریخ کے سینے پر نقش ہے جب منصور نے آپ کو زہر دیا تھا۔

اُس سیاہ رات کے پہلے پہر اگر علم کا ایک دروازہ بغداد کے بندی خانے میں بند ہو رہا تھا تو دوسرا دروازہ رات کے آخری پہر بیت المقدس کے قریب ایک خوبصورت بچے امام شافعی کی صورت میں کھل رہا تھا۔

ہوائیں ابھی بھی گرمی سے لدی پھندی تھیں۔ البتہ دھوپ کے رنگ سونے میں گھل گئے تھے۔ عمارتوں، گھروں اور کھجور کی چوٹیوں پر بکھرا یہ سونا ماحول کو عجیب سی فسوں خیزی دیتا تھا۔ یہ سنہری سی فسوں خیزی سچائی کے راستے پر ان کی استقامت کا بتاتی تھی۔

بیس دن تک نماز جنازہ ہی پڑھی جاتی رہی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

اور جب میں گاڑی میں بیٹھی میں نے کہا تھا۔

''افلاق قرب وجوار میں جتنے بھی خدا کے برگزیدہ لوگوں کے مزار مبارک ہیں اُن کا دیدار کروادو۔فاتحہ خوانی ہو جائے۔''

گردوغبار سے اٹے پڑے راستوں کو دیکھتے ہوئے میں بڑی دکھی سی تھی کہ بغداد خدا کے نیک اور پسندیدہ لوگوں کا مسکن۔اس پر تو وہ مثال صادق کہ اینٹ اٹھاؤ تو نیچے سے ولی درویش برآمد۔تاہم یہ بھی مقام شکر کہ سڑکیں گلیاں کشادہ تھیں۔گاڑی چلتی بھی تھی اور موڑ بھی سہولت سے کٹ رہے تھے۔دورویہ گھر خستگی اور کہنگی کا نمونہ تھے۔اللہ کے پسندیدہ لوگوں کے آستانے تو صدیوں پرانے تھے اور انہی جگہوں پر تھے۔زمانے کے ستم رسیدہ ہاتھوں نے جانے کتنی بار انہیں تکلیف پہنچائی۔

آبادیاں بنیں اور مسمار ہوتی رہیں۔سلطنت عثمانیہ نے بھی توجہ نہ کی۔نئے ملک کے طور عراق تو اپنی استقامت کی کٹھن گھیریوں میں اُلجھا رہا۔ان پر کیا توجہ دیتا۔گھروں کے بیروں پر بجلی کی موٹی موٹی تاروں کا بے ہنگم سا پھیلاؤ،دیواروں میں ٹھنسے ڈیزٹ کولروں کی بہتات عجیب سے کوفت بھرے تاثر کو پیدا کرتی تھیں۔

جمیلہ ہاشمی کی دشت سوس کے صفحات دماغ میں پھڑ پھڑاتے تھے۔کہیں انا الحق کی آوازیں کانوں میں گونجتی تھیں،کہیں وقت کے علماء سے تصادم کے منظر اُبھرتے تھے۔

تاریخ کی ایک اہم ہستی کہاں بسیرا کیے ہوئے ہے؟اگر زردی اینٹوں والی دیوار کی پیشانی نیلی اور فیروزی نقاشی سے سجی زمانوں پرانی تختی منصور الحلاج کے نام کو نہ اٹھائے ہوئے ہوتی تو مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ملحقہ گھر اور گلی کی گندگی دونوں بہت سے سوال کر رہی تھیں۔مگر ہم تیسری دنیا کے ملکوں کا اپنے قابل فخر ورثوں کے ساتھ بے اعتنائی کا یہی

المیہ ہے۔

دروازہ ذرا سا دھکا دینے سے کھل گیا۔ سامنے بڑے سے براؤن چوبی دروازے والی ایک اور عمارت تھی۔ اندر دو غیر ملکی خواتین تھیں۔ بھاری بھر کم وجود والا متولی الٹی پلٹی انگریزی میں باتیں کرتا تھا۔ کمرے میں سیلن تو نہیں تھی مگر کہنگی کی ہمک کا رچاؤ تھا۔ اپنے بارے میں بتایا۔ فاتحہ پڑھی اور باہر آ گئی۔

متولی نے کچھ نذر و نیاز کیلئے میری طرف دیکھا ضرور مگر چونکہ میری بجائے زیادہ موٹی سامیاں پیش نظر تھیں اس لیے کچھ پرواہ نہ کی۔

کچھ ایسا ہی حال حضرت جنید بغدادی کے مزار مبارک کا تھا۔ کچا پکا راستہ ویسے ہی مٹی کوڑے کرکٹ سے اٹا پڑا۔ مرکزی دروازے کی سفید رنگت بھی ماند ہوئی پڑی۔ گیٹ سے ملحقہ دیوار پر نیلے حروف میں مرقد جنید بغدادی لکھا ہوا اور ساتھ ہی کچرے کے ڈھیر پڑے ہوئے۔ دائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ قبرستان تھا۔

''یا اللہ''لمبی سانس کھینچی تھی۔

اندر داخل ہوئی۔ چلو شکر کہ یہاں صفائی ستھرائی بہتر تھی۔ ارد گرد درختوں کی چھاؤں تھی۔ بیلوں کی فراوانی تھی۔ سبزے کی بہتات طبیعت کو شاداب کرتی تھی۔ لوہے کی راڈوں میں پھنسا بڑا سا بورڈ رہنمائی کرتا اور بتاتا تھا کہ یہاں مدرسہ بھی ہے۔ جامع مرقد الشیخ الجنید بغدادی و مرقد شیخ سری السقطی ہے۔

مزار کھلا تھا۔ میں اندر گئی۔ استاد اور شاگرد دونوں کیلئے باری باری فاتحہ پڑھی۔

تھوڑی دیر کیلئے بیٹھی تو اِس عظیم ہستی کی زندگی کے بہت سے پڑھے ہوئے گوشے جھلملانے لگے تھے۔ ابن ساباط والا واقعہ تو مثالی تھا۔ ابن ساباط عراق کے نامی گرامی ڈاکوؤں، قاتلوں اور بدمعاشوں کا سرغنہ جس کی زندگی جیلوں میں گزری تھی۔ قتل کی سزا سے

اُس نے اپنے کو اپنے سو ساتھیوں کے نام بتانے پر بچایا تھا پر اس بدعہدی، بے وفائی اور ساتھیوں سے غدّاری نے اُس کے نامہ اعمال کو اور داغدار کر دیا۔ قید کے دوران ایک رات وہ بھاگ نکلا۔ بغداد کے گلی کوچوں میں پھرتے ہوئے وہ چوری کیلئے ایک شاندار سے گھر میں داخل ہوا جہاں کپڑوں کے تھان پڑے تھے۔ وہ انہیں اٹھانے کے منصوبوں میں تھا جب کوئی دبے پاؤں مشعل کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ آنے والے نے شفقت بھرے لہجے میں اُسے اپنے تعاون کی پیش کش کی۔ ابن ساباط اُسے بھی اپنی طرح کا چور سمجھا۔ اور گٹھڑ اُس کے سر پر لدوا کر کسی محفوظ ٹھکانے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں کئی بار سُستی سے چلنے پر ڈانٹ ڈپٹ بھی کی۔ ابن ساباط کو کسی محفوظ جگہ پہنچا کر رخصت چاہی تو پتہ چلا کہ وہ تو مالک مکان تھا۔ اور یہ حضرت جنید بغدادی تھے۔

ابن ساباط کو جہاں چالیس (40) برس تک دنیا کی خوفناک اور بدترین سزا ئیں نہ بدل سکیں وہاں اُس عظیم ہستی کی محبت، قربانی اور ایثار نے کایا کلپ کر دی۔ شیخ احمد بن ساباط کا شمار حضرت شیخ جنید بغدادی کے قابل فخر فقراء میں ہوتا تھا۔ آپ کا کہنا تھا کہ ابن ساباط نے وہ راہ لمحوں میں طے کر لی جو دوسرے برسوں میں طے نہیں کر سکے۔

میں نے اپنے بڑے بیٹے کا نام جنید رکھا تھا۔ میں اُن سے بہت متاثر تھی۔ یہ بہت خوبصورت اور شہہ زور تھے۔ غصیلے بھی بڑے تھے مگر جب خدا کا کرم ہوا تو حد درجہ حلیم الطبع بن گئے۔ مجھے اُس کا نام غضنفر نہیں رکھنا چاہیے تھا وہ شاید اسی لیے بہت غصیلا ہے۔

شکر ہے مزار پُر وقار تھا۔

دونوں کے مزار مبارک کے تعویز خوبصورت منقش سے ہیں۔

بغداد کی مقدس سرزمین نبیوں، ولیوں، خدا کے پیارے لوگوں کی آماجگاہ۔ مجھ جیسی گنہگار محض حاضری سے خانہ پُری کر رہی تھی۔

حضرت معروف کرخی کے دربار میں حاضری ہوئی۔نفل پڑھے۔یہ بھی وہیں قریب ہی بستے ہیں۔ایک دوسرے سے متاثر،ایک دوسرے کے شاگرد اُستاد۔

امام احمد بن حنبل امام شافعی کے حلقہ درس میں شامل ان کے شاگرد حنبلی مسلک کے امام معتزلہ (قرآن مخلوق ہے) جیسے عقیدے کو تسلیم نہ کرنے پر مامون اور اس کے بھائی معتصم باللہ کی سختیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے والی ہستی۔خدا اور اس کے نبی کی سچی عاشق۔بغداد کے بہت سے لوگ حنبلی عقیدے کے پیروکار ہیں۔

میں نے یہاں فاتحہ کے ساتھ عصر کی نماز بھی ادا کی۔

اس علاقے کے کچھ حصے نسبتاً بہت خوشحال نظر آتے تھے۔سڑکیں کشادہ، درختوں کی بہتات اور بازار شاندار تھے۔کچھ درمیانی بودوباش والے اور کچھ ماٹھے سے تھے۔یہاں کے بھی ہر گھر میں اور شاہراہوں کی چھوٹی چھوٹی دوکانوں میں اے سی نصب تھے۔

خوبصورت دل کش لڑکیاں کہیں عبایا پہنے،کہیں جینز پر اے لائن شرٹ پہنے کوہان نما جوڑوں پر چمکتے رنگوں والے سکارف پہنے دوکانوں کے اندر آجا رہی تھیں۔سائیکل چلاتے مرد،موٹر سائیکل اڑاتے نوجوان،کہیں بھیڑ بکریوں کے ریوڑ،کہیں چوبی ریڑھیوں میں بیٹھے اچھے خوش پوش سے آدمی جنہیں دیکھ کر نہ صرف ہنسی آئی بلکہ بغداد میں اپنا پہلا دن بھی یاد آیا۔

ایک جگہ میں نے عورتوں کو بڑی بڑی سینیوں میں عراقی پیسٹریاں سروں پر اٹھائے لے جاتے دیکھیں۔وہی ہمارے ہاں والا منظر کہ جیسے سموسوں کے تھال حلوائی کی دوکانوں پر جاتے ہیں۔ایک دو جگہ میں نے عورتوں کو پانی کی بالٹیاں اٹھائے پانی لے جاتے دیکھا۔

منظروں میں کتنی یکسانیت تھی۔

باب نمبر: 12

1۔ نویں صدی کی عرب عورتوں کی روشن خیالی اور دانشوری آج کی عورت کیلئے قابلِ تقلید ہے۔

2۔ دانتے کی ڈیوائن کومیڈی دراصل ابو العلاء المعری کی رسالت الغفران سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔

3۔ اپنے وقت کا ایک عظیم کلاسیکل شاعر ابونواس روڈ پر مجھ سے ہمکلام تھا۔

بغداد کی رات کے اِس پہلے پہر جب میں دجلہ کے پانیوں میں ڈوبی روشنیوں کے عکس، کہیں اُن سے بنتے کہکشاں جیسے راستے، کہیں چمکتے دمکتے چھوٹے چھوٹے گولے سے پانیوں میں مستیاں کرتے، کہیں قریبی ہوٹلوں کی روشنیاں ستاروں جیسے روپ لیے پانیوں میں اُتری ہوئیں، کہیں مُنے چُنے قمقمے جلتے بجھتے دیکھتی اور ان کے لحہ بہ لحہ بدلتے رُوپ اور صُورتوں کے تحیّر میں گُم تھی۔ مجھے تو معلوم بھی نہ ہوا تھا کہ کب ایک وجیہہ عراقی بوڑھا میرے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اُسکا روایتی لباس، اُس کی مخمور آنکھیں، اُسکی سنہری رنگت، اُسکا بانکپن سبھوں نے میری توجہ کھینچ لی تھی۔ میں نے قدرے حیرت اور استفہامیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا تھا اور اُس کے بارے میں کُچھ جاننے کی خواہشمند ہوئی۔

یقیناً آنکھوں کی زبان اُس نے پڑھ لی تھی۔ گھن گرج سی تھی لہجے میں جب بولا تھا۔

''میرے نام سے منسوب جدید بغداد کی اِس اہم شاہراہ ابونواس پر تم کس ٹھسّے

سے بیٹھی ہو۔اور تم نے نہ مجھے یاد کیا، نہ خراج تحسین پیش کیا۔حد ہوگئی ہے دجلہ کے فراق میں ہی گُھل رہی ہو۔''

''اوہو''میں مسکرائی تھی اور سمجھ بھی گئی تھی کہ میرا مخاطب کون ہے؟

''کمال ہے جب سے یہاں آ کر بیٹھی ہوں آپ کے ہی خیال میں تو گم ہوں۔''

شاعر کی جوانی ،اُس کے دلکش خدو خال ،اُس کی شہابی رنگت اور سنہرے بال اگر تب راہ چلتے لوگوں کو متوجہ کرتے تھے تو بڑھاپا بھی کم شاندار نہ تھا۔شاہوں جیسا بانکپن تھا اُس میں۔

سچی بات ہے وجاہت تو آنکھوں میں گُھب گئی تھی۔مرعوبیت نے وضاحت بھی فوراً ہی کرنی شروع کر دی تھی۔

''لو میں نے تو جب عراق آنے کا قصد کیا۔عراق سے متعلق لٹریچر اور معلومات کے جھمیلوں میں اُلجھی۔تم تو اُسی دن سے میرے سامنے آ گئے تھے اور میرے ساتھ رہنے لگے تھے۔اور یہ بھی تھا کہ میں ابونواس روڈ پر دجلہ کے کنارے بیٹھ کر تم سے لمبی چوڑی باتیں کرنا چاہتی تھی مگر یہ اتفاق مجھے مچھلی کے چکروں میں ڈالے ہوئے تھا۔اب تھوڑی سی تفصیل تم بھی سُن لو تا کہ تمہارا گلہ کچھ دور ہو سکے۔

مچھلی کھلائی ہے آپ کو۔اُس نے گاڑی ایک جگہ پارک کر دی تھی۔

''مچھلی''بلڈ پریشر کا بھوت میرے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

میرے اظہار پر وہ من موہنا سالڑکا ہنس پڑا تھا۔

دجلہ کے کنارے بیٹھ کر مچھلی نہ کھائی تو بغداد آنے کا فائدہ۔میں ہلکے نمک کے ساتھ بنانے کا کہوں گا۔

تو پھر AL MAZGOUF فش ریسٹورنٹ میں آ گئے۔یہ تمہاری ابونواس روڈ

ڈانس کلبوں اور کیسنو کیلئے بھی بڑی شہرت رکھتی ہے۔

یہاں دجلے کے کنارے کنارے دُور تک چھوٹے چھوٹے ریسٹورنٹوں کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا ہے۔عمارتیں، ہوٹل اور صفائی سُتھرائی کا معیار تو بس اوسط درجے کا ہی ہے لیکن روشنیوں، دجلہ، گھاس کے لان، درختوں کا پانی میں جھکاؤ، ماحول اور لوگوں کے اُبلتے سیلاب نے انہیں خاص بنا دیئے ہیں۔اندر باہر طوفان سا برپا ہے اور لگتا ہے جیسے پانیوں کے اوپر ایک جہاں آباد خود میں گُم ہے۔

ایک کونے میں شطرنج کھیلی جا رہی ہے تو ذرا آگے تاش کی بازی جمی ہوئی ہے۔فضا میں کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبوئیں پھیلی ہوئی ہیں۔بچوں والے لوگ ہیں تو محبتوں اور یاریوں والے بھی بہتیرے ہیں۔شیشہ پینے والے کس مزے سے بیٹھے حقّہ پیتے اور موسیقی پر سر دھنتے ہیں۔موسیقی بہت اونچی پر دلنوازسی ہے۔

عراقی موسیقی میسوپوٹیما موسیقی اور عرب موسیقی کا دل کش امتزاج ہے جس پر ایرانی روایتی موسیقی نے بھی اپنا اثر ڈالا ہے۔یہ افلاق نے مجھے بتایا ہے ابھی۔

یہ عود Oud بج رہا ہے اور یہ مشہور عوڈسٹ Oudist احمد مختار ہے۔

تالاب کے کنارے کھڑا افلاق کچھ بات کرتا ہے۔میں بھی پاس چلی گئی تھی۔مچھلیوں کی تو بہار لگی پڑی تھی۔چھلنی سے تین نوعمر لڑکے گاہکوں کے بتانے پر مچھلیاں پکڑ پکڑ کر اِس زور سے فرش پر مارتے تھے کہ بیچاریوں کو شاید سانس لینا بھی نصیب نہ ہوتا تھا۔

چاقو سے پیٹ چاک ہوا۔گند مند نکلا پھر مچھلیاں لوہے کی سلاخوں میں پرو کر کونے میں بنے لکڑیوں کے آلاؤ کے گرد کھڑی کر دی گئیں۔

اور جو لڑکا شیف کا کام کرتا ہے بڑی شان ہے اُس کی بھی۔پینٹ قمیض پہنے ایپرن چڑھائے، وجاہت والا جیسے شیف نہ ہو آرٹسٹ ہو۔

''زندگی تو کھانے کیلئے ہے'' جیسے خیال رکھنے والوں کیلئے تو یہ لوگ آرٹسٹ ہی ہیں۔بیٹھنا میں نے وہاں چاہا تھا''جہاں تیرا نظارہ درمیان میں''والی بات ہو بغداد میں دجلہ سے بڑا ''تیرا'' بھلا کون ہوسکتا ہے۔یوں تمہارا خیال بھی تو ساتھ ہی تھا۔

ہاں یہ بات بھی ہے تمہارے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں کہ پاکستان میں جو کچھ تم پر پڑھا وہ ادب کے حوالوں سے تو بہت اہم تھا۔مگر مجھ جیسی کچھ تنگ نظر، رواجی اخلاقیات کے بندھنوں میں جکڑی عورت کیلئے بظاہر کچھ اتنا پسندیدہ نہ تھا۔کہیں رسوائے زمانہ نظروں سے گزرا۔کہیں مذہبی اقدار کا باغی اور کہیں شہوانیت کا مارا ہوا۔پر اندر کی بات بتاؤں کہ میں نے بھی چسکے لے لے کر تمہیں پڑھا اور اپنی ادبی سہیلیوں کو بھی سُنایا۔

خیر لونڈے تو تمہاری شاعری کا ایک مستقل مزاج حصّہ ہیں۔ایک ایسی نظم جسمیں عقیدے اور مذہب کی بھی جھلک ہے وہاں یہ دیوانگی کفر کی حد تک چلی جاتی ہے۔پھڑ پھڑ کرتی شاعری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی ہے۔

Last Friday night I encountered a mob
of wildly milling men all yelling
"Judgment! The Last Hours upon us!
The return to Allah! The prophets say
a sign of the End shall be
the Sun at Midnight! Here it is!
We tremble! We submit!"
I laughed & said, " This is no sun
that rises as a star, but only

my friend, young Ahmad, brightening

the velvet canopy with his crystal track,

the dogstar on his forehead, venus on his cheek"

دیر تک میں اِس نظم کے حصار میں قید رہی تھی۔

ابونواس تمہاری اس نظم کو پڑھتے ہوئے میرے اندر کے شیطان نے اگر چسکہ لیا تھا تو خیر کے تربیت یافتہ پہلو نے فطرت کے خلاف ورزی پر احتجاج بھی کیا تھا۔

I love a willing boy, a dangerous gazelle

his Forehead a moon half-veiled

by the clouds of his coalblack hair

who lolls around in his underwear

demands no jewelry or perfume

never goes on the rag

or gets pregnant

ایک شام تمہاری ایسی ہی نظمیں پڑھتے ہوئے جہاں تم نرم و نازک لطیف سے جذبات پر بہتے بہتے گندگی کی پاتال میں اُتر جاتے تھے۔میں نے بے اختیار ہی اُس وقت ہاتھوں میں پکڑے نظموں کے پلندے کو دراز میں گھسیڑ دیا تھا کہ میرا بڑا بیٹا غضنفر کمرے میں داخل ہوا تھا۔عالمی ادب کے قدیم و جدید شعرا اور ادیبوں سے شناسا اپنے اِس بیٹے سے میں نے تم پر بات نہیں کی تھی۔

Come right in boys. I'm

a mine of Luxury--dig me

Well-aged brilliant wines made by
monks in a monastry! shish-kababs!
roast chickens! Eat! Drink! Get happy!
and afterwards you can take turns
Shampooing my tool

اور پھر ایسے ہی ایک دن میں نے زچ آ کر انہیں بیچ دیا اور خود کو لعن وطعن کرتے ہوئے اپنے اندر کو ڈپٹا۔

''بہت ہوگیا۔ بہت ہوگیا علموں بی بی بس کر اب۔ تھوڑی دیر کیلئے اِس موضوع سے ہٹ کر اُس کی شاعری کی اور خوبصورت پرتیں دیکھ۔ لونڈے بازی پر ہی تیری سوئی اٹک گئی ہے۔

ابونواس''

میں نے کُرسی کی اگلی ٹانگوں پر زور ڈالتے اور پچھلی کو اٹھاتے ہوئے خود کو اُس کے قریب کیا۔

''مجھے یقیناً اپنی خوش قسمتی پر رشک آ رہا ہے کہ آٹھویں صدی کے وسط اور آخری دہائی کا عربی کلاسیکل شاعری کے ایک بہت بڑے نام کا حامل شاعر ابونواس نے مجھے شرفِ ملاقات بخشا ہے اور میرے پاس آ کر بیٹھا ہے۔''

''ابونواس''
میں کچھ جھجکی تھی۔

''کہو۔ جو کہنا چاہتی ہو۔ تم ایک دبنگ بندے کے سامنے بیٹھی ہو۔''

"ابونواس میں گنہگار سی کچی پکی مسلمان عورت تمہاری شاعری کا جو ورق پھرولتی

تھی وہی مجھے مایوس سا کرتا تھا۔ابونواس میں جاہل سی محدود سے ذہنی افق کی مالک تمہاری شراب اور شراب نوشی، لونڈے بازی، پھکڑ بازی اور خدا سے مخول بازی کو اس طرح ہضم نہ کر سکی جیسے شاید باقی لوگ کرتے ہوں گے۔اب میں بھی کیا کروں تم خمریات(K h a m r i y y a t)(شراب نوشی) مدحققارات(M u d h a k k a r a t)(لونڈے بازی) اور مجیات(Mujuniyyat)(کفر بکنے والا) کے چکروں سے ہی نہیں نکلتے تھے۔

شاعری کا سارا تانا بانا تو ان ہی موضوعات کے گرد گھومتے رہے۔"

''بس تو اتنا سا علم لے کر بیٹھی ہو۔''

ابونواس نے اپنے انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کو مضبوطی سے ایک دوسرے سے جوڑتے ہوئے درمیان میں معمولی سے خلا کا راستہ بھی بند کرتے ہوئے گہرے طنز سے کہا۔

''ایک میں کیا بغداد کے بیشتر شعرا اور لکھاری بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ عرب دُنیا کی اکثریت کا یہی انداز تھا۔چلو ابنِ روندی کو چھوڑو تمہارا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا۔ولادہ بنت المستکفی کی شاعری کا تو جائزہ لیا تھا۔تمہیں پتہ چلتا نویں صدی کی عورتوں کی روشن خیالی اور دانشوری کا۔ابو العلاء المعریٰ کو پڑھنا تھا۔اس کے ہاں اگر شہوانیت نہیں مگر مذہب پر تنقید ہے۔خدا پر ایسی نکتہ چینی ہے کہ تم جیسے چھوٹے ذہن کے لوگ پل نہ لگائیں اور مُرتد اور کافر کے فتوے دائر کر دیں۔جنت اور جہنم کے پس منظر میں لکھی گئی اُس کی مشہور نظم ''رسالت الغفران'' کہ جس سے دانتے نے متاثر ہو کر ڈیوائن کامیڈی لکھی۔ہمارے عہد کے مفکر، دانشور، شاعر اور ادیب زیادہ ترقی یافتہ تھے۔تم لوگوں کی نسبت زیادہ روشن خیال تھے۔

وہ تمہارے محبوب فارسی کے شعرا عمرِ خیام اور حافظ جن کی شاعری پر تم جیسے لوگ

سر دُھنتے ہیں ۔میرے ہی تو جانشین ہیں ۔میری روایات کے امین ہیں وہ ۔یونانی اور رومی شاعروں کو پڑھو ۔ دنیا کے فلاسفروں اور دانشوروں کا مطالعہ کرو ۔ انکے کام بھی میرے جیسے ہی تھے ۔

سچی بات ہے اگر یہ طعنہ نہ بھی ملتا تب بھی مجھے اپنے سطحی سے علم کا بخوبی احساس تھا ۔میرے ہاں دعوی تو سرے سے ہی نہیں تھا ۔دعوی تو سراسر جہالت ہے ۔

میں نے اپنے اِن جذبات کا اظہار بڑے نرم اور شائستگی و متانت میں ڈوبے لہجے اور انداز میں کیا ۔تھوڑا سا زور اِس بات پر بھی دیا کہ شاعری کی بہت ساری اصناف میں شاعر ،کس میں زیادہ گہرائی کے ساتھ سامنے آیا ہے اِسے پرکھنا تو یقیناً نقادوں کا کام ہے ۔عام قاری تو لُطف کیلئے پڑھتا ہے ۔تاریخ میں درج یہ سچائی اور حقیقت بہت کُھل کر سامنے آئی ہے کہ تمہارے علم کی وسعت بے پایاں ،تمہارا حافظہ قوی اور یادداشت غیر معمولی تھی ۔تمہارے عہد کے نقادوں کی رائے بشمول ابوحاتم المکی ''کہ ابونواس کے ہاں عمیق گہرائی اور سطحی پن دونوں ہیں ۔ابونواس اگر خود اس کا اظہار نہ کرے تو بسا اوقات سمجھنا مشکل ہوجاتا ہے ۔''

یوں تمہاری جی داری اور حوصلے کی بھی داد دینی پڑتی ہے ۔ابو العتاہیہ جیسا صوفی خدا پرست شاعر مقابلے پر ہو اور رندِ ہی لوگوں کی جماعتیں بھی تمہارا تیا پانچہ کرنے پر تُلی رہتی ہوں تب بھی تم کہتے تھے ۔

سرور ملتا ہے مجھے اُن کاموں کے کرنے سے جنہیں روکتی ہے مقدس کتاب
میں گریزپا ہوں اُن سے جنکی اجازت دیتی ہے مقدس کتاب ۔

بغداد کے کوچہ و بازار میں اگر ابو العتاہیہ کا صوفیانہ کلام گونجتا تھا

کھا سوکھی روٹی کا ٹکڑا
پی ٹھنڈے پانی کا پیالہ
تنہا بیٹھ اور غور کر
مقصد حیات کو سامنے رکھ۔
یہ چند گھڑیاں بہتر ہیں
بلند وبالا محلات میں شاہوں کے حضور بیٹھنے سے
اب تیرے چاہنے والے تجھے یوں گنگناتے اور گاتے تھے۔
''ابونواس۔
فائدہ اٹھا اپنی جوانی سے
جان لے یہ باقی نہیں رہے گی
صبح و شام کی شرابیں ملا
نشہ کا لطف اٹھا اور مخمور ہو
''چچ چچ چچ۔''

ایسا طنزیہ اور تمسخرانہ انداز تھا۔نگاہیں جو چہرے پر جمی تھیں وہ ان احساسات سے لبالب بھری تھیں۔بڑی خفت سی محسوس ہوئی تھی۔ایک تو گرمی اوپر سے شرمندگی۔مساموں سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔

''اندھا تھا ابوالعتاہیہ۔اندھے زندگی بسر کرتے ہیں۔گزارتے نہیں۔میں نے زندگی اُس کے حُسن ورنگوں کے ساتھ بھرپور انداز میں گزاری ہے۔کوئی بار بار ملنے والی چیز تھی یہ۔''

میں خاموش ہوگئی تھی۔یقیناً میں اُس وقت اُسے وہ سب نہیں سُنانا چاہتی تھی جو

میرے قلب و ذہن میں شور مچائے جاتا تھا۔چاند چہرے جیسے لڑکے، ان کے مرمریں بدن،زیر جاموں کی نرماہٹ اوراس کے جاندار بوسے۔

''ابونواس زمانہ قدیم سے جدید تک دنیا بھر میں شہرت کے اعتبار سے مقبول ترین کئی ایک الف لیلوی کہانیوں میں تمہاری حس ظرافت،تمہارا مزاح اور تمہاری ذہانت بہت دلنشین انداز میں سامنے آئی ہے۔اپنی کوئی ایسی ہی کہانی آج کی رات دجلہ کے کنارے مجھے سناؤ۔

ابونواس کھلکھلا کر ہنس پڑا اور کہانی شروع ہوئی صیغہ غائب میں۔

ابونواس بہت چالاک ہوشیار آدمی تھا۔خلیفہ نے اُس کی چالاکیوں کے بارے میں سُنا۔ہوشیاریوں کے متعلق جانا۔غیر معمولی ذہین اور فطین آدمی ہے۔درباریوں نے زمین وآسمان کے قلابے ملائے تھے۔

''پیغام بھیجو اُسے۔خلیفہ ملنا چاہتا ہے۔فوراً۔لیکن اُسے بتادو کہ وہ میرے پاس اُس وقت نہ آئے جب سُورج چمکتا ہو۔اور جب اندھیرا ہو تب بھی نہیں۔

ہاں اُسے بتاؤ کہ اُس نے میرے پاس اپنے پاؤں پر چلتے ہوئے نہیں آنا ہے اور نہ ہی اُسنے کسی جانور پر سوار ہو کر آنا ہے۔

اور ہاں یہ اُس پر واضح کر دو کہ اگر اُس نے میرے ممنوع کردہ کسی بھی طریقے کو اپنایا تو بس پھر جلاّد اُسکا گاٹا اُتارنے کو تیار بیٹھا ہے۔

وہ آئے جلد اور بہت جلد۔

اب ابونواس نے جالی کا بڑا سا بیگ لیا۔اس میں بیٹھا۔یار بیلیوں سے کہا اِسے اونٹ کی گردن سے رسے کے ساتھ لٹکا دو۔یوں وہ جُھومتا جھامتا ایک ایسے وقت میں جب آسمان پر ہلکے سے بادل تھے اور ہلکی ہلکی بارش تھی خلیفہ کے پاس پہنچ گیا۔خلیفہ اسکی

ہوشیاری پر حیران رہ گیا تھا۔

خلیفہ تو حیران تھا ہی۔ اکسیویں صدی کی یہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والی عورت بھی حیران تھی۔ ماحول کے رنگا رنگی نے چند لمحوں کیلئے توجہ بانٹ لی تھی۔ پلٹی تو دیکھا کہ اُس کی مخمور آنکھیں جیسے یادوں کے جوار بھاٹے میں ہچکولے لے رہی تھیں۔ ذرا سا رخ پھیرنے پر ہی سبب جان گئی تھی۔ افلاق نے سامنے ٹی وی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''سنیے انہیں۔ علی ال الزاوی Ali Al Essawi۔ اس کا یہ گانا پوری عرب دنیا میں ہٹ ہوا ہے۔

مکام Maqam جیسے سریلے شریں دل کی دنیا زیروزبر کرنے والا آلات موسیقی اور مکتوبہ Makhtooba جیسا گیت۔ لوگ جھوم رہے تھے۔ من چلوں کی سیٹیاں تھیں۔ ہیجان تھا۔ پر میں دیکھتی تھی ابونواس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے خفیف سے رنگ تھے۔

میں سمجھ گئی تھی علی ال الزاوی کی پرفارمنس پر ناک بھوں چڑھی تھی۔

پھر جیسے وہ خوابناک سی آواز میں بولنا شروع ہوئے۔

ہمارا نوجوان زُلزل عود Oud بجاتا تھا تو گلیوں میں چلتے لوگوں کے قدموں کو زمین جکڑ لیتی تھی استادوں کا استاد جس نے بے شمار راگنیوں کو ایجاد کیا۔ اسحاق اُسی کا شاگرد تھا اور اُس میرے ہم عصر ابراہیم موصلی کے گانے پر تو پرندے پھڑ پھڑاتے ہوئے نیچے گرتے تھے۔ دجلہ کا پانی ساکت ہوجاتا تھا۔ ہوائیں چلنا بھول جاتی تھیں۔ اُس کی انگلیوں کی پوروں سے سُر پھوٹتے تھے۔ راگنیاں جنم لیتی تھیں۔ وہ سُر اور گلے کا بادشاہ تھا۔

اب مریم فارس سامنے تھی۔ کیا طرحدار لڑکی تھی۔ شانوں پر بکھری گھنگریالی

زلفوں پر کہیں شام کی لالیوں کا گمان پڑتا تھا۔نیم عریاں جسم اور اداؤں کا بانکپن۔

میں نے چہرے کے تاثرات سے یہ جانا تھا کہ اُن آنکھوں میں نئے رنگ و آہنگ کو دیکھنے کا ٹر ور ضرور تھا پر گیت کی شاعری کے معیار پر اعتراض تھا۔

''زبیدہ والا قصہ نہیں سنائیں گے۔''

زوردار قہقہہ فضا میں گونج گیا تھا۔

''میری دُکھتی رگوں پر آپ کی انگلیاں ہیں۔''

''بخدا نہیں۔''

میں بھی ہنس پڑی تھی۔

''دن تو موسم بہار کی رتوں والے تھے۔کونپلیں پھوٹتی تھیں اور دجلہ بہت گدلا گدلا سا تھا۔پانی کے بہاؤ نے اس سال ابھی سے ہی آخری کناروں کو پچھاڑنا شروع کر دیا تھا۔

شام کی سنہری کرنوں میں خلیفہ کا محل، دجلہ کے پار برامکیوں کے شاندار محل فن تعمیر کے وہ نادر نمونے کہ جو بندے کو رُک کر دیکھنے پر مجبور کرتے تھے۔باغ میں دنیا جہاں کے درختوں کی نادر اقسام، کیاریوں میں کھلے سینکڑوں اقسام کے پھولوں کی مہکار، جھاڑیوں کی قطع برید، کہیں سانپوں، شیروں، چیتوں، موروں کی صورت باغبانوں کی فنکاری کے عکاس، گھاس کے قطعوں میں موتی بکھیرتے حوض جن میں ناچتی مچھلیاں۔دجلہ کے اوپر مرغابیوں کی ڈاروں کو پر پھڑپھڑاتے ہوئے قطاروں کی صورت اڑتے شام کی زرنگار کرنوں میں دیکھنا۔واللہ کسقدر دل خوش کن منظر تھا۔

میں خلیفہ کے بُلاوے پر اُن سے ملاقات کیلئے آیا تھا اور چند لمحوں کیلئے رُکا تھا۔ بالکونیوں سے باہر کے منظر جیسے چوکھٹوں میں نصب تصویروں کی مانند مجھے دِکھے تھے۔

کمرے میں تنہائی تھی۔نبیذ سے بھری صراحی اور فواکہات کی سینی سامنے

تھی ۔میں نے مزاج شاہی کی افسردگی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''واللہ امیر المومنین آپ بھی کیا چیز ہیں؟ فردوس بریں میں رہتے ہیں۔ذرا نگاہ اٹھا کر تو دیکھیے ۔باہر کے منظر اُمنگیں جگانے اور جذبات اُبھارنے والے ہیں اور آپ ہیں کہ ملول بیٹھے ہیں۔''

میں نے اپنا تازہ کلام سنایا اور کہا۔

''جعفر برمکی نے کنیز خریدی ہے۔چہرہ جس کا ٹرک شہزادیوں کا سا،جسم رومی نازنینوں، نین حجازی دوشیزاؤں اور کمر یمنی مُیاروں جیسی ہے۔حضور اِس گناہ ثواب کو چھوڑیئے ۔یہ دو روزہ زندگی ہاتھ سے گئی سوگئی ۔لطف اٹھایئے ۔شراب سے،شباب سے اور سمے کی ساعتوں سے۔

ابراہیم موصلی اور ابن جامع کو بلوائیں۔راگ ورا گنیوں سے دل بہلائیں۔پری چہرہ نازنینوں سے اپنی راتوں کو آباد اور شاد کریں۔''

خلیفہ کی افسردگی دُور ہوئی۔مُسکرایا، ہنسا اور شاد کام ہوا۔

میں گھر لوٹا۔ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دستک ہوئی۔سمجھا کہ غلام خلیفہ کی جانب سے انعام واکرام لے کر آئے ہوں گے۔

کنڈی کھولی۔غلاموں کی ایک لام ڈور تھی جو دروازے کو دھکے مارتی اندر آئی۔ مجھے پکڑا۔وہ پٹائی کی کہ چارپائی پر پڑنے اور تیل ہلدی لگانے والی بات ہوگئی تھی۔

معلوم ہوا کہ ابونواس کے محل سے نکلتے ہی زبیدہ خاتون غصے سے لال پیلی ہارون کے کمرے میں آئی اور پُوچھا کہ ''ابونواس آپ سے کیا باتیں کرتا تھا؟''

زبیدہ بڑی زبردست اور ڈاڈھی ملکہ تھی۔خلیفہ تو پل بھر میں ہی منکر ہوگیا۔وہ بھڑی۔

''امیر المومنین کمال کرتے ہیں۔میں نے خود اپنے کانوں سے اُسے تمہیں بہکاتے اور گناہ کی ترغیب دیتے سُنا۔تم سے اتنا نہ ہوا کہ اُسے پھٹکار دو اور نہیں تو ڈانٹ ڈپٹ دو۔''

ہارون ہنسا۔''بھئی زبیدہ سچی بات ہے۔ایسی اچھی اچھی باتوں پر ڈانٹنے کا کیا کام۔''

اور زبیدہ نے اپنے ملازموں سے ابونواس کو ایسی چھینٹی لگوائی کہ بیچارہ دو ماہ تک بستر پر پڑا رہا۔

مجھے مزہ آیا کیونکہ ایک خوبصورت قہقہہ فضا میں دیر تک گونجا۔خلیفہ کو ایک دن پھر میری ہڑک اٹھی۔بلا بھیجا۔ایسی خستہ حالی دیکھی تو پوچھا۔

''ابونواس تمہیں کیا ہوا؟ بیمار تھے کیا؟''

''امیر المومنین بس کچھ مت پوچھیے۔''

''ہاں ابونواس اُس دن کی طرح کچھ مزے مزے کی باتیں ہو جائیں۔کچھ ذکر پری پیکروں اور پری وشوں کا کہ طبیعت اُداس ہے۔تمہاری باتوں سے شاید راحت وسرور نصیب ہو۔''

میں نے دونوں کمروں کے بیچ دروازے میں رکھے چوبی پردے کے پیچھے جان لیا تھا کہ وہاں کون ہے؟

''ہاں تو امیر المومنین اُس دن میں آپ کو بتا رہا تھا کہ عربی میں ایک کہاوت ہے کہ جس کی دو بیویاں اُس کی کیا زندگی؟ اِدھر جھوٹ اُدھر جھوٹ۔اِدھر کچھ اُدھر کچھ۔جس کی ہوں تین بیویاں وہ بیچارہ تو گویا دُکھوں کی سان پر چڑھ گیا۔اور جس نے کی چار وہ بنا مظلوم۔نہ زندوں میں نہ مُردوں میں۔

تو امیر المومنین میں نے تو دنیا کو دیکھتے ہوئے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بیوی بس ایک ہی، دل کی وہی رانی۔''

ہارون الرشید نے پہلے تو حیرت سے آنکھیں پھاڑیں پھر چیخا۔

''ابونواس تم بکواس کرتے ہو۔قسم لے لو مجھ سے جو تم نے اُس دن ایک بھی ایسی بات کی ہو۔''

''امیر المومنین' ابونواس عاجزی سے جھکتے ہوئے بولا۔

''آپ کو میری باتیں بھول گئی ہیں شاید۔میں نے اُس دن آپ سے یہ بھی کہا تھا کہ بنی مخزوم قریش میں افضل ترین زبیدہ خاتون دختر قاسم اُس قوم کے خوشنما پھولوں میں سے سب سے حسین پھول۔اُس دن مجھے محسوس ہوا تھا کہ آپ کا دل دوسری عورتوں کی طرف مائل ہے۔میں آپ کو سمجھانا چاہتا تھا کہ زبیدہ خاتون ہی آپ کے قلب و جان کیلئے راحت کا سامان ہے۔''

ہارون الرشید غصے میں چلایا۔

''ابونواس تم جھوٹے ہو۔خدا کی لعنت ہو تم پر۔''

ابونواس نیم ایستادہ ہوا۔کورنش بجالاتے ہوئے بولا۔

''امیر المومنین آپ مجھے وقت سے پہلے مروانا چاہتے ہیں۔آپ چاہتے ہیں کہ یہ جو میں لنگڑاتا ہڈیاں گوڈے رگڑتا آپ کے حضور حاضر ہو گیا ہوں۔اس سے بھی جاؤں۔رحم کیجئے مجھ پر۔''

اُسی وقت پردے کے پیچھے سے زبیدہ کی ہنسی سُنائی دی۔

''ابونواس تم سچے ہو۔تم نے یہ سب کہا ہوگا۔امیر المومنین چونکہ پریشان تھے انہوں نے یہ سب باتیں اپنے پاس سے گھڑیں اور تمہارا نام لگا دیا۔''

''بالکل، بالکل، درست، درست کہتا میں اپنے گھر دوڑتا گیا۔گھر پہنچا تو دروازے پر زبیدہ کے غلام خلعتِ فاخرہ اور زرِ نقد لیے کھڑے تھے۔

کئی ماہ بعد خلیفہ کو یہ سب معلوم ہوا۔بہت ہنسا۔انعام و اکرام سے نوازا۔

''وہ کلام الیل والا کیا قصہ تھا؟ اُسے بھی تو سنائیں۔''

''ارے بھئی اُن دِنوں محل میں آرمینیا کی چند کنیزوں کا بڑا چرچا تھا۔آرمینیا کی لونڈیاں بڑی مہذب اور شائستہ سمجھی جاتی تھیں۔محل میں بچوں کی تربیت کا بیشتر کام اُن کے سپرد تھا۔ایک رات ہارون نے تنہائی میں ایک طرحدار اور دل کش کنیز سے کچھ شرارت کرنی چاہی۔اُس نے صبح پر ٹرخا دیا۔اگلے دن ہارون نے اُسے بلوایا اور وعدہ یاد دلایا۔آرمینیائی لونڈی نے ادائے بانکپن سے کہا۔

کلام الیل یمعوہٗ النھار۔

ہارون مسکرایا۔اُسے لونڈی کی بات بہت پسند آئی تھی۔بغداد کے سب شاعروں کو اکٹھا کیا اور کہا کہ اس پر گرہ لگائیں۔

''جانتی ہیں یہ بازی کس نے جیتی؟ انہوں نے میری طرف سوالیہ انداز میں دیکھا تھا۔میرے جواب کا انتظار نہیں کیا۔فوراً اپنے سینے پر فخریہ انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

''ارے بھئی میں نے۔یعنی ابونواس نے۔میں نے تضمین کے مصرعوں میں ہارون الرشید کی دراز دستی کا سارا حال بیان کر دیا تھا۔

''تو اب رخصت۔تمہاری پچھلی بس آیا ہی چاہتی ہوگی۔''

میں نے نگاہیں اٹھا کر دُور پھینکیں۔افلاق تو مجھے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

''کیا مجھے تھوڑا سا وقت اور نہیں عنایت کریں گے۔''

میرا انداز بڑا ملتجی سا تھا۔

کچھ اپنے بارے میں بھی بتا دیں۔خود سے ملا دیں۔

''ارے بھائی ہماری زندگی بس ایسی ہی اُجڑی پُجڑی سی تھی۔جس کا نطفہ تھا۔اُس کی صورت تو کبھی دیکھی ہی نہ۔بس سُنا کہ مروان دوم کی فوج میں ایک سپاہی ہے۔اور نام بھی معلوم نہیں ایک بار ماں نے "حبشی" بتایا تھا۔میری ماں گلبان ایرانی اور پیشے کی جولاہی تھی۔کھڈی پر بڑا خوبصورت کپڑا بُنتی تھی۔صورت کی اتنی حسین کہ ہواؤں میں اڑتے پرندے دیکھ لیں تو غش کھا کر سیدھے اُس کے قدموں میں گریں۔نام تو میرا ماں نے الحسن ابن حبشی ال حاکمی رکھا۔میں خوبصورت تھا۔سنہری بالوں میں گُنڈل پڑتے تھے اور دو لٹیں شانوں پر گرتی تھیں تو گاؤں کے من چلوں نے ''ابونواس'' کہنا شروع کر دیا۔

ہاں پیدا کہاں ہوا؟ کچھ پتہ نہیں۔کسی نے دمشق کہا۔کسی نے بصرہ اور کچھ اہواز کہتے ہیں۔حقیقت کیا ہے؟ مجھے تو خود معلوم نہیں۔

ابو نواس نے منہ بنایا۔ہاتھوں کی انگلیاں نچائیں سارے چہرے پر نفی کا تاثر بکھیر دیا۔

ماں نے مجھے یمن کے کسی تاجر کے پاس کیوں بیچ دیا؟ میں کبھی سمجھ نہیں سکا۔چھوٹا سا تھا۔کیا میری روٹی اُس پر بھاری تھی؟

یمن کے اِس تاجر کی دوکان بصرہ میں تھی۔کھانے پینے کی یہاں کُھل ڈُل تھی۔خوب قد کاٹھ نکالا۔یوسف اوّل جیسا تھا۔ذہین بھی بہت اور حسین بھی بہت۔راہ چلتے رُک کر دیکھتے ضرور تھے۔

اور پھر اُس نے مجھے دیکھا۔ولیبہ ابن احباب نے یہ شاعر تھا۔اُسنے مجھے خریدا اور اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔پڑھائی لکھائی، گرامر، حرف و نحو۔کوئی دو سال بدوؤں میں بھی

رکھا کہ زبان خالص ہو جائے۔

یہ ولیمہ ہی تھا جو مجھے بغداد لایا۔یہیں میں نے شاعری شروع کی۔مزاح سے بھرپور۔صحرائی روایات کے برعکس ،شہری زندگی کی عکاس جسمیں نوخیز لڑکوں کی محبت اور شراب تھی۔

میں باغی تھا۔روایات کا،اقدار کا،مذہب کا۔سُرور ملتا تھا جب مُلاّ چیختے چلّاتے تھے جب لعن طعن ہوتی تھی۔

قصیدہ کو تھا اپنے سرپرستوں کا۔برامکیوں کیلئے کیوں نہ لکھتا۔وہ تو نگینے تھے جو عباسیوں کو مل گئے تھے۔عربوں کا عروج اپنی جگہ،اُنکی فتوحات کے پھیلاؤ کی اہمیت کا اپنا مقام۔اُنکی زبان کی وسعت،مذہبی رواداری،آئین و دستور کی بالادستی نے دوسری قوموں پر اُنہیں غالب کیا یہ سب حقائق مسلّم۔لیکن ایرانیوں کے تہذیب و تمدن کی شائستگی،نرمی اور لطافت بھی اپنی جگہ بڑی نمایاں تھی۔برامکی ایرانی جنھوں نے اپنا رنگ انکے رنگ میں شامل کیا اور اُسے مزید نکھارا۔

برامکی میرے محسن تھے۔مجھے نوازتے تھے۔جعفر برمکی نے جب اپنا وہ شاندار محل بنایا جو شان و شوکت کے اعتبار سے خلیفاؤں کے محلوں سے بھی بڑھ چڑھ کر تھا۔اور ہاں دیکھو یہ میری چھٹی حس تھی۔یا تم اِسے میرا وجدان کہہ لو کہ جیسے مجھے ان کے عبرتناک انجام کی طرف اشارہ ہوا۔محل کو دیکھتے ہی بے اختیار میرے ہونٹوں پر یہ اشعار تھرتھرانے لگے۔

اے محل شکستگی کے آثار تجھ پر ظاہر ہیں
میں نے تیری دوستی میں خیانت نہیں کی
اے برمک کی اولاد جب تم دُنیا سے گُم ہو جاؤ

تم پر ہمیشہ سلامتی رہے۔ دنیا تمہیں یاد کرے۔

ہارون الرشید کو مجھ پر اتنا تیخ پا ہونے کی ضرورت نہیں تھی ۔اُسنے بھی تو احسان فراموشی کی انتہا کردی تھی ۔"

''ابونواس ہارون الرشید پر تمہارا اتنا غصہ درست نہیں ۔طاقتور شاہوں کی کتاب میں یہ درج ہوتا ہے کہ صرف انہیں ہی مرکز رہنا ہے اور جب کوئی دوسرا مرکز بننے کی کوشش کرتا ہے تو پھر وہی ہوتا ہے جو برمکیوں کے ساتھ ہوا۔انہوں نے اختیارات اور شاہانہ اظہار کی تمام حدیں پھلانگ لی تھیں ۔''

''ہاں مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ہجو لکھی تھی ،ہارون الرشید کی ہجو، جو بغداد کے گلی کوچوں میں زور وشور سے گونجی ۔خلیفہ نے مجھے دیس نکالا دے دیا ۔پھر بھاگنا پڑا تھا اور میں مصر بھاگ گیا تھا ۔

میری بہترین شاعری امین کے دور میں لوگوں کے سامنے آئی تھی ۔''

''ابونواس اگر کچھ کہوں تو سُنیں گے نا۔تم نے امین کا اُستاد ہونے کے ناطے اُسے بھی شراب پر لگادیا تھا ۔امین بہت خوبصورت او روجیہہ لڑکا تھا۔''

''تمہاری عدالت میں ہوں ۔جو چاہو کہہ سکتی ہو۔''

''نہیں نہیں ابونواس ۔میں نے تو جو ماڑا موٹا پڑھا ہے اُسی کی روشنی میں تم سے بات کرتی ہوں اور تصدیق چاہتی ہوں ۔

تو پھر سُنیں ۔یہ امین ہی تھا جس کی شعر گوئی کی اصلاح پر زبیدہ نے مجھے مامور کیا۔میں نے اصلاح کی ۔غلطیاں بتادیں تو نوجوان شہزادے نے مشتعل ہو کر مجھے بندی خانے میں ڈال دیا ۔ہارون کو پتہ چلا تو بیٹے پر ناراض ہوا اور مجھے رہائی دلوائی ۔

چند ہی دنوں بعد جب میں خلیفہ کی خدمت میں حاضر تھا انہوں نے بیٹے سے کہا

کہ اپنا تازہ کلام ابونواس کو سناؤ۔ امین نے ابھی دو تین شعر ہی پڑھے ہوں گے جب میں کھڑا ہو گیا۔ ہارون نے بے حد تعجب سے میری طرف نگاہیں کیں اور استفسار کیا کدھر؟ میں نے کہا بندی خانے جانے کیلئے۔

میں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ بھئی ہم تو ایسے ہی تھے نڈر اور بے باک سے البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ امین کے مرنے پر جو نوحے میں نے تخلیق کیئے وہ عربی شاعری کا سرمایہ ہیں۔ زبیدہ کے نالے اور بغداد کی گلیوں میں گونجتے نوحے میری شاعری کے صدقے تھے جنہوں نے مامون کو فتح یاب ہو کر بھی بغداد میں داخل ہونے سے مہینوں روکے رکھا۔ خائف تھا وہ۔

مامون میرا نام سُننا نہیں چاہتا تھا۔''

''ایک روایت یہ بھی ہے کہ ابونواس تم آخری عمر میں تائب ہو گئے تھے۔ بڑے مذہبی اور خدا پرست بن گئے تھے۔''

''یہ ہوائی تو میرے کسی دشمن نے اڑائی ہوگی۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ جیل اور بڑھاپے نے پریشان کر دیا تھا۔ انعام کے لالچ میں مدح سرائی بھی کی۔ اور ہاں ایک بہت بڑی حماقت بھی سرزد ہوئی کہ مامون کے درباری مشیر نے چالاکی سے علی ابن طالب کے خلاف ہجو بھی لکھوالی اور اُسے بغداد کے کوچہ و بازار میں نشر بھی کر دیا۔''

''کہتے ہیں زہر دیا گیا تھا تمہیں۔ اسماعیل بن ابو سہل مرکزی کردار تھا۔''

''زہر ملا۔ یا جیل میں ہی طبعی موت مرا۔ بس دنیا سے جانے کا بہانہ ہی چاہیئے تھا۔ وہ مل گیا اور چلا گیا۔

لو تمہاری مچھلی آ گئی ہے۔ کھاؤ۔ میں چلتا ہوں۔ ایک ہاتھ میری طرف بڑھا تھا جسے میں نے محبت سے تھاما۔

بڑی سی سینی میں ٹماٹر، پیاز، کھیروں اور چٹنی کے ساتھ تلی مچھلی آ گئی تھی۔

افلاق بتاتا تھا کہ مچھلی الاؤ پر روسٹ کے بعد مرچ مصالحوں کے ساتھ گرم کوئلوں ملی ریت میں دم پخت کی جاتی ہے۔

اب ذائقے کے بارے میں کیا کہوں۔استنبول کا پرنس آئی لینڈ یاد آ گیا تھا۔ کہ تب بھی جی چاہا تھا اٹھا کر باسفورس میں پھینک دوں۔ میں تو چاہتی تھی۔ سیما ہی نہیں مانی۔ اور اب بھی اگر افلاق ساتھ نہ ہوتا تو دجلہ میں پھینکنا ضروری تھا۔

افلاق بیٹوں جیسا ہی تھا۔ ذائقے سے آشنا بھی۔ تو ہرج ہی کیا تھا کہ اُسے مچھلی بھی کھلاتی جاؤں اور باتیں بھی کرتی جاؤں اور اُس شخصیت کو تھوڑا سا اور یاد کر لوں۔

اُس کے مرنے پر جب گھر کی تلاشی لی گئی تو بدخواہوں اور حاسدوں کو صرف کاغذوں کا ایک دستہ اور کہانیوں کی ایک کتاب کا بیرونی کور ہی ملا تھا۔ دستے میں حرف ونحو اور گرامر کی چند تراکیب درج تھیں۔ وہ ٹھیک کہتا تھا۔ اُس کی شاعری سے متعلق ہر بات کی تان اس کے غیر معمولی گہرے اور ذومعنی اظہار پر ہوتی تھی۔

اپنے عہد اپنے وقت کا ایک بڑا شاعر ابونواس۔

باب نمبر:13

1۔ ہمارے صحرائی کنوئیں بڑی کشش کے حامل تھے۔انہیں طوائفوں اور فاحشاؤں سے سمجھداری اور دانائی سے بچانے کی ضرورت تھی جو بہر حال ہمارے پاس نہیں تھی۔

2۔ گرین زون کا سارا جاہ وجلال، دبدبہ اور کروفر کیسے خس وخاشاک کی طرح بہہ گیا تھا۔

3۔ گروہوں اور قبائل میں بٹی افغانی قوم معاشرتی یک جہتی سے محروم جس کے وارلارڈز نے جنگ کے زمانے میں امریکہ سے ڈالروں کے بورے لئیے مگر اپنے لوگوں پر خرچ کرنے کی بجائے خود کو مظبوط اور طاقتور بناتے رہے۔

4۔ بہت بکھیڑا ہے عراق میں۔نہ شیعہ متحد،نہ سُنّی اور نہ کرد،گروپوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے۔

کمرے میں پُچھے گہرے سُرخ خوش رنگ پھولوں سے سجے قالین پر وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب قریب بیٹھے تھے۔ڈھلتی عمروں میں بس تھوڑا ہی فرق ہوگا۔ دونوں اپنی عمروں کے حسابوں بڑے خوبصورت تھے۔سُرخ وسفید چہروں پر گھنی چھوٹی داڑھی جن میں سفید بالوں کی کثرت تھی۔چھ فٹ سے بھی نکلتی قامتوں والے۔

گزشتہ رات جب ہم سعدون سٹریٹ سے گزرتے تھے۔یہاں رات جوان تھی۔فلاق وینڈ سکرین سے سڑک پر ٹریفک کے اژدہام کو دیکھتا تھا اور میں سعدون سٹریٹ

کی جولانیوں کو۔دفعتاً وہ سوال لبوں پر آیا جو میرے اندر سالوں سے تھا۔ماڑا موٹا جواب بھی کچھ اِدھراُدھر سے مل گیا تھا پر تشنگی بدستور تھی۔حالات اور مواقع میسر آئے تو اندر سے نکل آیا کہ آخر عراقی فوج پیشہ ورانہ تربیت کے لحاظ سے اتنی ماٹھی نہ تھی اور جدید ہتھیاروں سے بھی لیس تھی تو پھر اتنی جلدی بغداد ڈھے کیسے گیا؟

ہم اب کاظمین کی طرف بھاگے جاتے تھے۔گاڑی چوتھے گیئر میں ڈالتے ہوئے افلاق میری طرف دیکھے بغیر بولا۔

پہلی بات امریکی ڈالروں میں بہت کشش ہے اگر ایمان کمزور ہے۔تاریخ گواہ ہے کہ ماشاءاللہ سے مسلمانوں میں غدّاروں کی کبھی کمی نہیں رہی۔دوسرے حکمران بھی کچھ اتنا پسندیدہ نہ تھا۔میرے خیال میں سب سے بڑی اوراہم بات ہمارے صحرائی کنوئیں بڑی کشش کے حامل تھے۔انہیں فاحشاؤں اورطوائفوں سے سمجھداری اوردانائی سے بچایا جاسکتا تھا جس کی بہر حال ہمارے پاس اشد کمی تھی۔یہ تو موٹی موٹی باتیں ہیں۔تفصیلی اندرونی کہانیاں اگر سننی ہیں تو ذرا دلیری اور جی داری کی ضرورت ہے جو میرے خیال میں آپ میں ہے۔فوج کے ایک ریٹائرڈ کرنل جو صدام کی خصوصی انٹیلی جنس سیل میں بڑا معتمد تھا سے مل لیجیے جو واقعات کے عینی شاہد ہیں۔سوالوں کے جواب تفصیلات کے ساتھ مل جائیں گے۔

''خطرے والا معاملہ ہے کیا؟''میں نے اندر کی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے لہجے کو نارمل کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں پر القاعدہ اور دیگر عسکری گروپوں کے ساتھ ہمدردیاں تو ہیں نا اُن کی۔''

لمحے ذرا بوجھل ہوگئے۔پانچواں دن تھا اور ہر صبح ہوٹل میں میرے باہر نکلنے سے پہلے مروان کوئی دس بار تاکید کرتا تھا۔احتیاط کا دامن نہیں چھوڑنا۔میں نے افلاق کو

دیکھا۔اندر کی تیز دھڑکنوں پر قابو پایا۔

''اُوپر خدا اور نیچے تم تو ڈر کس بات کا؟ جہاں جہاں سے جو جو مل سکتا ہے وہاں وہاں لے چلو۔سفر تو کھوٹا نہ ہو۔''

''چلیے میں رابطہ کرتا ہوں۔کل پر رکھیے۔''

ٹیکسی سٹینڈ پر اپنے عبایا کو سنبھالتی اور سر کے ڈوپٹے کو ٹھیک کرتے میں نے زمین پر قدم رکھا۔افلاق نے دروازہ بند کیا اور میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔اس کی چھاتی پر روز کی طرح بوسہ دیتے ہوئے میں نے حسبِ معمول سو ڈالر کا نوٹ اس کی جیب میں ڈالتے ہوئے اُسے خدا حافظ کہا۔

چیک پوسٹ سے گزرنے اور ہوٹل تک کے راستے میں اردگرد کے منظروں کی جگہ آج میرے ساتھ ایک سوچ تھی۔رات کے سنگ خوف، ڈر اور مایوسی کے جو عناصر چمٹے ہوئے ہوتے ہیں اس وقت وہ سب مجھ پر غالب تھے۔

اس وقت میں چاہ رہی تھی کہ سابقہ دنوں کی طرح ہوٹل کے مرکزی دروازے سے اندر گھستے ہی میرا سامنا مروان سے نہ ہو۔شاید کہیں ڈر تھا کہ وہ مجھے منع کرے گا۔روکے گا۔وہ حسبِ معمول اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا۔مجھ پر نظر پڑتے ہی اُسنے اپنے چہرے پر مسکراہٹ بکھیری اور چاہا کہ میں ٹھہر کر اُسے دن بھر کی کارگزاری سناؤں۔مجھے رُکے بغیر آگے بڑھ جانا اچھا ہی نہیں لگا۔اور جب باتیں شروع ہوئیں تو صدر سٹی جانے والی بات بھی ہو گئی۔مروان نے تفکر سے مجھے دیکھا اور کہا۔

''وہاں جانے کی غلطی مت کریں۔بغداد کا خطرناک ترین علاقہ جہاں ہمہ وقت گیارہویں عراقی آرمی ڈویژن گردش میں رہتی ہے۔کنکریٹ کی لمبی Seperation Walls نے اُسے بقیہ بغداد سے الگ کر رکھا ہے۔چیک پوستوں پر بکھیے اُدھڑتے ہیں۔

سب سے زیادہ جانی نقصان وہاں ہوتا ہے۔آئے دن بم بلاسٹ ہوتے ہیں۔"

جب اُس کے پاس سے اٹھی تو جیسے دم شکستہ سی تھی۔جیسے بجھی بجھی سی۔بندہ کتنا بھی دلیر کیوں نہ ہو سڑکوں پر، چوراہوں پر اپنے وجود کو ٹکڑوں میں کٹے پھٹے تو نہیں دیکھنا چاہتا۔

کمرے میں بوڑھیاں حسبِ معمول باتوں میں مصروف تھیں۔

''جانے کہاں کہاں کی آوارہ گردی کرتی آرہی ہے۔اُن کے چہروں پر سجا میرے لیے یہ پوسٹر بڑا واضح تھا۔"

''جہنم میں جاؤ۔''میں نے بستر پر لیٹتے ہوئے لعنت بھیجی۔

ساری رات بس خدشات کی گھمن گھیریوں میں کٹی۔

صبح سویرے اُٹھ کر عالی مقام جناب ابو موسیٰ کاظم کے مزار کی جانب بھاگی کہ کمرے میں تو منجی پر منجی چڑھی ہوئی تھی۔جائے نماز جوتیوں والی جگہ پر بچھا کر ''چنگی آں یا مندی آں صاحب تیری بندی آں'' جیسا من پسند راگ الاپنا تو بڑا گھٹیا کام لگا۔چلو وہاں تقدس بھرا ماحول تو ہوگا نا اور رَدوری بھی نہ تھی۔دو چھلانگوں والا معاملہ تھا۔سو نماز کے بعد پھیلی ہتھیلیوں پر صاحب جی آکر بیٹھ گئے اور بندی ان کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

''اب اِس اتھری بندی کا تجھے ہی خیال کرنا ہے۔وہاں وہ سامی ٹامی یا ان کے مقامی چیلے چانٹے ریڈ کردیں۔پکڑی جاؤں اور پاکستانی دہشت گرد کے نام پر سیدھی ابوغرب Abu-Ghrab کی سلاخوں کے اندر۔

اور ہاں لُور لُور پھتے کی طرح سارا دن پھرتی ہوں۔وقت تھوڑا ہے اور ہابڑا اپڑا ہوا ہے۔اب تجھے تو معلوم ہی ہوتا ہے کہ بموں نے کہاں کہاں پھٹنا ہے تو وہاں نہیں لے جانا مجھے۔دیکھنا پیچھے بچے چھوڑ کر آئی ہوں۔انہیں تو میری کچھ اتنی شاید چاہ نہ ہو پر مجھے تو

ہے نا ۔ کِکو بنا ڈالیں گے ۔ بڑھ بڑھ کر باتیں کریں گے ۔ بڑی شوقین تھی ایڈونچرس بننے کی ۔ بوٹی بوٹی ہو گئی ہو گی اجنبی جگہوں پر ۔ جنازے کا بھی بیڑہ کر دیا ۔

تو خوف کا کھیتا رسّس ہو گیا ۔

گاڑی میں بیٹھ کر میں نے باہر دیکھا تھا ۔ نیلے آسمان کا دامن داغ دھبوں سے پاک تھا ۔

دھوپ شعلے بھڑکاتی آگ کی مانند بھڑکیلی اور گرم تھی ۔ رات کے آنچل سے بندھے اندھیرے میں پلتا ڈر، خوف، نا اُمیدی اور مایوسی کہیں نہیں تھی ۔ دن کی روشنی اُمید اور حوصلے میں لپٹی سڑک پر میرے ساتھ ساتھ رواں دواں تھی ۔

گاڑی سرپٹ بھاگنے لگی تھی ۔ ایمہ (Aimma) برج سے اعظمیہ کے علاقے میں داخل ہوئے ۔ المغرب سکوائر AL-Maghrib Square سے مُڑے ۔ دائیں جانب نجب پاشا اور بائیں جانب المغرب کی آبادیوں کو دیکھتے آگے بڑھتے گئے ۔ کہاں کا ڈر اور کیسا خوف؟ میں بغداد کو دیکھ رہی تھی ۔ آبادیوں کے درمیان سے گزر رہی تھی ۔

کھجور کے درختوں سے سجی کشادہ سڑکوں اور خوبصورت پانچ منزلہ چھ منزلہ عمارتوں کے فلیٹوں کو دیکھتے ہوئے ہم مختلف آبادیوں سے گزرتے گئے ۔ بغداد کا یہ مضافات بہت سی چھوٹی بڑی بستیوں میں گھرا ہوا ہے ۔ یہاں ایسے علاقے بھی تھے جو نچلے متوسط طبقے کے تھے ۔ ہمارے ہاں کی قصباتی جگہوں جیسے جہاں دُھول مٹی اُڑتی ہے ۔ بچے اُسی دُھول مٹی میں کھیلتے ہیں اور ریک دو دو منزلہ گھر اپنی غربت کا رونا روتے ہیں ۔

بجلی کی وائرنگ تاریں کہیں چھوٹی چھوٹی گلیوں کے مکانوں کے بنیروں کو اور کہیں دیواروں کو چُھوتی بے ہنگم انداز میں گھروں کے اندر داخل ہوتی ہیں ۔ دو گلیاں جو میں پیچھے چھوڑ کر آئی تھی ان کی حالت انتہائی ابتر بیچوں بیچ گندے پانی سے بھری نالیاں جو آگے جا کر

چھپٹر سے بناتی تھیں جہاں شاپر اُڑتے اور مرغولوں کی طرح فضا میں بکھرتے عجیب سے تاثرات کوجنم دیتے تھے۔

تموز Tammuz سے آگے امام علی سٹریٹ سے اشبیلہ میں داخل ہوئے۔یہاں سے آگےصدرسٹی کا علاقہ تھا۔مختلف سڑکوں کے تیز رفتاری سے موڑ کاٹتے ہوئے افلاق کی حسب معمول کنٹری جاری تھی۔

صدرسٹی بغداد کے مضافات کاوسیع وعریض علاقہ جو1950ءمیں عبدالکریم کے زمانے میں تعمیر ہوا۔یہ صدام سٹی تھا۔ ایک نام اس کا Tawara District بھی ہوا۔ اب یہ صدرسٹی ہے۔

یہ شیعہ اکثریت کا علاقہ ہے۔ پہلے یہاں ایک دو سُنیوں کے محلّے بھی تھے مگر آہستہ آہستہ وہ لوگ گھروں کو بیچ باچ گئے۔

علاقہ ملا جلا تھا۔بہت خوبصورت گھروں اور پارکوں والا اور ماڑھا سا بھی۔گرین زون پر زیادہ حملے یہاں سے ہوئے اور مزاحمت موثر ترین بھی اسی علاقے سے ہوئی۔وجہ اتحادی افواج کا بصرہ پر قبضہ اور اس کی بربادی تھی۔بصرہ میں شیعہ آبادی کثرت میں ہے۔دوسرے مقتدری الصدر گروپ کا ترجمان اخبار Al-Hawza کا بند کرنا تھا۔

''یہ صدرسٹی کی سب سے بڑی مارکیٹ جمیلہ مارکیٹ ہے۔افلاق کے ہی اشارے پر میں نے ال امام علی جنرل اسپتال کو دیکھا۔

مجھے تو علیحدگی والی دیوار کہیں نظر نہیں آئی تھی۔نہ میں نے عراقی یا امریکی سپاہیوں کو دیکھا تھا۔افلاق ہنس پڑا تھا۔ہم اس دھرتی کے باشندے ہیں چور راستوں کا اگر ہمیں علم نہیں ہوگا تو پھر کن کو ہوگا؟ یہ خوبصورت علاقہ تھا۔

گھر کے سامنے بڑا خوبصورت پارک تھا۔ہرے رنگ کا بڑا سا گیٹ تھا۔بیل

bell بجانے کا فائدہ نہ تھا کہ بجلی نہیں تھی۔من وعین لاہور کی کسی پوش آبادی کا منظر تھا۔ دستک پر کوئی گیارہ بارہ سالہ لڑکا ہاتھوں میں چھوٹے گیٹ کا پٹ تھامے وہی استقبالیہ کیفیات آنکھوں میں لیے نمودار ہوا۔

بہت کشادہ صحن تھا۔جس کی مشرقی دیوار کے ساتھ کھجور کا چھوٹا سا درخت تھا۔ دس بجے کی بلتی سڑتی دھوپ آنگن کے صرف ایک حصے پر براجمان تھی۔صحن میں لٹکی تار پر مردانہ کپڑے پھیلے ہوئے تھے۔کمرے میں داخل ہونے سے قبل میری نظریں یونہی داہنی سمت والے دروزے کی طرف اُٹھ گئیں جو کُھلا تھا۔ایک نظر کی تا کا جھانکی نے بہت خوبصورت کشادہ سے آنگن اوراس میں ایک دومنزلہ گھر کا نظارہ پیش کیا تھا۔

ایک معمر مرد باہر نکلا تھا۔چہرے پر میٹھی سی مسکراہٹ کے ساتھ اھلاً وسہلاً کہتا ساتھ میں بتا تا کہ گھر میں ایک مہمان آیا ہوا ہے جس سے ملنا خوشگوار ہوگا۔اندر کمرے میں داخلہ ہوا۔بجلی نہ ہونے کے باوجود کمرہ کچھ اتنا گرم نہ تھا۔پنکھا چلتا تھا۔یقیناً یو پی ایس کی مہربانی تھی۔میں نے بیٹھنے کے ساتھ کمرے میں دیکھا۔گہرے سُرخ خوش رنگ پھولوں سے سجے قالین پر ایک جانب دو میٹرس اُوپر نیچے دھرے تھے۔دوسری طرف صوفہ پڑا تھا اور قالین پر ایک اُدھیڑ عمر کا مرد جو ہمارے اندر داخل ہوتے ہی کھڑا ہو گیا موجود تھا۔

پچاس پچپن کے ہیر پھیر میں جس نے استقبال کیا تھا وہ بصیر الحانی پہلے آرمی میں کرنل تھا۔وہاں سے صدام کی خفیہ ایجنسی میں بھیجا گیا۔جنگ کے دنوں میں گرین زون میں تھا۔سچا اور کھرا عراقی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا انسان بھی تھا۔کولکوں کی دلالی میں منہ کالا کرنے اور کوئی بڑا جھپا مارنے کی بجائے سادگی سے اپنی جگہ کھڑا گردش لیل ونہار دیکھتا تھا۔بزدل تھا۔قناعت پسند تھا۔ساتھی گُھنا کہتے تھے۔چُپ چاپ سُن لیتا تھا۔ جب کالی اور چٹی ٹانگوں کے نیچے وزنی بوٹ دگڑ دگڑ کرتے قیمتی اشیاء کو روندتے ٹھوکریں

مارتے محل میں داخل ہوئے تو وہ کھڑا ٹکر ٹکر دیکھتا اور صرف یہ سوچتا تھا کہ وہ جاہ جلال، وہ دبدبہ، وہ کروفر سب کیسے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے ہیں۔یہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔

اُس کی یادوں میں اتحادی فوجوں کے وہ لوگ بھی تھے جو کمروں میں جاتے، برآمدوں میں کھڑے ہوتے تو رُک رُک جاتے۔ان کی آنکھوں میں اُمنڈتی حیرتیں اوران کے رُکتے قدم یہ بتاتے تھے کہ اُن کی سوچیں کیا ہیں؟مسلم دُنیا کےایک سربراہ کا اِس درجہ کروفر ،ایسا شاہانہ انداز زندگی؟ایسا تو اُس کا بھی نہیں جو دُنیا کا بادشاہ ہےاور جس کی فوجیں یہاں مارو مار کرتی آئی ہیں۔

اس عمر کے دوسرے بندے کا نام فارس مہدی تھا۔امریکہ سے ایرو ناٹیکل انجنیرنگ میں تربیت یافتہ۔پہلے جماعت الفاتحین میں شامل مزاحمت کی تاریخ مرتب کر رہا تھا۔بعد میں القاعدہ میں شامل ہوگیا۔روس امریکہ جنگ میں جہاد کےجذبوں سےلدا پھندا پاکستان پہنچا تھا۔پشاور حیات آباد میں تین ماہ کےتربیتی کورس میں شامل ہوا۔آئی ایس آئی کے چند افسروں کےنام بھی اُس نے لیے جن سے اُس کی دوستی تھی۔

میں نے دلچسپی اور حیرت سے اُسے جو کل کا ہیرو، آج کا زیرواور مانا ہوا دہشت گرد تھا کو دیکھا تھا جس نے اجنبی جگہ پر بیٹھ کر میرے وطن کی بات کی تھی۔وہ کسی حوالے سے بھی تھی مجھے اچھا لگا تھا۔مثبت اور منفی کی بحث کے بغیر۔یوں شکوک و شبہات کی پرچھائیں سی میرے دماغ سے اُٹھ کر میری آنکھوں میں آگئی تھیں۔شیعہ آبادی کی اکثریت والےعلاقے میں القاعدہ کا یہ سرگرم کارکن کیسے؟اورسوال ہونٹوں پربھی آ گیا تھا۔

جواب میں سُننے کو جوملا وہ یوں تھا کہ وہ تو خود شیعہ مسلک سے ہے پر شیعہ سُنی اتحاد کا بہت بڑا علمبردار ہے۔اُس کا دشمن صرف امریکہ ہے۔حُلیے بدلنے میں اُسے کمال

حاصل ہے۔بصیر الحانی کوتو گورو کی طرح مانتا ہے۔ممکن نہیں کہ بغداد آئے اور ملے بغیر چلا جائے۔رات کو کوئی گیارہ بجے آیا تھا۔میرے لیے یہ بھی ایک خوشگوار اور مسرت آمیز بات تھی کہ وہ انگریزی اچھی بولتے تھے۔عراقی پڑھی لکھی قوم جس کے ریڑھی والے بھی انگریزی کا دال دلیہ بخوبی کر سکتے ہیں۔

عراقی فوج کے بارے میں جو میری معلومات تھیں اُن ہی کی روشنی میں میرا سوال ہوا۔بصیر الحانی نے میرے تاثرات اور اندازوں کی نفی کی۔

''سیٹلائٹ ٹیکنالوجی اور انتہائی جدید ہتھیاروں سے لیس عراق میں داخل ہونے والی فوج تقریباً پونے تین لاکھ تھی۔اس کا بھلا ایک ایسی فوج سے مقابلہ کیونکر ممکن تھا جو اسلحے اور تربیت کے لحاظ سے بہت کمتر تھی۔خلیجی جنگ نے بھی خاصا نقصان پہنچایا تھا۔تاہم پھر بھی اگر غداری جیسا اہم عنصر نہ ہوتا تو یقیناً آنے والوں کو فوری سبق مل سکتا تھا۔

میں آج تک اِس بات کا تجزیہ نہیں کر سکا کہ صدام کو آخر اپنی کس فوجی قوت پر ناز تھا؟ جنگ سے کافی پہلے عراق کے فوجی تجزیہ نگاروں نے اپنی رپورٹوں میں بھی یہ واضح کر دیا تھا۔

مجھے وہ میٹنگز یاد ہیں۔سینئر عراقی فوجی افسروں کے ایک جنرل نے کہا ''سر! سی آئی اے کے پاس ہماری فوج کے بارے میں بہت اہم معلومات ہیں۔فوج میں خرید و فروخت ہو رہی ہے۔ہماری منصوبہ بندیاں، تیاریاں، حفاظتی انتظامات اُس معیار کے نہیں ہیں جو ایک بڑے دشمن کا مقابلہ کر سکیں۔

دبے لفظوں میں ایک کرنل نے یہ اظہار بھی کر دیا۔''آپ عراق سے محبت کرتے ہیں۔اِس محبت کا تقاضا آپ کی حکومت سے علیحدگی ہے۔''

عراق بچ سکتا تھا۔

پر ہٹ دھرمی اور انا پرستی نچلا بیٹھنے ہی نہ دے رہی تھی ۔تو پھر یہی کچھ ہوتا ہے جو ہمارے ساتھ ہوا۔

کمرے میں قہوہ لے کر آنے والا بھی ایک عمر رسیدہ آدمی تھا۔ٹرے کو سلیقے سے قالین پر رکھتے ہوئے وہ ساتھ ہی بیٹھ گیا۔پلیٹ میں جو کھجوریں تھیں وہ سیاہی مائل جامنی سی تھیں اور بصرے سے آئی تھیں ۔بصرے کا نام سُنتے ہی لاشعور میں گونجتی آوازیں یلغار کرتی سامنے آ گئی تھیں ۔ریڑھی بانوں کی صدائیں، بصرے کی کھجوریں ۔کھجوریں بڑی رسیلی تھیں ۔تلوں سے بھرا خوشبو اُڑاتا تازہ سمون بھی تھا۔

''لگتا ہے خاتون خانہ نے اِسے ابھی بیک کیا ہے۔''میں نے کھجور منہ میں ڈالی ۔قہوے کا گھونٹ بھرا اور سمون کو توڑنے کیلئے ہاتھ بڑھایا۔

بصیر الحانی مسکراتے ہوئے بولے''ارے نہیں ۔خاتون خانہ تو ناصریہ اپنے میکے گئی ہیں ۔بچوں کو تعطیلات تھیں ۔ملازم نے بنایا ہے۔''

قہوے کے گھونٹوں نے وہ سارے دن میری آنکھوں کے سامنے لاکھڑے کیے تھے جب میں ٹی وی پر عراق کے وزیر اطلاعات سعید الصحاف کی بڑھکیں سُنتی تھی ۔

بغداد کو سٹالن گراڈ بنانے کے عزم کا اظہار ہوتا ۔امریکی فوجوں کیلئے عراق قبرستان بنے گا جیسی بڑی بڑی باتوں کا شور تھا۔

سچی بات ہے ایسے اُمید بھرے دعوے۔آمین آمین کہتے زبان سوکھتی ۔دعائیں وجود کے ہر ریشے سے اُٹھتی تھیں ۔امریکہ پر لعن طعن اور کوسنوں کے سلسلے جاری تھے۔ وہ منظر میری یادداشتوں میں ہمیشہ کیلئے محفوظ ہے جب میں ٹی وی کے سامنے سے نہ ہٹتی تھی اور میری اپنے شوہر سے لڑائی ہوتی تھی جو مجھے کہتے تھے''رحم کرو اپنے اُوپر تمہارا بلڈ پریشر کتنا شوٹ کر رہا ہے اِن دنوں ۔''

ایسے ہی دنوں میں جب میرے اپنے وطن کے چند تجزیہ نگار جنہوں نے حالات کا بڑی سفا کی سے تجزیہ کیا تھا بڑے زہر لگے تھے۔تب بار ہا دُعائیں کیں کہ اللہ تعالیٰ صدام جلا وطن ہو جائے۔ہار مان لے۔جھک جائے۔اِس کمبخت ہلاکو خان کا مقابلہ کرنا بہت مشکل ہے۔

ایک دن پہلے دیکھتی تھی پارلیمنٹ کی کاروائی۔عربی میں یہ کاروائی کچھ اتنی میری سمجھ میں نہ آتی تھی پر پھر بھی اِدھر اُدھر کے چینلوں سے جان جاتی تھی۔جس صبح حملہ ہوا پی ٹی وی کی پہلی خبر نے لرزا کر رکھ دیا۔

تو وہ منحوس گھڑی آگئی۔آنکھوں میں آنسو،لب پر دُعائیں۔اور جب بغداد جل رہا تھا میں خود سے پوچھتی تھی۔''وہ آخر اتنی فوجیں کیا ہوئیں؟

ڈھائی کروڑ آبادی والے مُلک کی باقاعدہ فوج کوئی چار لاکھ کے قریب ری پبلیکن گارڈز بھی،ریزرو فوج بھی۔ہرشہری لازمی دو سالہ فوجی تربیت کا ٹرینڈ،ہر گھر میں چھوٹا موٹا اسلحہ موجود،تو مدافعت شاندار طریقے سے کیوں نہ ہوئی؟''

تو میں داستان سُنتی تھی اِس اتنی جلدی ڈھے جانے کی فارس مہدی سے۔

''بغداد نے کیا مزاحمت کرنی تھی۔آپ کا دشمن عیار،ذہین،ہر کام کی وقت سے پہلے منصوبہ بندی کرنے والا۔گلف وار میں اُس نے آئل ریفائنریوں،واٹر سپلائی پائپ لائنوں،بجلی گھروں اور مواصلات کو تباہ کر دیا تھا۔کیونکہ اس کے پروگرام میں قبضہ شامل نہیں تھا۔گو اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ خلیجی جنگ کے بعد بحالی کا کام ہنگامی بنیادوں پر ہوا۔بغداد کو دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجانے کی کوشش ہوئی تھی۔اگر ڈیفنس منسٹری کی عمارت کو نہ دیکھا جاتا جو ابھی بھی اسی حالت میں ہے۔

لیکن جب وہ قبضے کی نیت سے آئے تو ایسی ہر چیز کو بچایا گیا جس کی انہیں

ضرورت پڑتی تھی۔بجلی پوری طرح موجود تھی۔دجلہ کے کسی پل کو ٹارگٹ نہیں کیا گیا۔ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشن کام کرتے تھے۔کہیں ہلکا پھلکا سا چھینٹا لگایا گیا ہو گا ورنہ احتیاط کی گئی۔
فوج کے سرکردہ لوگ بِکے۔ری پبلکن گارڈز بِکے۔

وہ میرا عزیز الجبوری تو سب سے بڑا غدار ثابت ہوا توڑ جوڑ کا ماہر غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک۔بعث پارٹی میں اپنے کاموں کی وجہ سے وہ بہت جلد صدام کی نظروں میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہوا تھا۔اسی لیئے وہ صدام کے انتہائی خوفناک خفیہ سکواڈ میں متعین ہوا۔صدام کے مخالفین کے بارے میں معلومات حاصل کرنے،اُنہیں پار لگانے اور اذیتیں دینے میں بھی اُس کا جواب نہ تھا۔ایک طویل عرصہ اُس نے خدمات انجام دیں۔صدام کا معتمد تھا تو پیسے کی ریل پیل تھی اس کے پاس۔یہی چیز اُس کے بعض رشتے داروں کو کھلتی تھی۔ہم تکرتی لوگ ہیں۔ہمارے قبیلے کی اکثریت سُنی پر تھوڑی شیعہ بھی ہے۔قبیلہ میں جدّی دشمنیاں اور دوستیاں تو چلتی رہتی ہیں۔چند لوگوں نے فساد برپا کرنے کی کوشش کی جس کا نزلہ الجبوری پر پڑا۔صدام نے اُسے فارغ کر دیا۔

وہ قصوروار نہیں تھا۔یہ میں جانتا ہوں۔ظاہر ہے وہ ہرٹ ہوا تھا۔ سارا رعب،دبدبہ،شان و شوکت ختم ہو گئیں۔پر اب اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ آپ سی آئی اے کے آلہ کار بن جائیں۔

وہ چھ فٹ تین انچ لمبی قامت اور مظبوط اعصاب کا مالک تھا۔اُردن میں وہ Iraqi National Accord میں جا شامل ہوا جو صدام کا شدید مخالف کیمپ تھا۔ سی آئی اے کو بھی عراق کیلئے کسی تگڑے بندے کی ضرورت تھی۔سی آئی اے کے افسروں نے عمان میں اُس سے لمبی ملاقاتیں اور مذاکرات کیئے۔وہ انہیں متاثر کرنے میں کامیاب ہوا۔تنخواہ کے معاملات فائنل ہونے کے ساتھ اُسے چند اور لوگوں کے ساتھ

امریکہ بھیج دیا گیا۔ ٹیکساس سٹیٹ کی ایک دُور افتادہ جگہ پر انہیں کندن بنانے کیلئے جسمانی و ذہنی ہر مشقت سے گذرا گیا۔

اور پھر اُسے ڈالروں کے بورے اور جدید آلات کے ساتھ عراق بھیج دیا گیا جہاں اُس نے اپنے پرانے رفیقوں کو خریدا۔ عراقی نیشنل کانگرس کے افراد پہلے ہی صدام کے خلاف کام کر رہے تھے۔ وہ بھی مل گئے۔ صدام انٹرنیشنل ایرپورٹ پر امریکی قبضہ صرف اور صرف ان کی وجہ سے بہت جلد ہوا۔

ذرا بدقسمتی دیکھیے۔ فارس مہدی نے غالباً کوئی خاص بات بتانے کیلئے مجھے متوجہ کیا تھا۔ خود تو بِکے، مال بٹورا ضمیر بیچا پر دیگر عرب ممالک سے آنے والے جذبۂ جہاد سے سرشار مجاہدین کا بیڑہ غرق کر دیا کہ اُن سے بڑے بڑے ہتھیار یہ کہتے ہوئے لے لیے گئے کہ اُن کی فوج کو اس کی ضرورت ہے۔ یہ مُٹھی بھر لوگ کتنی دیر تک مزاحمت کرتے؟ سب شہید ہو گئے۔

بغداد کے اہم مقامات پر کمانڈروں نے فوج کو جوابی فائرنگ نہ کرنے دی۔ انہیں نئی حکومت میں اُونچے عہدوں کی پیشکش اور بھاری انعام مل چکے تھے اور وہ جو وفادار تھے وہ غداروں کے احکام ماننے پر مجبور تھے۔

موبائل کی بیل Bell بجی۔ کمرے میں عربی کی خوش گفتاری کے پھول کھلنے لگے۔ گفتگو ختم ہوئی تو انہوں نے کہا۔

ہاں اِس کہانی کا ڈراپ سین ذرا سُن لیجیے۔

الجبوری اور اُس کے کئی اہم ساتھیوں کو حکومت میں کوئی عہدہ دینا تو بڑی بات انہیں اپنی ذاتی حفاظت کیلئے اسلحہ رکھنے کی اجازت بھی نہیں ملی۔ وہ ہِٹ لسٹ میں نمبر ایک پر ہیں۔ امریکہ آپ کو اپنے مفاد کیلئے استعمال کرتا ہے۔ آپ پر قربان ہو ہو جاتا ہے پر

مطلب نکل جانے پر آپ کو دیکھتا تک نہیں۔

افغانستان کے بارے میں اُن کے تاثرات جاننے کی میری خواہش پر وہ بولے۔

''دُنیا انہیں اُجڈ، گنوار، جاہل اور جانے کن کن خطابات سے نوازتی ہے۔ پر وہ بڑی تیز اور جی دار قوم ہے۔ ٹوٹی چپلوں کے ساتھ چھلانگیں مار کر جہازوں میں بیٹھتی اور انہیں اڑاتی ہے۔ امریکہ کو بیوقوف بنانے کا فن جانتی ہے۔ کیا فوج، کیا پولیس، کیا ایجنٹ۔ جدید ہتھیاروں کی سپلائی طالبان کی سرکوبی کیلئے حاصل کرتی ہے۔ طالبان سے سودے بازی کر کے باقاعدہ منصوبہ بندی سے نورا کشتی کا اہتمام کرتے ہوئے امریکیوں کو پیغام دیتی ہے کہ طالبان لُوٹ کر لے گئے ہیں سامان۔ مزید دو۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ گروہوں اور قبائل میں بٹی قوم جس کا بہت بڑا مسئلہ اُس کی معاشرتی یک جہتی کا ہے۔ خالصتاً ایک قبائلی ملک جس میں پشتون، ازبک، تاجک، ہزارہ اور کچھ دیگر قومیتیں ہیں۔ قبائلی خوانین اور سردار جو بے حد طاقتور اور اہم ہیں یہی لوگ جنگ کے زمانے میں وار لارڈز بن کر امریکہ سے ڈالروں کے بورے سمیٹتے رہے اور بجائے اپنے مفلوک الحال لوگوں کی بہتری پر خرچ کرنے کے اپنی جیبیں بھرتے اور خود کو مظبوط کرتے رہے۔ غربت اور پس ماندگی اِن لوگوں کا مقدر بنا دی گئی ہے۔

''کاش اُسامہ بن لادن اُن کوہستانی لوگوں کیلئے علم اور ٹیکنالوجی کے راستے کھولتے۔ کالج اور یونیورسٹیاں بناتے تو کیا یہ بہتر نہ ہوتا۔ میری اندر کی پرانی خواہش میرے ہونٹوں پر آ گئی تھی۔

''بات علم اور ٹیکنالوجی کی نہیں۔ بڑی طاقتوں کے غلبوں اور حرص کی ہے۔

آپ اور آپ جیسے ترقی پسندوں کو یہ فدائی مجاہدین دہشت گرد نظر آتے ہیں۔ آپ کا کہنا ہے کہ ہمیں مغرب کا مقابلہ علم اور ٹیکنالوجی کے زور پر کرنا چاہیئے۔

مجھے اتفاق ہے اس سے۔علم مومن کی میراث ہے۔کوئی شک نہیں مگر وہ جو صاحب علم ہیں متمدن ہیں۔کلچرلڈ اورانسانیت کے علمبردار ہیں۔کیا کررہے ہیں وہ؟کتے بلیوں کیلئے انکی ممتا پھٹی جاتی ہے مگر عراق کے معصوم بچے،عورتیں اور بوڑھے جس بربریت کا شکار ہوئے ہیں اس کے لیے کیا کہیں گی۔

دفعتاً انہوں نے مجھ سے پوچھا ''آپ بغداد کے کسی اسپتال میں گئیں۔ میں نے صاف گوئی سے کام لینا زیادہ مناسب سمجھا تھا۔جواباً بتایا کہ بغداد آتے ہی اسپتالوں میں جانے اور اُن زخموں کو دیکھنے کیلئے میں جتنی زیادہ پرجوش تھی۔ایرموک اسپتال اورالمنصور Pediatric اسپتال میں ایک ایک بار کی وزٹ نے مجھے اِس درجہ مضطرب اور بےچین کیا کہ میں نے مزید اسپتالوں کا رُخ نہیں کیا۔جنگ کے پانچ چھ سال گزر جانے پر بھی میں نے Lymphatic Cancer،ٹیڑھی میڑھی ٹانگوں،پھولے پیٹوں،مدقوق چہروں،بجھی آنکھوں اور ٹیڑھے میڑھے ہاتھوں والے بچوں کی اکثریت دیکھی تھی۔میرے تو آنسو خشک نہ ہوتے تھے۔نسلیں تباہ کردی ہیں بدبختوں نے۔

دُکھ سے لبالب بھرا بڑا لمبا سانس تھا جو اُس نے بھرتے ہوئے کہا تھا۔

''یورینیم Uranium شیلوں کی بھرمار نے ماحول کو،زمین کو اور پانیوں کو زہر آلود کردیا ہے۔اب غریب لوگوں نے اُس زمین میں آلو،ٹماٹر پیاز تو اُگانے ہیں۔کھانے بھی ہیں اور شکار بھی ہونا ہے۔اب اِس صدر سٹی کا حال سُن لیجیے جہاں بم شیلنگ نے بڑے بڑے گڑھے پیدا کردیئے ہیں۔پینے کے پانی اور سیوریج کے پائپوں میں سوراخ ہوجانے سے دونوں کے پانی مل گئے ہیں۔اب زہر پیا جارہا ہے۔کرفیو لگتا ہے تو کھانے پینے کی چیزیں مارکیٹ سے غائب اور اگر کچھ ملتا ہے تو دس گنا زیادہ قیمتوں پر۔ایسے میں عراق کی ماہر سائنس دان مائیکرو بائیولوجی میں پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہدا مہدی اماش جب اس پر آواز

اٹھاتی تھی اِس ثبوت کے ساتھ کہ عراقی فصلوں اور بچوں میں یہ بیماریاں کبھی پہلے نہیں تھیں جتنی خلیج کی جنگ کے بعد ہوئی ہیں تو اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے اِس الزام کے ساتھ کہ وہ صدام کے Biological Weapons Programm کے سرکردہ لوگوں میں سے ہے۔ یہی سلوک ہماری دوسری سائنس دان ڈاکٹر رہاب طہٰ Rihab Taha کے ساتھ ہوا۔

اُن کی گھناؤنی حرکتیں دیکھیں تو ہم بیچارے بڑے معصوم نظر آتے ہیں۔ سوال تو بہت سارے پوچھے جاسکتے ہیں۔ جائز اعتراضات کی بھی ایک لام ڈور ہے کہ آخر یہ کیمیائی مواد صدام کے ہاتھ بیچا کیوں گیا؟ اُسے گیس بنانے کی اجازت کیوں دی گئی؟ کردوں اور ایرانیوں کا تخم مارنے کیلئے کہ شاہ ایران کے بعد انہیں مشرق وسطیٰ میں اپنے مطلب کا بندہ چاہیے تھا۔

دسمبر 1998 میں امریکہ اور برطانیہ کے فائٹر جہازوں کے پورے پورے سکورڈن شمالی اور جنوبی عراق کے نوفلائی زون پر کثرت سے پروازیں کرتے تھے۔ جوابی عذر میں اِن علاقوں کے کُرد اور شیعوں کی صدام سے مخالفت اور عتاب سے محفوظ رکھنے کا بہانہ تھا۔ لیکن اقوام متحدہ آفس کی عراق کیلئے نامزد Humanitarian coordinator کی رپورٹ تھی کہ گائیڈڈ میزائل گرنے سے بصرے میں بیسیوں لوگ مرے اور زخمی ہوئے۔ اب پنٹا گون بکواس کرے کہ ایک بھی ہلاکت نہیں ہوئی تو بندہ اِن جھوٹوں کیلئے کیا کہے۔ ٹرکی عراق کے شمالی کُردوں پر اسی نوفلائی زون سے بمباری کرتا ہے تو خاموشی۔ ٹرکی امریکہ کا حلیف ہے نا۔

کتنے دہرے تہرے معیار ہیں اِن بڑی طاقتوں کے۔

ذرا پل بھر کیلئے سوچیے آپ عراقی ہیں۔ آپ کی سرزمین اور اس زمین کے

باسیوں کو بے موت مارا جا رہا ہوتو آپ کیلئے ممکن ہے کہ آپ نہ بولیں ۔اپنی آواز بلند نہ کریں۔نتیجتاً گرفتاری، جیل جانا اور پھانسی کے پھندے پر چڑھنا آپ کا مقدر بنتا ہے۔آپ ہتھیار اٹھاتے ہیں بقول اِن بڑے ملکوں کی وضع کردہ اصطلاح کے دہشت گرد بن جاتے ہیں۔خود مرتے اور دس لوگوں کو مارتے ہیں۔مگر یہ سب ہوگا۔جتنی ہمت،استعداد اور آپ جس مقام پر ہیں آپ نے اُسے استعمال کرنا ہے اگر آپ میں اخلاص ہے اور آپ کو اپنے وطن سے محبت ہے۔

وہی معمر مرد اب ایک بڑی سینی میں کھانا لے کر آیا۔

اُبلے ہوئے چاولوں کا ڈھیر جس پر بُھنا ہوا گوشت،موٹا کٹا ہوا پیاز، ٹماٹر، کھیرے کا سلاد۔آفتابہ آیا۔وہیں ہاتھ دُھلائے گئے اور سب بمعہ اُس عمر رسیدہ کھانا لانے والے کے سینی کے گرد بیٹھ گئے اور ہاتھوں سے کھانا شروع ہوگیا۔

مساوات محمدیؐ کا ایک نمونہ۔جی چاہتا تھا بوٹی توڑوں پر شرم آئی۔بس تھوڑا سا کھایا۔

''موجودہ حالات کو کس تناظر میں دیکھتے ہیں۔''

''بہت بکھیڑا ہے یہاں۔نہ شیعہ متحد ہیں، نہ سُنّی اور نہ کُرد۔گروپوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے۔سب سے بڑی اور طاقتور عسکریت پسند تنظیم المہدی جس کے سربراہ مقتدا الصدر جو عظیم شیعہ سکالر باقر الصدر کے صاحبزادے ہیں۔دوسری ''البدر'' الحکیم فیملی کی ہے جو محسن الحکیم کا خاندان ہے جن کے ہاں امام خمینی بھی سالوں رہے۔ان دونوں کا بھی آپس میں اکثر ٹکراؤ رہتا ہے۔

سُنیوں میں ایک صدام کا حامی گروپ، دوسرا گُرد سُنیوں جس کے لیڈر مُلا کریکار ہیں۔صدام کا بدترین مخالف اور اب امریکیوں کا جانی دشمن۔تیسرا گروپ عرب مجاہدین کا

انصار اسلام کے نام سے جو چھوٹے موٹے گروپوں کے ساتھ مل کر اتحادیوں کے خلاف اپنے طور پر لڑ رہے ہیں۔

مفادات میں بھی ٹکراؤ ہے۔ مہدی گروپ امریکہ کے ساتھ تعاون چاہتا ہے مگر حکومت میں زیادہ حصّہ شیعوں کا ہو تقاضا کرتا ہے۔ البدر گروپ امریکیوں کو برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں۔

نور المالکی بھی ایک بڑے ویژن کے مالک نہیں۔ سطحی سوچ رکھتے ہیں۔ مختلف مذہبی اور لسانی گروپوں کو ساتھ لے کر چلنے کے حق میں نہیں۔ 2006 سے جب سے انہوں نے چارج لیا ہے حالات زیادہ خراب ہو گئے ہیں۔ کُردوں کی اکثریت شافعی مسلک سے ہے اُن کا اکثریتی قبیلہ بازنجی بھی آزادی کی جدو جہد میں برسر پیکار ہے۔

صدام گروپ ظاہر ہے امریکیوں کے بہت خلاف ہے۔ عام شہری صورتِ حال سے پریشان۔ لازمی فوجی تربیت کے زیر تھوڑے بہت تربیت یافتہ امریکیوں کی پُر تشدد کاروائیوں کے دوران مشتعل ہو کر مزاحمتی دستوں کے ساتھ مل کر اپنے طور پر لڑتے ہوئے مارے رہے ہیں اور مر رہے ہیں۔

اب ان اختلافات سے وہ فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ سیاسی تنظیموں کو استعمال کیا جا رہا ہے۔

پر ہمارے ساتھ ایسے بھی تو بہت سارے ہیں۔ وگرنہ کسی امریکی، کسی اتحادی کی کیا مجال کہ وہ ہمارے پیٹرول پمپوں سے اپنی گاڑی کی 170 لیٹر کی ٹینکی صرف تین ڈالر میں بھروائے۔

بہت سارے کیسوں میں تو امریکی فوج خود خودکش حملے کرواتی رہی ہے۔ مجھے The independent کے رابرٹ فسک کی رپورٹ یاد آئی تھی جو میں نے کچھ عرصہ

قبل پڑھی تھی ۔ایک تو ابھی بھی ذہن سے چپکی ہوئی تھی۔

پولیس میں بھرتی ہونے والے افراد کو نئی گاڑیاں دے کر کہا جاتا ہے کہ فلاں بازار فلاں مسجد یا فلاں علاقے میں جا کر جائزہ لو۔ہمیں فون پر بتاؤ اور ہماری ہدایات کا انتظار کرو۔عراقی جب فون کرتا۔جواب ملتا ہے گاڑی میں بیٹھے رہو اور ہمارا انتظار کرو۔

کچھ دیر بعد گاڑی خوفناک دھماکے سے پھٹ جاتی اور عراق کے ساتھ گردونواح کے درجنوں کبھی سینکڑوں بے گناہ مارے جاتے ہیں اور نام لگتا ہے القاعدہ کا یا دوا شیعہ پارٹی کا۔

کھانے کے بعد پھر قہوہ کا دور چلا۔فارس مہدی نے قہوہ کی گلاسی ٹرے میں رکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا۔

کسی جیل میں گئیں۔ریپ ہونے والی کسی عراقی عورت کی داستان سُنی۔''

ابوغریب جیل دیکھنے کا پروگرام ہے۔

اُسے تو آپ ہائی وے پر سے ہی دیکھ سکیں گی۔اندر تو کسی نے گھسنے نہیں دینا۔

پھر اُس نے افلاق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے عراقی نیشنل ایسوسی ایشن فار ہیومن رائٹس کی میجر ڈاکٹر الدمل یا جی ایف آئی ڈبلیو کی ڈاکٹر ندال جمعہ سے ملائے تاکہ میں اُن سے کچھ سنوں۔

پل جھپکتے میں موبائل جیب سے نکلا۔اُس کے نمبر دبے۔خوشگوار لب و لہجے میں باتیں ہوئیں اور پھر افلاق کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہا گیا۔

''مجھ سے انگریزی میں بولے۔عراق کی مایہ ناز خاتون سے آپ کی ملاقات انشاءاللہ بہت معلومات افزا ہوگی۔''

باب نمبر:14

1۔ ماضی کے ممتاز عرب شاعر ابو نواس ہو یا المتنابی ہو بغداد کی شاہراہوں، چوراہوں پر عظمتوں کا تاج پہنے کھڑے ہیں۔

2۔ 1950 کا زمانہ ادب اور آرٹ کے حوالوں سے عراقی تاریخ کا نشاۃ ثانیہ ہے۔

3۔ جمہوریت کے علمبردار ملک نے عراقی جیلوں کو Taboo خانے بنا دیا۔

ڈاکٹر ندال جمعہ سے ملنا بھی دلچسپ اور خوبصورت یادیں دینے والا تجربہ تھا۔ مگر اس سے بھی پہلے ایک اور مسرور کن تجربے سے دو چار ہونا پڑا۔ کرنل بصیر الحانی کے گھر سے چلے تو پونے دو بج رہے تھے۔ سیدھی شفاف سڑک پر بگٹٹ بھاگتی گاڑی کوئی پندرہ منٹ میں شہدا برج پر آ گئی۔

موسم کی شدت حسب معمول اپنی انتہائے عروج پر۔ تقریباً پانچ بجے تک ڈھائی تین گھنٹے کا یہ درمیانی وقفہ ہر روز مجھے کسی نہ کسی مسجد میں نماز پڑھنے اور آرام کیلئے گزارنا ہوتا تھا۔ خدا کے بعد مشرق وسطیٰ کے مولویوں کی بہت شکر گزار تھی کہ انہوں نے مسجدوں کا ایک حصّہ خواتین کیلئے مخصوص کر رکھا ہے جو دراصل عورتوں کے ریٹائرنگ روم ہیں۔ کھاؤ، پیئو، لیٹو سو جاؤ۔ کانوں میں ہیڈ فون چڑھا کر گانے سنو۔

سچ تو یہ تھا کہ میں اس 1/4 حصّے کو بڑے دھڑلے سے استعمال کر رہی تھی۔ تھوڑا

سا آرام اورتھوڑی سی نیند جسم وجان میں تازگی بھر دیتی تھی۔ ایسے لمحوں میں مجھے ساؤتھ ایشیا کے کٹر اور دقیانوسی ملّا یاد آتے جنہوں نے عورتوں پر مسجدوں کے دروازے بند کرر کھے ہیں۔ ڈرڈر جیسا پوسٹر چہروں پر سجا کر دروازے سے ہی انہیں دفع دور کرتے ہیں۔

افلاق نے مجھے شہدا برج پر مستنصریہ مدرسہ کی ملحقہ مسجد ال آصفہ میں اُتارا۔ دجلہ کے کنارے اس خوبصورت سی مسجد کو میں پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔

لیٹی ضرور تھی مگر نہ آنکھیں بند ہوئیں اور نہ اعضاء نے آرام کی خواہش کی۔ وجہ شاید چلت پھرت کی کمی تھی۔ اٹھی اور باہر نکل آئی۔ ساتھ ہی المتنابی سٹریٹ ہے۔

المتنابی جدید وضع کی بلند وبالا عمارات کی حامل جسکی بالکونیوں کے پیچھے ان کی ریلنگ اوران پر کئے گئے رنگوں اور مارکیٹوں میں بکھرے سامان کے امتزاج سے قوس قزح کی سی دنیا کا تاثر دیتی تھی۔

داخلہ آسمان کو چھوتی محراب سے ہوا۔ کہیں کہیں عمارتوں کی بالکونیاں ایک دوسرے سے جھپّیاں ڈالنے کو مچلتی نظر آئی تھیں۔

عراقی روشن خیال قوم ہے۔ اپنے ثقافتی اور تہذیبی ورثے پر ناز کرنا جانتی ہے۔ انہیں باعزت اور قابل فخر مقام دیتی ہے۔ ماضی کے متنازعہ شاعر ابونواس ہو، المتنابی ہو بغداد کے کوچہ و بازار میں عظمتوں کے تاج پہنے کھڑے ہیں۔ بلا سے کوئی مرتد تھا یا پیغمبری کا دعوے دار۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کوفے میں 915 ہجری میں پیدا ہونے والا المتنابی اپنی شاعری میں پختہ کار تھا۔ قصیدہ گوئی میں کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ تقریباً ساڑھے تین سو نظمیں اس کی داستان زندگی کی بہت سی پرتوں کو کھولتی ہیں۔ اپنی غیر معمولی ذہانت، حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور کلام کی طاقت سے پوری طرح آگاہ تھا۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے۔

''میں وہ ہوں جس کے لکھے ہوئے کو اندھا بھی پڑھ سکتا ہے۔میری شاعری جادوئی اثر رکھتی ہے۔جسے بہرہ بھی سن سکتا ہے۔جو کام تلوار اور تیر کرتے ہیں۔میرا کاغذ قلم اور حرف اُس سے زیادہ موثر ہیں۔''

یہ شاعرانہ صلاحیتوں کی انتہا تھی یا ذات کے تکبّر کا نشہ کہ پیغمبری کا دعویٰ کر بیٹھا۔ رگ رگ میں سیاسی خواہشوں کا ہیجان تھا کہ ہر صاحب اقتدار کی مداح سرائی ضروری تھی۔ایک بغاوت کے نتیجے میں وہ قید بھی ہوا۔قید بامشقت بھی کاٹی اور اپنی خواہشوں میں بھی ناکام ہوا۔مگر شاعر کے طور پر کمال کو پہنچا۔

المتنابی بازار اسی شاعر کی یاد میں ہے۔

میں کتابوں کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی۔یہ کتابوں کا جہان تھا۔ یہاں کتابوں کی دنیا آباد تھی۔صاف ستھرے فرشوں پر بکھری ہوئیں تھڑوں پر ڈھیروں کی صورت پڑی ہُوئیں تختوں پر بچھی ہوئیں۔برآمدوں کے ستونوں سے لگائے عارضی چوبی شیلفوں میں دھری اور بڑی بڑی دوکانوں کی شیشے کی الماریوں میں سجی ہوئیں۔

شاندار مردوں کے پرے کہیں انہیں پھرولتے، کہیں انہیں پڑھتے، کہیں بھاؤ تاؤ کرتے نظر آئے تھے۔کتنی دیر میں نے بھی انہیں دیکھا لیکن وہ زیادہ عربی میں تھیں۔فرنچ میں تھیں جو میرے لیے بیکار تھیں۔انگریزی میں جو چند دیکھیں وہ ایسی نہ تھیں کہ میں انہیں جھپٹ کر دبوچتی۔

میں چلتے چلی جاتی تھی۔برآمدوں کے سایوں میں اور یہ بھی دیکھتی تھی کہ کہیں کہیں اس کے وجود کے کسی چھوٹے سے حصے پر، کہیں بڑے پر جیسے برص کے سے داغ ہیں۔جلنے سڑنے کے، ٹوٹے پھوٹے ہونے کے، شکستگی کے بدحالی کے۔ایسا کیوں ہے؟ بانکپن میں یہ داغ دھبے کیوں؟ رُک کر پوچھا تو جانا کہ کوئی ڈیڑھ سال قبل بم بلاسٹ

ہوا تھا۔جاہلوں نے علم کے اِس مرکز کو تباہ کر دیا۔

نوجوان لڑکے نے مجھے دوکان کے اندر آنے کی دعوت دی۔کرسی پیش کی اور بولا ''بڑا دردناک منظر تھا۔کتابوں کے صفحات ژالہ باری کی صورت برس رہے تھے۔جلتے بالوں، جلتے انسانی گوشت اور دھوئیں کے سیاہ بادلوں نے فضا کو دہشت ناک بنا دیا تھا تخریب کاری نے صفحات کو چاٹ لیا تھا۔بغداد اِس المناک سانحے پر چیخ اٹھا تھا۔

لیکن پوری دنیا میں بکھرے عراقیوں کے پیغامات نے اس کے اندر نئی روح پھونک کر اِسے کھڑا کر دیا تھا۔صفحے جو جلے تھے پھر سے زندہ ہو کر لوگوں کے ہاتھوں میں سج گئے۔المتنابی کی رونقیں لوٹ آئیں۔ہم نے اِس کہاوت کو سچ ثابت کر دیا کہ

Cairo writes, Beirut publishes and Baghdad reads.

میری اِس خواہش پر کہ کیا وہ مجھے کسی ایسے بندے سے ملا سکتا ہے جس سے میں عراقی ادب کے حوالے سے کچھ باتیں کر سکوں۔

''ضرور ضرور''بڑا پرجوش سا لہجہ تھا۔

''آیئے''وہ مجھے ساتھ لیے چلنے لگا۔کوئی چوتھائی فرلانگ پر ایک بہت بڑی دوکان کے اندر داخل ہوئے۔اتنی بڑی دوکان تھی کہ میں حیرت سے گنگ اُسے دیکھے چلی جاتی تھی۔لڑکا مجھے لے کر غربی سمت بڑھا جہاں چند سیڑھیاں اُتر کر ہم ایک تہہ خانے میں اُترے۔یہ تہہ خانہ کب تھا؟ یہ بغداد کا ادبی چہرہ تھا۔جہاں چوبی بینچوں پر دھرے خوبصورت گدّے نما کشنوں پر چند لوگ بیٹھے حقے کے کش لگاتے، بحث و مباحثے میں اُلجھے ہوئے دِکھے تھے۔آٹھ نو کی نفری ناول نگار،صحافی اور شاعروں پر مشتمل جو ولید ال ونداوی،علی جعفر،رسّل ال قیسی، رعید جرار، لولوا کاظم۔جنہوں نے پرجوش انداز میں استقبال کیا، کھڑے ہوئے،عزت دی۔

میں نے کمرے میں نظریں دوڑائیں ۔مناسب سہولتوں سے سجا سنورا کمرہ جس کی سامنے والی دیوار پر آراستہ بڑی سی تصویر المتنابی سٹریٹ میں بچھے صوفوں پر بیٹھے وزیراعظم نورالمالکی کے ساتھ کتب خانہ الفردوس کے مالک کی تھی جو بڑا نمایاں نظر آتا تھا۔یہ سب مجھے تعارف کے وقت معلوم ہوا تھا۔تصویر کے متعلق بھی وضاحت ہوئی تھی کہ بم بلاسٹ کے بعد حکومت اور وہ سب جنہیں کتاب سے محبت تھی ۔جنہوں نے گہرے دُکھ اور یاس کا اظہار کیا تھا۔وہ لفظ کے تقدس اور اس کی حرمت کیلئے حکومت کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہوئے ۔فوری کوششوں سے اس کی بحالی ہوئی ۔صرف ڈیڑھ سال میں انہوں نے اس کی رونقیں لوٹا دیں۔اور تخریب کاروں کو پیغام دیا تھا کہ تمہاری تخریب کاری نے وقتی طور پر حرف جلا ڈالے مگر دیکھو ہم نے انہیں پھر سے زندہ کر دیا ہے۔

گفتگو کے دروازے کھلنے لگے۔ادب اور آرٹ کے حوالوں سے جب باتیں شروع ہوئیں تو وہ سب گفتگو میں یوں شامل ہوئے کہ قہوے کی چسکیاں تھیں اور باتیں تھیں۔

1950 کا زمانہ ادب اور آرٹ کے لحاظ سے ایک طرح نشاۃ ثانیہ کا زمانہ تھا۔ادب میں مختصر کہانیوں کے رجحان نے زور پکڑا گو ابھی تک ناول بہت کم کم لکھا گیا تھا۔شاعری میں البتہ نئے رجحان سامنے آرہے تھے۔اس میں آزاد نظم نے زور پکڑا اور اپنا آپ منوایا تھا۔

اسی طرح فلم،مجسمہ سازی اور پینٹنگ میں نئے ٹرینڈ زور آئے ۔اس میں کچھ تو یورپی اثر دخیل ہوا مگر قومی اور ایک نئی مملکت کے طور پر ابھرنے والے ملکی کلچر کے بارے احساسات کے اظہار میں بہت شدت آئی۔اُن بدلتے رجحانات کا بھی دباؤ تھا جو ایک دقیانوسی سوسائٹی سے ماڈرن سوسائٹی میں داخل ہوتے ہوئے ظاہر ہوتے ہیں۔

یہ بڑے پیارے لوگ تھے۔باتوں کے رسیا،قہوے اور حُقّے کے دھنی ۔گہرے سیاہ قہوے کی جب تیسری پیالی میرے سامنے لاکر رکھی گئی میں نے گھبرا کر اُسے دیکھا اور خود سے کہا۔

''اِسے تو میں نے چھونا بھی نہیں۔سارا حلق کڑواہٹ سے بھر گیا ہے۔ابھی چینی کی پانچ کیوبز ڈالی تھیں تو یہ حال ہے۔آفرین ہے اِن لوگوں پر جو اِسے پانی کی طرح پیتے ہیں۔''

سچی بات ہے مجھے تو اُنکے نام بھی یاد نہیں رہنے تھے اگر وہ خود اِس کا اِس درجہ اہتمام نہ کرتے کہ جو بھی گفتگو میں شامل ہوتا وہ ہر بار اپنا نام اور کام دہرانا نہ بھولتا۔جس کا فائدہ وقت کی کمی کے باوجود مجھے ہوا تھا کہ جب میں نے رات کو ڈائری میں انہیں قلم بند کیا تو وہ سب اپنے ناموں، کاموں، شکلوں اور آوازوں کی انفرادیت کے ساتھ میرے سامنے تھے اور کہیں ابہام نہیں تھا۔

پہلا شارٹ سٹوری رائٹر عبدالمالک نوری جس کا مدرسہ فکر مروجہ روایت سے بغاوت تھی۔مختصر کہانی کے حوالے سے جس نے ادب کا یہ باب کھولا تھا اس کا لب ولہجہ علی جعفر کی نسبت زیادہ صاف، تلفظ زیادہ بہتر اور گفتگو آسانی سے سمجھ آنے والی تھی۔رعید جرار جو خود بھی کئی کتابوں کا مصنف تھا۔وہ عبدالمالک نوری کے حوالے سے بات کرتا تھا۔ اس کا بہترین کام نشا دلارض Nashid-al-Ard۔(دھرتی کا گیت) کی صورت سامنے آیا تھا۔اس میں سوسائٹی کے پسے ہوئے طبقوں کی عکاسی تھی۔دراصل قانون اراضی ایکٹ نے عراقی معاشرے کی لوئر مڈل کلاس کو جس طرح زرعی غلام بنا کر رکھ دیا تھا اور اعلیٰ تعلیم اور مراعات بالائی اور درمیانے طبقے کے لیے مخصوص ہوگئی تھیں۔اس سے بے چینی، اضطراب اور جو گھٹن پیدا ہوئی، اس کو نوری نے بہت خوبصورتی سے پـــوٹـــریـــٹ کیا۔The

South wind میں صدیوں کے رائج معاشرتی رویوں پر احتجاج تھا۔

اِسی طرح فہد ال تکرلی Faad-Al-Takarli میں مصنف نے اپنے آباؤ اجداد کی رسوم پر سخت نکتہ چینی کی۔

Safirah Hafiz سفیرہ حافظ نے عورتوں پر ہونے والی سختیوں اور مظالم پر لکھا۔اس دور میں کیمونسٹ سوچ بھی اثر انداز ہوئی۔شاعری میں یہ زیادہ کھل کر سامنے آئی۔جمیل صدقی الزاہوی،مہدی الجواہری،سعدی یوسف،مظفر النواب یہ سب بائیں بازو کے وہ ترقی پسند شاعر تھے جنہوں نے حقیقتاً ایک عملی انقلاب کی راہ ہموار کی۔ان کی شاعری اتنی پر اُثر تھی کہ پوری عرب دنیا میں یہ شاعری گونجی۔آزاد نظم کے شاعروں میں ایک بہت بڑا نام نازک الملائیکہ کا بھی ہے۔جس نے عورتوں کے مسائل،محبت اور عورتوں کی آزادی پر کھل کر جی داری سے لکھا۔

نازک الملائیکہ سے میرا تھوڑا بہت تعارف ضرور تھا مگر رُسل ال قیسی اُس کا بہت مدّاح تھا اتنا کہ بدر سے بھی زیادہ اُسے سراہتا تھا۔

بدر شاکر اسیاب کا نام بھی بڑا اہم ہے۔اس کی شاعری کے بہت سے مرحلے تھے۔ابتدائی دور اگر رومانوی تھا تو حقیقت پسند شاعر بن کر اُس نے کمال کی شاعری کی۔بدر کے ہاں انقلابی ذہنیت تھی۔انہوں نے شاعری کے مروجہ اصولوں اور ان کی بندشوں سے آزاد ہو کر لکھا اور خوب لکھا۔

بدر اور نازک الملائیکہ پر باقاعدہ بحث چھڑ گئی تھی۔اسی طرح ال شعیب کے ہاں موضوعات کا تنوع تھا۔عربوں کے اندر اپنے مستقبل بارے پائی جانے والی بے چینی اور اضطراب،اُن کی جہالت،سادگی اور انہیں ملنے والے دھوکے اور ان پر مغربی تہذیب کی یلغار۔شعیب نے ان احساسات کو بہت خوبصورت زبان اور ادائیگی دی۔

اگر یہاں عبدالوہاب الباقی کا ذکر نہ کیا جائے ۔رُسل ال قیسی کا لہجہ خاصا جوشیلا تھا تو عراقی شاعری کا باب ادھورا رہے گا۔سوشلسٹ نظریے کا شاعر جس نے مظلوم اور نچلے طبقے کو جھنجھوڑا مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنی عرب شناخت پر بھی زور دیا۔

Exile From Exile کا بھی پڑھنے سے تعلق ہے۔آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اسے پڑھتے ہوئے کہ عربوں کو کیسے دربدر اور دیس بدر دکھایا ہے۔

صوفے کے آخری کونے پر بیٹھے لولوا کاظم بھی اچھا بولنے والے انسان تھے۔صاحب علم تھے مگر یہودیوں سے بہت متاثر لگتے تھے۔مجھے تو گمان گزرا تھا کہ شاید یہودی ہیں۔اور میں نے پوچھ بھی لیا تھا وہ ہنستے ہوئے بولے۔

''ہوں تو نہیں مگر متاثر ضرور ہوں۔''

ڈیوڈ Semach اور Sasson Somekh عراقی نژاد یہودی جو اسرائیل چلے گئے تھے عربی لٹریچر پر بہت کام کر رہے ہیں۔مہدی عیسیٰ ال سکر Issa-al-Saqr ماڈرن عراقی لٹریچر کے بانیوں میں سے ہے۔آرٹ کے حوالوں سے بھی تھوڑی سی بات ہوگئی۔

آرٹ میں تین قسم کے رجحانات ظاہر ہوئے۔روایتی طریق کا مکمل خاتمہ۔عام آدمی کو فوکس کیا گیا۔دیہاتی اور شہری زندگی کی عکاسی،عراقی ثقافت قدیم اور کلاسیکل زمانوں کی۔

یہاں ہمیں جواد سلیم کا ذکر اور انہیں ضرور خراج پیش کرنا ہے۔علی جعفر نے جتنی باتیں کی تھیں وہ آرٹ سے متعلق ان کی باریک بینی کو ظاہر کرتی تھیں۔بہترین مصور اور مجسمہ ساز۔ان کے کام میں بابل اور سمیری عہد کے موضوع زیادہ غالب رہے۔اسی طرح Faiq حسن کا کام بہت شاندار تھا۔انہوں نے بہت خوبصورتی سے پرانے بغداد کی زندگی کو

پینٹ کیا۔

یہ سب اپنے اپنے وقت کے نظام حکومت کے زبردست نقاد اور باغی تھے۔یہ گرفتار ہوتے یا جلاوطن کردیئے جاتے یا وہ خود ہوجاتے۔ال شعیب جو پہلے کیمونسٹ تھا۔ بعد میں عرب سوشلسٹ بن گیا۔اُس نے بہت مشقتیں کاٹیں۔

یہ روایتی سوسائٹی پٹرتیل کی دولت،معاشی ترقی،تعلیمی اصلاحات کے نتیجے میں بدلنے لگی۔ایک نئی تعلیم یافتہ نسل مراعات یافتہ طبقوں کی صورت اُبھری اور جب اس کے مزید ترقی یافتہ بننے کے آثار اُبھرے اُسے جنگوں میں الجھادیا گیا۔اوراب جو حالات ہیں وہ سب کے سامنے ہیں۔آپ بھی بہت کچھ جانتی ہیں۔

میں نے درمیان میں کئی بار نگاہیں اٹھا اٹھا کر گھڑی کو دیکھا تھا۔پوچھنے پر بتایا کہ ڈاکٹر ندال جمعہ سے چھ بجے کا وقت طے ہے۔

میرا موبائل بجا تھا۔معذرت کرتے ہوئے کانوں سے لگایا۔''میں کہاں ہوں'' افلاق پُوچھتا تھا۔اس کی موبائل پر رعید جرار سے بات کروائی جس نے اُسے بتایا۔

تصویریں بنائیں اور رخصت ہوئی۔رات کے ڈنر پر ان کے بے حد اصرار کے باوجود میرے پاس معذرت تھی کہ میں جانتی ہی نہیں تھی ڈاکٹر ندال کے پاس سے میں کب فارغ ہوں گی؟

سچ تو یہ تھا کہ میں بہت کچھ جان پائی تھی۔

گاڑی افلاق نے کہیں پارک کردی تھی۔پیدل ہی ہم چل پڑے تھے۔الرشید سٹریٹ کی بغلی گلیوں میں جہاں قدیم صاحب ثروت خاندانی بغدادیوں کے خوبصورت گھر تھے جن کا تعمیری انداز دمشق اور حلب کے گھروں جیسا ہی تھا۔سیاہ گیٹ سے اندر قدم رکھتے ہی مجھے کشادہ آنگن میں فوارہ موتی برساتے نظر آیا۔ہرے کھجور پیڑوں،سبز گھاس کے

قطعوں، پھولوں، وسیع وعریض صحن میں جگہ جگہ دھرے نسوانی مجسموں نے میری آنکھوں میں خوشی بکھیری تھی۔

چونکہ وقت طے تھا اس لیے ملازم سیدھا نشست گاہ میں لے آیا۔نشست گاہ کشادہ قوسی چھت کے ساتھ ریلنگ والی تھی۔صوفے پر بیٹھنے کی بجائے میں نے دیواروں پر آویزاں اس خاندان کے بڑوں کی تصویریں دیکھنی شروع کیں۔ابھی پہلی تصویر سے دوسری پر نہیں پہنچی تھی کہ ڈاکٹر ندال پاس آ کر کھڑی ہوگئیں۔میں نے فوری توجہ کی۔

کیا دل کش عورت تھی۔گردن تک کٹے سنہری بالوں،غلافی آنکھوں،شہابی رنگت اور دراز قد۔کوئی چالیس 40 پنتالیس 45 کے پیٹے میں گھری مختصر سا تعارف تو ٹڈل مین کی وساطت سے ہو ہی چکا تھا۔انہوں نے تصویروں میں میری دلچسپی دیکھتے ہوئے مجھے بتانا شروع کیا۔

شاہ فیصل اوّل کے ساتھ ان کی کابینہ میں ڈاکٹر ندال کا پردادا۔ ایک دلربا سے نوجوان پر انگلی رکھتے ہوئے انہوں نے مجھے بتایا تھا یہ شاہ غازی شاہ فیصل کا بیٹا ہے۔

بیسویں صدی کی تیسری، چوتھی اور پانچویں دہائیوں کا بغداد اپنے کلچر ماڈرنزم اور خواتین کے حوالوں سے بہت شاندار سا تھا۔ایسی دلکش،طرحدار اور ماڈرن خواتین۔شاہ فیصل کی والدہ ملکہ اوریا، ڈاکٹر ندال کی پردادی،تاریخ عراق کا بدترین انسان نوری السید اور اس کی سٹائلو مارکہ بیوی۔کیا حسین چہرے تھے۔ان کے پہناوے بالوں کے سٹائل۔مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی میوزیم میں کھڑی بغداد کی تہذیبی زندگی کو ماہ وسال کے آئینے میں گزرتے دیکھ رہی ہوں۔

پھر میری نظریں ایک تصویر پر جم گئی تھیں۔کیا چہرہ تھا۔بلیک اینڈ وائٹ تصویر مگر حُسن پرانی تصویر سے ہی پھوٹ پھوٹ کر باہر نکل رہا تھا۔میری آنکھوں سے لپکتے حسن کو

خراج پیش کرتے میرے جذبات ڈاکٹر ندال پر پوری طرح ظاہر ہوئے تھے۔جب میں نے استفہامیہ انداز میں انہیں دیکھا تھا۔

''شہزادی عزا ہے۔شاہ فیصل کی بیٹی۔اپنے گریک خانساماں کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔عیسائی ہوگئی تھی۔''

شاہ غازی کے ساتھ اُس کے دادا کی تصویر جو ابھی پانچ چھ سال کا خوبصورت لڑکا تھا۔1956 کی پارلیمنٹ میں شاہ فیصل دوم کے عین ساتھ اُس کا دادا جو اب ایک گھبرو رعنا جوان کا روپ دھارے چہرے پر سنجیدہ سی مسکراہٹ بکھیرے کھڑا تھا۔اگلا منظر نامہ بڑا مختلف تھا۔بادشاہت کے خاتمے کے بعد عبدالکریم قاسم کی حکومت کا بڑا معتمد اور سرگرم رکن کے طور پر تصویروں میں نمایاں تھا۔حسن البکر اور صدام کے ساتھ دونوں باپ بیٹا بیٹھے تھے۔باپ بعث پارٹی میں شامل ہو کر صدام حکومت کا حصہ بنا۔صدام کی فیملی سے قریبی اور فیملی تعلقات کا اندازہ ہوتا تھا۔صدام کی دونوں بڑی بیٹیوں کی ڈاکٹر ندال کے ساتھ بھی تصویریں تھیں۔باپ، بھائیوں اور خاندان کی ماضی کی سرکردہ سیاسی شخصیتوں اور بدلتے وقت کے ساتھ نئے چہروں کے ساتھ تعلق نے مجھے پاکستان کی اشرافیہ یاد دلائی تھی۔

ایسی ہی ہر چڑھتے سُورج کو پوجنے والی۔

''میں انقلابی ذہن کی مالک تھی اور ہوں۔اپنے خاندان کی اِس ہر نوالے بسم اللہ کو میں نے کبھی پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا۔''ڈاکٹر ندال صوفے کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔

صوفے پر پاس پاس بیٹھے تو پہلی بات پاکستان کے حوالے سے ہوئی۔ایسے تو دونوں کے بڑے مشترکہ ہیں۔صدام کے بارے میں بات ہوئی تو اُسنے دوٹوک لہجے میں کہا۔

میں صدام کی کبھی حامی نہیں رہی۔ مجھے سخت اختلاف رہا ہے اُس کی پالیسیوں سے۔ مگر اُس میں کچھ اعلیٰ پایہ کی خوبیاں بھی تھیں۔ وہ لبرل اور ماڈرن تھا۔ عراقی عورت کی آزادی اور اُس کی اعلیٰ تعلیم کیلئے کوشاں۔ ملک کے ہر ضلع میں جی ایف آئی ڈبلیو کی تنظیمیں بنا ہیں۔ جنہوں نے عورتوں کی سیکنڈری لیول اور اعلیٰ تعلیم کیلئے بہت کام کیا۔

عبدالکریم قاسم کے زمانے سے صدام تک اُس کا تسلسل کسی نہ کسی صورت جاری رہا۔ صدام کے مخالفین اکثر اس پر اعتراض کرتے تھے کہ وہ یہ سب چکر بازیاں بعث پارٹی اور حکومت پر اپنی گرفت مظبوط کرنے کیلئے کر رہا ہے مگر یہ درست نہیں۔ عرب ممالک میں عراق سب سے پہلا ملک تھا جس نے سوفی صد شرح خواندگی کا اعزاز حاصل کیا اور جس کی پارلیمنٹ میں خاتون منتخب ہوئی۔ آج بہت ساری خواتین سیاست میں سرگرم ہیں۔

اُس کی شخصیت کا یہ پہلو بھی بڑا روشن تھا کہ وہ صاحب کردار تھا۔ شراب اور شباب دونوں سے اُسے پرہیز تھا مگر بڑا منتقم مزاج تھا۔ اس ضمن میں ہر اٹھنے والی آواز کا گلا گھونٹنا اُس کیلئے ضروری تھا۔ اِس میں وہ اپنی اور غیر کی تمیز نہیں کرتا تھا۔ ذاتی مخالفت میں اس نے اپنوں کو بھی نہیں بخشا حتیٰ کہ خونی رشتوں کو بھی۔ تبھی عام سا عراقی چرواہوں کے خاندان سے۔ فیملی بھی بڑی متکبر ہوگئی تھی۔ مجال تھی کہ مخالفت میں اس کی طرح جو ایک لفظ بھی سُن جائے۔

مرد تو چھوڑ سکول جانے والی لڑکیاں بھی انتہائی بے ہودہ اور واہیات۔ صدام کی پہلی بیوی ساجدہ کی چھوٹی بہن العم خیر اللہ راہبت التقدومہ Rahibat al Taqdomah کرسچین کونونٹ میں پڑھتی تھی۔ چھوٹے سے کسی مذہبی مسئلے پر ایک ہمارے انتہائی قریبی ملنے والی کُرد فیملی کی لڑکی سے اختلاف ہوا تو لڑکی کو سبق سکھانے کیلئے سیکرٹ سروس والوں سے اغوا کرادیا۔ خیر چند دنوں بعد لڑکی واپس آ گئی۔

ابوغرب کا جیل خانہ جسے اب سنٹرل جیل کا نام دے دیا گیا ہے ۔یہ بغداد کے مغربی مضافات میں کوئی تیس کلومیٹر پر 1950 میں برٹش انجنیر وں نے بنائی تھی ۔صدام نے اسے مزید وسعت دی اور اپنے گھناؤنے مقاصد کیلئے استعمال کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ جیلیں اُس نے بھی بھر رکھی تھیں ۔ابوغرب جیل میں ہی کوئی دس ہزار لوگ ہونگے ان جیلوں میں تشدد ہوتا تھا۔ پھانسی گھاٹوں پر گردنیں بھی کٹتی تھیں ۔مگر یہ جیلیں بدمعاشی کے اڈے ہرگز نہیں تھیں ۔عورت پر کہیں زیادتی ہوا سے برداشت نہیں تھا۔

امریکہ نے جب عراق کے جنگی تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کے بارے شور مچایا اور کہا کہ یہ ہتھیار ابوغرب جیل میں رکھے گئے ہیں ۔صدام نے جیل کے دروازے کھول دیئے۔ اور قیدیوں کو جو کسی نہ کسی جرم یا کسی نہ کسی سازش میں گرفتار تھے سبھوں کو آزاد کردیا۔ یہ لوگ جب تار چہ سیلوں سے نکلے تو امریکہ کا ساتھ دینے کی بجائے ان کے نعرے تھے۔

''اوصدام ہمارا خون اور ہماری روحیں تم پر قربان ہوں گی ۔''

ابوغرب جیل میں عراقی عورتوں پر امریکیوں کے ریپ اور Abuse پر جب بات ہوئی ڈاکٹر ندال نے لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا تھا۔

اس جمہوریت کے علمبردار نے جو ہمیں آمر سے آزاد کروانے آیا تھا۔ اُس نے قید خانوں کو Taboo بنا دیا ہے۔ اس ملک میں جہاں عورت کی عزت اور وقار میں ہی معاشرے کی جان ہے۔

خوبصورت عورتوں کے شوہروں کی پکڑ دھکڑ، ان کا گھروں کے اندر سے اغوا، ان کی عصمت ریزی، بعد میں کہیں انہیں جلانے، کہیں پھینکنے، کہیں زندہ صورت جیلوں میں ٹھونسنے، کہیں ان کی دوسرے ملکوں میں سمگلنگ، بچے کہیں، مائیں کہیں اور شوہر کہیں۔

جب میں رپوٹیں بنانے کیلئے مختلف علاقوں میں جاتی تو ایسی ایسی ہولناک تصویریں میرے سامنے آتیں کہ مجھے لگتا تھا جیسے میرا دل پھٹ جائے گا۔عام عراقی عورت تو یوں بھی اپنے بارے میں کوئی خبر دینا خود پر ہونے والے کسی ظلم کو دلیری سے عریاں کرنے کو پسند نہیں کرتی کہ قبائلی روایات کا اسیر معاشرتی ڈھانچہ بےحد حساس ہے۔پیچھے رہ جانے والے خاندان کو حقارت بھری نظروں کے تیروں سے چھلنی کر دیتا ہے۔

شیعہ مسلک سے تعلق کے باوجود مجھے موجودہ حکومت کا رویہ قطعی پسند نہیں۔امریکی ان کے مونڈھوں پر سوار ہیں۔سنی عورتیں اس تشدد کا زیادہ نشانہ بنیں اور بن رہی ہیں۔ابھی بھی جیلوں میں بے شمار ہیں جنہوں نے مزاحمت کی اور مقامی پولیس اہلکاروں اور امریکی فوجیوں کو قتل کیا۔

البتہ مقامی پولیس کے نیچے لیول کے لوگوں نے اپنے پرانے غصے نکالے۔مقامی عدالتوں نے انصاف نہیں کیا۔یوں بڑے اور ہیبت ناک مظالم کے راستے ہموار ہوئے۔

اِن واقعات کا ٹی وی چینلوں اور اخبارات کے ذریعے دنیا بھر میں چرچا اِس انداز میں ہوا ہی نہیں جیسے یہ واقعات اپنی سفاکیوں کے ساتھ پیش آئے۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل کے کارندے بھی اُس سطح پر جا کر حالات کے دامن میں نہیں اتر سکے۔میں نے چند تصاویر جو انہیں دکھائیں وہ تو حیران پریشان رہ گئے۔ننگی عورتوں کے پیرا مڈ بنواتے، خود دائروں میں کھڑے ہو کر قہقہے لگاتے، ہنستے، گانے گاتے، ریپ کرتے، لاشیں جلاتے انسانی وحشت اور بربریت کی انتہا ہے۔یہ جیلیں امریکیوں کے کالے کرتوتوں کا سیاس نامہ ہے۔

عراق کے مشہور شیلابی خاندان کی میڈیکل میں پڑھنے والی بیٹی کے ساتھ گینگ ریپ اور افرادِ خانہ کے قتل پر اندر خانے جو کچھ ہوا وہ لرزا دینے والی داستان ہے۔گینگ

ریپ کے دوران بچی مرگئی۔اُس کی لاش کوجلایا گیا۔امریکی سپاہیوں کا چوتھا ساتھی جسے اس بہتی گنگا میں نہانے کا موقع نہ ملا تھا اُس نے اِس واقعے کی موبائل پر فلم بنا کر اوپر پہنچادی۔

طفیلی حکومت کا ٹولہ انگشت بدندان تھا اور بہر صورت مجرموں کے کورٹ مارشل پر مُصر تھا مگر امریکن فوجی افسر اِس لرزہ خیز واردات کو غیر موثر بنانے پر تُلے ہوئے تھے۔گرینڈ جیوری نے کیمپ لبرٹی میں کیس کی سماعت میں کہا کہ آخری فیصلہ امریکی جنرل کرے گا کہ کورٹ مارشل ہونا چاہیے یا نہیں۔

صفائی کے وکیلوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کیس کومظبوط کر دیا تھا کہ بیچارے ملزمان تو دہشت گردی کی مریضانہ حالت میں تھے۔ان کی بٹالین کے سترہ ساتھی عراقی مزاحمت کاروں کے خودکش حملوں میں مارے گئے تھے وہ تو نارمل اخلاق باختہ جنسی مجرموں کی فہرست میں ہی نہیں آتے ہیں۔

اب مجھے بتاؤ کہ اس کے مامے چاچے جو اینٹی القاعدہ تھے کیوں کر نہ القاعدہ میں شامل ہوتے۔آپ انہیں تخریب کار اور دہشت گرد کہتے ہیں۔یہ تو آپ خود بناتے ہیں۔

اللہ ! میرے اندر سے بین کرتی آہیں نکلیں۔ ہے جرم ضعفی کی سزا مرگ مفاجات۔

باب نمبر:15

1۔ یادگار کے آہنی ہاتھوں کی بیسمنٹ Basement میں بکھرے
پڑے ہزاروں ہلمٹ اُن لاکھوں ایرانی نوجوانوں کے تھے
جو اِس انتہائی فضول جنگ کا ایندھن بنے۔
2۔ تاریخ اچھی ہے یا بُری اِسے چھینیوں اور ہتھوڑوں سے ملیامیٹ نہیں
کیا جا سکتا۔
3۔ ایران عراق جنگ نے دنیا کو تماشا دکھایا۔اُبھرتی ہوئی طاقت کے
حامل دو مسلمان ملک تباہ ہوئے۔

جی تو چاہا تھا پُوچھوں اور پھر پُوچھ بھی لیا۔

''میاں ہم تو ابھی اِسی راستہ سے گزرے تھے۔کوئی زیادہ دیر کی بات تھوڑی ہے۔یہی کوئی گھنٹہ بھر ہوا ہوگا۔بے شک چیزوں اور منظروں کا کھلارا بے حد وحساب سا تھا مگر بات تو ابھی کی تھی۔

وہی کرخ میٹرنٹی ہوسپٹل،وہی گرین زون کے پاس بغداد کنٹری کلب۔وہی رنگا رنگ لوگوں سے بھرا پُرا حلب سکوائر۔ہاں اتنا ضرور تھا پہلے حلب سکوائر سے سیدھے جس سڑک پر چڑھے تھے وہ جمہوریہ پُل سے التحریر سکوائر میں داخل ہوئی تھی۔

سچی بات ہے میں نے تو افلاق سے وہیں کہیں کھانے کا کہا تھا۔بھوک سے تو گویا جیسے جان نکلی جا رہی تھی۔رات اتنی تھکاوٹ تھی کہ رُک کر ہوٹل سے دو قدم پرے سے تربوز لانا بھی مشکل لگا۔صبح دیر تک پڑی سوتی رہی۔کہیں نو بجے ناشتہ کیا۔چائے خود بنائی۔مکھن

فرج میں لاکر رکھا ہوا تھا۔ کچن سے ایک سلائس مل گیا تھا۔

دس بجے گاڑی میں بیٹھی ۔ افلاق کو کچھ اپنے کام کرنے تھے ۔ دراصل باہر جانے کے چکر میں تھا ۔ دو تین بار جب انہی راستوں کی دہرائی ہوئی تو جی میں یہی کچھ آیا تھا جس کا پہلے اظہار رہوا ہے ۔ کتنی ہی دو کانیں نظر سے گزری تھیں جہاں کچھ بھی کھے سواہ کھا کر پیٹ کے اس دوزخ کو ٹھنڈا کیا جا سکتا تھا۔ پر وہ التحریر جانا چاہتا تھا۔ اُس نے گاڑی کی رفتار بڑھائی اور ونڈ سکرین سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس پانچ منٹ میں سڑک کسی نازنین کی مانگ کیطرح سیدھی التحریر کے دامن میں جا اُترے گی ۔ وہاں کھانا اچھا ہوگا اور ماحول بھی۔''

اب میرے لئے صبر کے سوا کیا چارہ تھا۔

افلاق بہت سمجھ دار لڑکا تھا۔ کسی بھی بڑے ریسٹورنٹ میں گھس کرون سوّنے کھانے منگواتا ۔ ہزاروں عراقی دینار کا بل بنوالیا کرتا تو میں نے کیا کر لینا تھا۔ میں تو کلّی طور پر اُس کے رحم و کرم پر تھی ۔ ان دنوں تو یوں بھی پُل صراط پر چلتی تھی ۔ یہاں بم پھٹ رہے ہیں ۔ وہاں پھٹ رہے ہیں ۔ اتنے لوگ مارے گئے ۔ اتنے زخمی ہوئے ۔ وہ میرے آرام کا بھی کسقدر خیال رکھتا تھا یہ بھی میں جان گئی تھی کہ ٹیکسی والے اے سی نہیں چلاتے تھے ۔ کھلے شیشوں سے فراٹے بھرتی دوزخ جیسی ہوائیں سیدھی چہروں سے ٹکراتی تھیں جب کہ میرے اندر بیٹھتے ہی اے سی آن ہو جاتا تھا۔

فلافل کے بارے میں پُوچھا تھا کہ کھا کھا کر من تو نہیں بھر گیا ہے ۔

''ارے نہیں بہت پسند ہیں مجھے۔'' میرا جواب سُن کر وہ صاف سُتھرے سفید ریپرز میں لپیٹے وہی لے آیا تھا۔ کولا کے ٹن پیک ساتھ تھے ۔

باہر شیڈ نیچے بچھی کرسیوں پر بیٹھ کر اِسے کھایا گیا۔ قاہرہ میں ہمارا پسندیدہ

کھانا یہی فلافل ہی ہوتا تھا۔ہم دیکھتے وہ ہمارے سامنے کڑاھیوں میں تلتے، پھر چپے جتنی روٹی میں سلاد کے ساتھ دھر کر ہاتھ میں تھما دیتے۔ایک سے تو ہمارا حلق تالو بھی نہ گیلا ہوتا۔یہاں ہاتھ بھر چھوڑ بازو بھر لمبی روٹی تھی جو ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔

''التحریر کی کسی بھی مسجد میں چند لحموں کی ٹیکی کیا ضرورت محسوس کرتی ہیں؟''

''افلاق ابھی تو میں نے کچھ نہیں دیکھا ایک طرح تازہ دم ہی ہوں۔''

''نہیں۔مجھے آپ کو اب جو چیزیں دکھانی ہیں وہ کھلی فضاؤں میں ہیں۔شام ضروری ہے۔''

''نہیں افلاق؟ یہاں اتنا کچھ ہے اور وقت محدود۔مجھے لگتا ہے کاروان ایک دو دن میں کربلا روانہ ہونے والا ہے۔میری تو اتنی چیزیں ابھی رہتی ہیں۔''

''اُس کی آپ کو چنتا کرنے کی ضرورت نہیں وہ میرا مسئلہ ہے۔''افلاق نے تو حتمی فیصلہ کر دیا تھا۔میں نے بھی بحث کرنی مناسب نہیں سمجھی۔

مسجد میں آرام کیلئے گئی تو پتہ نہیں کن ریگستانوں میں کھوگئی کہ جب جاگی تو معلوم ہوا تین گھنٹے سوئی ہوں۔افلاق باہر بیٹھا تھا۔

''میں آپکو ایران عراق جنگ کی monuments اور نامعلوم سپاہی کی یادگار پر لے جا رہا ہوں۔'' بڑا دھیما سا لہجہ تھا۔

''نامعلوم سپاہی کی یادگار۔میں نے زیر لب کہا۔وطن کے نامعلوم سپاہی ہمیشہ فرنٹ پر لڑتے ہیں۔بے چارے ہمیشہ گمنام رہتے ہیں اور صرف نامعلوم سپاہی کی یاد میں کا تمغہ پاتے ہیں۔''

لمبی سانس کھینچ کر میں نے افلاق کو دیکھا اور کسی قدر طنزیہ لہجے میں پوچھا تھا۔

''عراق سمجھتا ہے وہ فاتح تھا۔''

''دونوں احمق یہی سمجھتے ہیں۔''اُس کا جواب سنجیدگی سے بھرا ہوا تھا۔

''پریڈ گراؤنڈ۔''

اشارہ داہیں طرف ایک وسیع و عریض قطعہ زمین کی طرف ہوا تھا۔کچھ مزید معلومات بھی اِس نوعیت کی تھیں۔ہمارے دیگر مختلف تہوار بھی یہیں منائے جاتے ہیں۔

''صدام کا کرّوفر اور طمطراق دیکھنے کے قابل ہوتا تھا جب وہ یہاں آتا تھا۔''

''سارا رولا اور سیاپا اِسی کرّوفر کا ہی تو ہے۔یہی چین نہیں لینے دیتا۔''نیم جیسی کڑواہٹ تھی لہجے میں۔

''اکثر قومی دِنوں پر وہ یہاں قوم سے خطاب کرتا تھا۔اُس کا شاندار محل بھی یہاں سے تھوڑی دور ہے۔''

گاڑی اسفالٹ کی وسیع و عریض سڑک پر جس کے اطراف میں اُگی جھاڑیاں اور سبزہ اِس گرم ترین شام کو قدرے بہتر ہونے کا تاثر دے رہا تھا۔ہم The Hands of victory monument کے نیچے سے گزر رہے تھے۔پہلی یادگار دیوہیکل سی تلواریں قوسی صورت میں اُوپر اُٹھتے اور ایک دوسرے سے ملتے ہوئے کراس بناتی تھیں۔فلڈ لائٹس سڑک کی شان میں اضافہ کر رہی تھیں۔دوسری یادگار کے نیچے سے گزرتے ہوئے رُک گئے۔ان کا ایک نام The Swords of Qadisiyah بھی ہے۔ہوا تیز تھی۔شام کی دھوپ چمکدار بھی تھی اور گرم بھی۔

یہ یادگاریں اپنی اصلی صورت کے ساتھ میرے سامنے نہیں تھیں۔افلاق نے مجھے اِن کی پرانی تصوریریں دِکھائی تھیں۔1986ء میں ایران عراق جنگ کے خاتمے سے قبل ہی ان کی ڈیزائنگ اور جرمن کمپنی سے ان کے بنانے کی بات چیت شروع ہوگئی تھی۔صدام نے خود ہی فتح کو عراق سے منسوب کرلیا تھا۔اس کی ڈیزائنگ میں بنیادی تصور

بھی اُسی کی دماغی اختراع تھا۔عراق کے صف اول کے مجسمہ ساز عادل کمال نے صدام کے تخیلی خاکے کوحقیقت کا روپ دیا تھا۔اس کی وفات کے بعد یہ کام محمدغنی حکمت نے کیا۔

میں جو کچھ دیکھ رہی تھی وہاں ہاتھوں کی صورت بگڑی پڑی تھی۔ہزاروں ہلمٹ لڑھکے ہوئے اور جال ٹوٹے پڑے تھے جن میں یہ مقید تھے۔

میں پتھر جیسا کلیجہ لیے افلاق کو سُنتی تھی۔

یہ ہزاروں لاکھوں ہلمٹ استعارے تھے یا حقیقی؟ میں نہیں جانتی تھی۔افلاق انہیں اصلی کہتا تھا۔یہ اُن لاکھوں نوخیز ایرانی لڑکوں کے تھے جنہیں فوری بھرتی کرکے محاذ پر بھیج دیا گیا تھا اور جو اس فضول جنگ کا ایندھن بن گئے تھے۔

ماں تھی نا میں۔پھول کی پتیوں جیسی شکل کی اس Basement میں پڑے یہ ہلمٹ مجھے اُن کی سُرخ وسفید صورتیں اور اُن کی نامراد جوانیاں یاد دلا رہے تھے اور میری آنکھیں بھر بھر آتی تھیں۔اگر یہ علامتی طور پر بنائے گئے تو کتنی سفا کی کا مظاہرہ تھا۔اقتدار کتنا بے رحم ہوتا ہے؟ انسان کو گوشت پوست کا تو رہنے ہی نہیں دیتا۔

دونوں جانب تلواروں کو تھامے آہنی ہاتھ جنہوں نے دستوں کو شکنجے کی طرح جکڑا ہوا تھا۔ان ہاتھوں کی نظر آتی فولادی انگلیاں جو دراصل صدام کے ہاتھ اور انگلیوں کا عکس تھے بنائے گئے تھے اور جنہیں میں نے تصویروں میں دیکھا تھا۔

ان ہاتھوں کی تو مٹی پلید ہوگئی جب نئی عراقی حکومت نے ایک کمیٹی بنائی۔حکم دیا اُسے کہ صدام کے دور کی ہر یادگار کو ختم کردو۔ہتھوڑے چلے اور شاندار کامیابی بڑے بڑے ٹکڑوں کی صورت میں زمین بوس ہوئی۔لوگ انہیں اُٹھانے اور بیچنے کیلئے پاگلوں کی طرح بھاگے۔

ابھی توڑ پھوڑ جاری تھی جب اپوزیشن اور Preservationist کی طرف

سے بلند وبالا احتجاج ہوا۔ وہ زوردار آوازوں میں چلاّ تے تھے۔

''بند کرو یہ توڑ پھوڑ۔ یہ تاریخ ہے۔ اچھی ہے، بُری ہے، جو بھی ہے اِسے رہنے دو۔''

وزیر اعظم نورالمالکی کو ایک بڑی دھمکی امریکی سفیر زلمے خلیل زادہ سے ملی جس کی سخت زبان نے سارے ہتھوڑے اور چھینیاں زمین پر رکھوا دیں۔

پر عراق گورنمنٹ خیر سے ابھی اُدھار کھائے بیٹھی ہے۔ حکومت میں شیعہ عناصر زیادہ ہیں۔ جب بس چلا وار ہوگا۔ اگر سُنی عناصر اقتدار میں آ گئے تو پھر اس کی مرمت ہو جائے گی۔

واہ اقتدار کے بھی کیا کیا اور کیسے کیسے المیے ہیں؟

یادگار کا جس دن افتتاح ہو رہا تھا۔ صدام سفید براق گھوڑے پر سوار یہاں آیا تھا۔ فلاق کا کہنا تھا کہ اُس نے خود کو نعوذ باللہ حضرت امام حسینؓ کے روپ میں پیش کیا تھا۔

''احمق کہیں کا۔''

میوزیم بھی ساتھ ہی ہے۔ اُسے تو میں نے بس باہر سے ہی دیکھا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔

اب ایران عراق فتح کی اور یادگاریں تھیں۔

زوارہ پارک کے ہمسائے میں یہ یادگاریں ایک پیچیدہ علامتی طرز تعمیر کی عکاسی کرتی تھیں۔ داخلے کا مرحلہ عراقی سپاہیوں کی اجازت سے سر ہوا تھا۔ گیٹ پر تین فوجی کھڑے تھے۔

اندر دفتر کے آگے مزید تین سنگینوں کے ساتھ چوکس بیٹھے تھے۔ چار پانچ ٹہلتے پھر رہے تھے۔ عراقی بھی بہتیرے گورے چٹے ہیں اور امریکیوں میں بھی کئی کالے کٹے ہیں۔

اب یہاں والے خالص ہیں یا آمیزہ ہیں ۔افلاق بتا تا تھا کہ یہ چھوٹی موٹی ڈیوٹیاں انہوں نے سقوط بغداد کے ابتدائی دنوں میں خود دی تھیں کہ لوگ خوف سے شہر چھوڑ گئے تھے۔اب تو وہ ہیڈ کوارٹر میں بیٹھے ہیں ۔یہ اُنکے چیلے چانٹے ''ڈیکس یکس سر'' کہتے ہیں اور سلطنت چلاتے ہیں ۔چھوٹے موٹے معاملات یہ خودنپٹاتے ہیں بڑے اور اہم وہ۔یہ سب تو خیر عراقی ہیں۔

سپاہیوں کو ایک پاکستانی خاتون کا پتہ چلا تھا۔بڑی محبت کا اظہار کیا تھا۔بڑی احترام بھری نظروں سے دیکھا تھا۔باتیں بھی کچھ کی تھیں۔افلاق نے ترجمہ کیا کہ شکریہ ادا کررہے ہیں اور آپ سے محبت کا اظہار کرتے ہیں۔

خوبصورت وسیع وعریض پارک میں تھوڑی دیر کیلئے اِس ماحول کا حُسن حیرت زدہ کرتا تھا۔نامعلوم سپاہی کا مقبرہ۔شہدا کی یادگار۔نامعلوم سپاہی کی یادگار اور مختلف شخصیات کے مجسموں اور پارکوں سے شہر کی اہم جگہیں صدام حسین نے جیسے سجائی تھیں واقعتاً وہ لاجواب تھیں۔میں تو گُنگ سی کھڑی اسے دیکھتی تھی۔میرے لئیے اس کی تفصیلات لکھنا قطعی آسان نہ تھیں۔اُسکا اوپری حصّہ تو مجھے اُڑن طشتری جیسا لگا تھا جو چانک کہیں فضاؤں میں اُڑتی پھرتی یکا یک گِر کر یہاں رُک گئی ہے۔

کہا گیا ہے کہ یہ یادگار ایک روایتی درا ''(Diraa)'' شیلڈ کی نمائندہ ہے جو میدان جنگ میں مرتے ہوئے عراقی جنگجو سپاہی کے ہاتھوں سے گر گئی ہو۔

ایک مصنوعی پہاڑی کون کی صورت جو قدرے ڈھلائی مضبوط بیموں پر بیضوی شکل میں ماربل سے ڈھپی اور سُرخ گرینائٹ پوڈوں سے سجی بیضوی پلیٹ فارموں سے اُوپر جاتی ہے۔سچی بات ہے کہ میں دُور دُور تک بکھرے گھاس کے قطعوں، اُن میں اُگے بوٹوں، بل کھاتے راستوں، سُورج کی روشنی میں چمکتے تانبے کی چھت اور سٹیل کے فلیگ پول جو قومی جھنڈے کے رنگوں کو نمایاں کرتے تھے کے پس منظر میں بلند وبالا عمارتوں کو

دیکھتی تھی اور خود سے کہتی تھی۔

اِس کی ساخت سے متعلق کوئی بھی تفصیل میرے لیے لکھنی بڑی مشکل ہے۔

اس کا نصف حصّہ اپنے ڈیزائن کے اعتبار سے کسی حسینہ کے گلے میں پہنے نیکلس جیسا لگتا تھا۔ پھر یہ کہہ سکتی ہوں کسی ٹیلر ماسٹر کا کسی خاتون کی قمیض کے گلے کا انتہائی دیدہ ریزی سے بنائے گئے ڈیزائن کا نمونہ نظر آتا ہے۔ بھئی عورت ہوں نا تو ایسی ہی مثالیں اور تشبیہیں ذہن میں آئیں گی۔

رہی اس کی اتنی پیچیدگیاں جو وہ فوجی ہمیں بتا تا تھا کوئی یاد رکھنے والی تھوڑی تھیں۔ نیچے میوزیم بھی تھا اور روشنی اوپر سے نیچے جاتی تھی۔

غیر ملکی وفود یہاں پھولوں کی چادر چڑھانے آتے ہیں۔ کیوبا کا فیڈل کاسترو بھی یہاں آیا تھا۔ مجھے ہنسی آ گئی تھی۔

فیڈل کاسترو بھی ایک شے۔ پہلے صدام کی لن ترانیاں سُنی ہوں گی۔ بلند بانگ دعوےاور گپیں کہ وہ تو امریکہ کو جُوتی کی نوک پر رکھتا ہے۔ جو کاغذ اُسے بھیجتے ہیں وہ تو پڑھے بغیر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیتا ہے۔ پر کاہ برابر اہمیت نہیں دیتا۔ ٹشو پیپر سے زیادہ کی حیثیت نہیں ہے میری نظر میں اُن کی۔ بڑی بڑھکیں ماری ہوں گی کہ وہ ایسے ہی مارتا تھا۔

''ہائے'' میں نے لمبی سانس کھینچی۔ تدبر اور سیاسی فراست سے خالی کھوپڑی۔ کاش تھوڑی سی عقل کر لیتا۔ اُس وفد کی ہی بات مان لیتا جو فیڈل کاسترو نے 1990 میں اُسے یہ سمجھانے بھیجا تھا کہ وہ کویت سے اپنی فوجیں واپس بُلا لے۔ اپنی تباہی کو آواز نہ دے۔ امریکہ جیسے ہاتھی کا مقابلہ کرنا آسان نہیں۔ ہائے بے چارہ ٹشو پیپر ہی کی طرح مسل دیا گیا۔

جی چاہا تھا آہوں کا ڈھیر لگا دوں۔

ہواؤں کے زور سے لہراتے پھڑپھڑاتے عراقی جھنڈے کو دیکھتے اس کی آزادی و خوشحالی کیلئے دعائیں مانگتی باہر آ گئی تھی۔

گاڑی میں بیٹھی تو یہ جانی تھی کہ اب افلاق مجھے "یادگار شہداء" لے جا رہا ہے۔یعنی عراق ایران ڈرامے کا ایک اور اپی سوڈ۔اب کیا کہتی جتا تیری مرضی نچا بلیا۔سچی بات ہے تیل کے قیمتی ذخائر سے حاصل ہونے والی آمدنی کا ایک بڑا حصّہ اِن بے کار شو بازیوں پر خرچ ہوا۔چلو پارکوں کی ضرورت تھی وہ بنے۔تاریخ کی نامور شخصیات سے وہ سجے۔اچھی بات۔مگر یہاں خود نمائیوں اور شجاعتوں کے جو اظہار تھے وہ خیر سے ملت اسلامیہ کی قیادت کے مفلس ذہن کے عکاس تھے۔

گاڑی کی رفتار بہت تیز تھی۔عام پبلک کیلئے یہ صرف دو دن کھلتا ہے۔معلوم ہوا تھا۔

یہ بھی وہیں پاس ہی تھی۔جمہوریہ پُل سے کوئی دو میل پر مشرقی جانب یہاں بھی فوجیوں کے پہرے تھے۔گیٹ پر بھی اور اندر بھی۔

گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو بڑا دل خوش کن منظر تھا۔اُس سے کہیں زیادہ خوبصورت اور حسین جو ابھی دیکھتی ہوئی آئی تھی۔قطعوں اور ٹکڑیوں میں بٹا۔داہیں باہیں بل کھاتی پختہ روشوں میں پھنسا، گھاس پھولوں اور پودوں سے سجا، اُونچے اُونچے درختوں میں گھرا۔ریگستانی زمین کو فردوس جیسا بنا چھوڑا تھا۔عورتوں، بچوں اور مردوں کے دم قدم سے آباد۔

یادگار تو مجھے جھیل میں کھلے کنول کے خوبصورت پھول جیسی لگی تھی۔یہ عظیم یادگار اتاترک کے نام پر مصنوعی جھیل کے عین درمیان ایک بڑے گنبد کی صورت میں جو درمیان میں لمبائی کے رُخ سے دو حصّوں میں منقسم ہے ہنستی کھلاتی نظر آئی تھی۔اِسے میں پھول کی

پنکھڑی بھی کہہ دوں۔ یہ دل جیسا بھی ہے۔ یہ انڈے کے بیرونی خول کے دوٹکڑوں کی طرح بھی نظر آتا ہے۔ انہی دوٹکڑوں کے درمیان نہ بُجھنے والا شعلہ جلتا ہے۔

اور تر وتازہ سبز گھاس کے میدان جن کے درمیان پُختہ راستے پر چلتے ہوئے میں نے اِس فنکار نمونے کو گہری دلچسپی سے دیکھا تھا اور افلاق کی اِس بات کو سو فیصد سچ جانا تھا کہ جب شہرہ آفاق مجسّمہ ساز کینتھ آرمیٹج (Kenneth Armitage) 1986میں اِسے دیکھنے آیا تو اُس نے بے اختیار اس کے آرٹسٹ سرالخلیل کو سینے سے لگالیا۔

یقیناً لگایا ہوگا۔ اُسے لگانا بھی چاہیے تھا۔ بڑا فنکار دُنیا کے کسی بھی خطے میں ہوسکتا ہے۔ پس ماندہ مُلکوں میں بھی کہ ذہانت اور فن پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔

خوبصورت بچے روشوں پر بھاگتے پھر رہے تھے۔ غم امروز اور فکر فردا سے بے نیاز۔ لکڑی کے خوبصورت پُلوں سے چھلانگیں مار رہے ہیں۔ ان کے والدین باتیں کرتے، کہیں چہل قدمی کرتے اور کہیں بیٹھے نظر آتے۔

افلاق کچھ لوگوں کے پاس کھڑا تھا۔ شاید وہ انہیں جانتا تھا۔ میں سلیب پر بیٹھی اردگرد دیکھتی تھی۔ پھر میں نے اُسے ایک جوڑے کے ساتھ اپنی طرف آتے دیکھا۔ ہم سب متعارف ہوئے۔ ماڈرن سی خاتون جو ستنصر بازار میں گارمنٹس کا کاروبار کرتی تھی۔ شوہر بزنس مین تھا۔ تین پیارے پیارے بچے۔ سچے اور کھرے لوگ۔ خاتون صاحبِ نظر تھی۔ صدام کی تعلیمی پالیسیوں کی مدّاح۔ پورے مُلک میں کے جی سے یونیورسٹی لیول تک تعلیم فری۔ نصاب ایک۔ اُس کے قائم کردہ سٹڈی سرکل جہاں ہر پڑھی لکھی خاتون کو عورتوں کو پڑھانے کیلئے جانا لازمی ہوتا۔ کہہ لیجیے تعلیم بالغاں سینٹر۔ اُس نے ہر عراقی کو پڑھا لکھا بنایا۔ یہ کریڈٹ اُسے دینا پڑے گا۔ صحت کو اُس نے بڑی اہمیت دی۔ پورے عراق میں تقریباً دو سو پچاس فلٹریشن پلانٹ لگائے۔ صنعتیں اُس کی ترجیح تھیں۔ وہ اوّل و

آخر ایک عراق تھا۔ظالم و جابر تھا۔مُلک میں امن امان تھا۔آزادی رائے پر پابندی تھی مگر لوگوں کی بہتری اور ان کی خوشحالی کا خواہاں تھا۔

''عیاش نہیں تھا۔''شوہر نے ٹکڑا لگایا۔

''ہاں البتہ احمق ضرور تھا۔''افلاق بولے بِنا نہ رہ سکا۔

باتیں شروع ہوئیں تو جیسے پردے چاک ہونے لگے۔ایران عراق جنگ پر اُس نے لمبی سانس بھری تھی مگر فریقین کو لعن طعن کی بجائے اس کے پاس نئی نسل کا دُکھ تھا کہ اُس کے دو بھانجے بھی اِس آگ کا ایندھن بنے تھے۔

''آپ سوچ بھی نہیں سکتی ہیں کہ دونوں اطراف کی نوخیز اور نوجوان نسل کیسے خزاں رسیدہ پتوں کی طرح فنا کی دھول میں گُم ہوئی۔''

اُس کا شوہر ابو بکر محمد الزکریا مجھے کم کم معلوم ہوتا تھا کہ اب تک کی گفتگو میں دوسری بار شامل ہوا تھا۔

''اندازاً کوئی پونے تین لاکھ ایرانی ڈھائی لاکھ عراقی اِس بے کار جنگ میں ختم ہوئے۔کوئی اسی ۸۰ ہزار تعداد زخمیوں اور دس لاکھ کے قریب متاثرین تھے۔باقی نقصان بھی بے شمار تھا۔دُنیا نے تماشا دیکھا۔اور اپنے اپنے مفادات کا تحفظ کیا اور خوش ہوئے کہ دو مسلمان مُلک جو بڑھتی ہوئی طاقت تھے کمزور ہوئے۔کاش صدام سمجھدار ہوتا۔کاش امام خمینی بصیرت سے کام لیتے اور دونوں مُلک تباہ ہونے سے بچ جاتے۔''

پھر انہوں نے اجازت چاہی۔دونوں میاں بیوی نے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔وہ ال اُمل (ul'ummal) کے علاقے میں شارع خالد بن ولید پر رہتے تھے۔موبائل کا سیل نمبر انہوں نے میری کاپی پر لکھا اور گھر آنے کی پُر زور تاکید کی۔

چلو میں بھی چاہتی تھی کو افلاق کے ہوتے ہوئے یہ چلتا تو نہ تھی مگر یہ خاتون

حالات حاضرہ سے واقف اور بالغ نظر لگی تھی۔

لائبریری ضرور گئی۔ پر میں نے کسی بھی چیز کو شوق و رغبت سے نہیں دیکھا۔ یہاں اخبارات، کتابوں اور ویڈیو فلموں کی صورت پورا ریکارڈ موجود تھا۔ نگران کسی کام میں غالباً مصروف تھا۔ پاکستان کا جان کر خوش ہوا۔ چہرے پر مسکراہٹ بکھیری۔ اور اس سوال کے جواب میں کہ کیسا محسوس کرتے ہیں جب آپ غلام بن جائیں تو۔

اُس نے بتیسی نکالی، خوش دلی سے ہنسا اور کہا۔

''تو کیا پہلے نہیں تھے۔ اپنے کے تھے۔ اُسے ہماری زبان کھولنی پسند نہ تھی۔ اب دوسرے کے ہیں تو انکے منہ پر جوتے بھی مارتے ہیں۔''

مجھے ہنسی آ گئی تھی۔ بش اور منتدرُل زیدی دونوں آنکھوں کے سامنے تھے۔

لائبریری میں میں اور افلاق ہی تھے۔ ملحقہ لیکچر روم تھا۔ ایک آڈیٹوریم بھی ہے یہاں۔

اور پھر میں آڈیٹوریم میں بیٹھی اُسے سنتی تھی جو ادارے کا منتظم اعلیٰ تھا۔ سلیمانیہ کا گرد عبدلکریم احمد بڑے گہرے اور پھیلے ہوئے وژن کا مالک۔ میں نے عراق ایران جنگ بارے جاننا چاہا تھا اور رو دیو لا تھا۔

میرے خیال میں اہم وجوہات تو یہی چند ایک ہیں۔ امریکہ سے انقلاب ایران ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنے اُس پٹھو شاہ ایران کی دوبارہ بحالی کیلئے سرگرم تھا۔ صدام حسین بھی عرب دنیا میں ناصر کی طرح اپنے نام کا جھنڈا گاڑنے کیلئے مرا جا تا تھا۔ خمینی کی عراق بعث پارٹی پر آئے دن لعن طعن کی پھٹکار تھی۔ انہیں عراق کی شیعہ آبادی پر کیے جانے والے جبر اور پابندیوں پر غصہ تھا۔ عراقی حکومت ان کے نزدیک شیطانی تھی اور وہ اپنی پوری توانائیوں سے نعرہ بازی میں مصروف تھے۔ اور اس اہم نقطے کو انہوں نے قابل توجہ نہیں

سمجھا تھا کہ تب عراق کی شیعہ آبادی کی اکثریت مسلک سے کہیں زیادہ اپنے عراقی تعلق کی وفادار رہے۔اُن کیلئے اپنا مُلک ،قبیلہ اور تاریخ کہیں زیادہ اہم ہے۔گو اب ایسا نہیں۔فوج میں 1920 سے 1958 تک شیعہ عنصر نہ ہونے کے برابر تھا مگر آزادی کے فوراً بعد اسمیں بہت اضافہ ہوا۔

اب ذرا بڑی طاقتوں کے مفادات کو دیکھیں۔امریکہ اور برطانیہ کی سپورٹ عراق کے لئے۔اسرائیل عراق کی بڑھتی طاقت سے خائف،ایران کا مددگار اور حامی۔خیر سے بڑی اور فضائی جنگ میں ٹینکوں اور طیاروں کے پُرزوں کی تیز ترین فراہمی اسرائیل کے توسط سے انجام پا رہی تھی۔جنگ طول پکڑ رہی تھی اور لاشوں کے ڈھیر لگ رہے تھے۔

صدام کو اپنی حماقتوں کا تو شاید احساس نہ ہوا ہو پر اپنا مستقبل ضرور داؤ پر لگتا نظر آیا تھا۔جھکنے میں عافیت جانی اور یک طرفہ جنگ بندی کی ذاتی پیش کش کر دی۔

قوموں کی تاریخ میں ایسے شاید جنم نہ لیں اگر کہیں فہم وفراست اور تدبر کے دیئے کوئی ایک طرف ہی جلا دے۔اب امام خمینی نہیں مانے۔۱۹۷۵ والی بین الاقوامی سرحد کو مستقل تسلیم کرنے اور امام خمینی سے انکی پسند کے کسی مقام پر ملنے کا صدام کی طرف سے اظہار ہوا۔مگر وہاں ٹھوس انکار تھا۔

آٹھ سال خون مسلم کی ارزانی۔اسلحہ کے بیوپاریوں کی موجیں۔جنگ کا اختتام جب ہوا۔نتیجہ یہ تھا کہ اِس لاحاصل جنگ کا کوئی فاتح نہیں تھا۔دونوں کے حصّوں میں تباہی بربادی اور کمزوری آئی تھی۔

یہ یادگار شہدا جسے دیکھ کر دل دُکھا تھا۔اس کے بنانے کی کوئی ضرورت تھی۔ایسی ہی حماقت کا اظہار ایران نے بھی کیا ہوگا۔میں نے افلاق سے پوچھا تھا۔

تہران میں مَیں نے ”خون کا فوارہ“ دیکھا ہے۔وہ اس دعوے کے ساتھ ہے کہ

انہوں نے عراق کا کچومر نکال دیا ہے۔

میں نے باہر آ کر کھلے آسمان کو دیکھا تھا۔

پتے ہواؤں کے زور سے لہراتے اور گرتے تھے۔راستے کشادہ اور خوبصورت تھے۔ایک طرف جھیل کا پانی سورج کی کرنوں سے چمکتا اور ہواؤں کے زور سے تھرتھراتا نظر آتا تھا۔

پھر جانے میں چلتے چلتے کیوں بیسمنٹ (Basement) میں اُتر گئی۔جہاں گرینائٹ کے پتھروں پر وہ نام تھے جو اس جنگ کا ایندھن بنے۔میں تو اپنا پلو اسی سوچ سے چھڑا نہیں پا رہی تھی اور بے اختیار سوچے چلی جا رہی تھی کہ اُنہوں نے کِس کو پچھاڑا؟ کن کو مارا یا شہید کیا؟ دونوں شہیدوں کا دعوے کرتے ہیں۔شہید کون ہیں؟ بے چارے معصوم سے لوگ جو حکمرانوں کی حماقتوں کی بھینٹ چڑھے۔

سیڑھیوں سے اوپر علامتی یادگار کے درمیان عراق کا جھنڈا لہراتا ہے۔میرا دل وہاں بیٹھنے کو چاہ رہا تھا۔پھر جیسے مجھے خود پر شدید غصہ آیا۔

''یہ میں کِس مسئلے میں اُلجھ گئی ہوں۔ایران عراق تو پھر دو قومیں ہیں۔مسلمان ہیں تو کیا؟ میری تو اپنی قوم نے اپنے ہی وطنوں اور ہم مذہبوں پر ظلم و ستم کے وہ پہاڑ توڑے تھے کہ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔1971 یاد آیا تھا۔پاکستان کی آرمی یاد آئی تھی۔بنگلہ دیشی یاد آئے تھے۔مکتی باہنی یاد آئی تھی۔انسانیت کہاں رہی تھی؟ اور بغداد کی تاریخ کونسی کم ہے۔امویوں اور عباسیوں کے خونین معرکے۔عباسیوں نے جو حشر امویوں کا کیا۔بغداد کی پہلی بربادی امین اور مامون کے ہاتھوں ہی تو ہوئی۔تاریخ کی خون ریزیاں۔

بلاشبہ انسان بہت خسارے میں ہے۔میں شیشے کی طرح چمکتے فرش پر احتیاط سے چلتے ہوئے سب کو دفع دُور کر رہی تھی۔

میری کچھ پینے کی خواہش پر افلاق کولا کے ٹن پیک لے آیا۔ میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ارے میرے سویٹ سے بچے۔ عمر دراز ہو تمہاری۔ پوچھ تو لیتے کہ مجھے کیا چاہیے تھا؟ اب جو تھوڑی بہت محنت ہو رہی ہے اس موٹے سے وجود پر۔ یہ ان کولاؤں سے وہیں پھر آ جائے گا اور کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔''

وہ ہنسا۔ ''چلیں اب خیال رکھوں گا۔''

مجھے جارج ایچ پاؤل یاد آیا تھا۔ جس نے کہا تھا۔

What is the use of worrying?

It never was worth while.

So pack up your troubles in your old Kit bag.

and Smile, Smile, Smile.

میں کھڑی ہو گئی۔ میں نے افلاق کی طرف دیکھا اور کہا۔

افلاق I am packing up my worries in my old Kit bag.

and I am going To Smile, Smile, Smile.

باب نمبر:16

1۔ پیران پیر عبدالقادر جیلانی میرے بچپن کا، میرے خوابوں کا ایک دیومالائی کردار تھے۔

2۔ وہ پاکیزہ ہستی جنکی ساری حیاتی کا ہر لمحہ سادگی اور درویشی میں بسر ہوا، اس وقت نام جھام اور لشکارے مارتی آرائشی چیزوں میں گھری پڑی تھی۔

3۔ چیزوں میں الیکٹرومیگنٹ لہروں Electromagnetic waves کی موجودگی کا انکشاف اِسی عظیم ہستی نے کیا تھا۔

اچھی چائے کا ایک کپ، اچھی کتاب اور سیر سپاٹا کوئی ان کے بدلے ہفت اقلیم بھی دے تو نہ لوں۔

قہوے کی خوشبو کمزوری کسی گلی محلے سے گزرتے ہوئے یہ مہک باورچی خانے کی کھڑکی سے اُچھلتی کودتی باہر نکل کر میرے نتھنوں میں گھس جائے تو پاگل کرتی اِس خوشبو سے محظوظ ہونے کے لیے میں چند لمحے اُس گلی میں رُکنا چاہے پسند کروں پر اُس گھر کا دروازہ کھول کر یہ صدا کبھی نہ لگاؤں کہ بی بی اللہ کے نام پر مولا کے نام پر ایک کپ مجھے بھی عنایت ہو۔

یقیناً اِس میں کچھ میری غیرت اور شرم کا دخل ہرگز نہیں۔ مجھے کسی کے گھر کی چائے پسند نہیں آتی۔ چائے دانی کا خوبصورت ٹی کوزی سے ڈھپا ہونا ضروری، فی کپ کے حساب سے پتی اُس میں ڈلی ہو۔ قہوہ بھاپ اُڑاتا اور دودھ بہت اچھا۔

گیارہ بجے ٹی ٹائم۔

ہر مہینے میں ایک دن ایسا آتا جب میرا دودھ والا ناغہ کرتا۔تپ چڑھتی۔غصے سے کہتی تو اُس کا جواب ہوتا۔

''کسی اور کا بندوبست کر لیں بی بی۔ہم سے لینا ہے تو یہ ناغہ برداشت کرنا ہوگا۔دودھ کی کیا اوقات؟ ہماری تو جان و مال اُس پیران پیر غوث اعظم کی سرکار پر قربان۔یہ تو ہمارا معمولی سا نذرانۂ عقیدت ہے۔آپ مجھے کوسا نہ کریں۔''

یوں اِس انداز میں ہر ماہ چاند کی گیارہویں کو یہ پیر مجھ سے متعارف ہوتا۔یہ پیر میرے لیے اجنبی تھوڑی تھا۔دیومالائی سا کردار تھا اُس کا۔سارا بچپن اور لڑکپن اُس کی سچائی کی کہانیاں سُنتے اور پڑھتے گزرا تھا۔اُن میں سب سے مشہور اور زبان زد کہانی اُس چھوٹے سے بچے کے سچ کا اعلان اور ماں کی اطاعت کا اظہار تھی۔نتیجہ ڈاکوؤں کے سردار کی ڈاکوں سے توبہ تھی اور اُس پورے گروہ کا راہ ہدایت کی طرف لوٹنا تھا۔

کہانی تو یہاں ختم ہو جاتی۔مگر کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ اُس چھوٹی سی لڑکی کی جان کِس سیاپے میں پڑ جاتی؟ جنگل اپنی خوفناکیوں سے کیسے کیسے اُسے ڈراتا؟ شیر ببر کچھاروں سے نکل آتے۔چیتے، ہاتھی اور دوسری ال بلائیں بھاگی پھرتیں۔سانپ اور بڑے بڑے اژدھے دوڑے چلے آتے۔ڈاکوؤں کی خوفناک صورتیں بچے کے ساتھ اُن کے سوال جواب۔پتہ نہیں کتنا تلخ لہجہ ہوگا اُن کا؟ اللہ تُو کتنا اچھا ہے؟ تُو نے اس پیارے سے لڑکے کو ان سبھوں سے بچایا بھی اور بُرے لوگوں کو نیک بھی کر دیا۔

میری تو راتیں وابستہ تھیں اِن یادوں کے ساتھ۔بڑے ہو کر جب بڑی اور خشک چیزیں پڑھنے لگی تو تصوّف کیا ہے؟ اور تصوف کے سلسلوں کی مشہور لڑیاں جنیدیہ، فردوسیہ چشتیہ، نقشبندیہ اور اعظمیہ وغیرہ کہاں کہاں اور کِن کِن سے نسبت رکھتی ہیں جیسے علم سے تھوڑی سی آگاہی ہوئی تو جانا کہ سلسلہ قادریہ آپ کے نام نامی عبدالقادر سے متعلق ہے اور

آپ پیروں کے پیر ہیں۔

اب مصیبت تو ساری جہالت اور کم علمی کی ہے نا کہ سیدھے سادھے اور جاہل لوگوں نے آپ کی تعلیمات سمجھنے اور اُن پر عمل پیرا ہونے کی بجائے آپ کو خدا کے قریب کھڑا کر دیا ہے اور اندھی عقیدتوں نے لے لے گیارہویں والے دا ناں تے ڈُبی ہوئی تر جاوے گی جیسے اشعار درجنوں کی صورت گھڑ لیئے ہیں۔اور کیلنڈروں کی روغنی سطح پر ایک داڑھی والا نورانی صورت گیارہویں والا پیر بنا کر بٹھا دیا ہے۔

پیدائش ایران میں ہوئی۔مقام ایران کا صوبہ گیلان کا ایک گاؤں نیف Naif تھا۔اس تعلق سے گیلانی عربی میں گ کی جگہ ج رائج ہے جیلانی مشہور ہوئے۔باپ کا نام ابوصلاح موسیٰ اور ماں اُمّ الخیر فاطمہ تھیں جن کا واسطہ اور تعلق حضرت زین العابدین سے جا ملتا تھا۔مہینہ رمضان المبارک۔روایت ہے کہ ایک بار علاقے میں بادل گھرے ہونے کی وجہ سے رمضان کا چاند نظر نہیں آیا۔لوگ شک و شبہ میں تھے۔قرب و جوار کے چند لوگوں نے آپ کی والدہ ماجدہ سے رابطہ کیا کہ وہ ایک متقی اور پرہیز گار خاتون کے طور پر جانی جاتی تھیں۔والدہ سیدہ اُمّ الخیر فاطمہ نے جواب میں فرمایا ''آج میرے عبدالقادر نے خلاف عادت دن کے وقت دودھ نہیں پیا ہے اس لیئے میں سمجھتی ہوں آج پہلا روزہ ہے۔'' کچھ دن بعد معتبر شہادتوں سے اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔

اٹھارہ سال کی عمر میں بغداد آئے جہاں اُنہوں نے مدرسہ نظامیہ کے حنبلی مدرسۂ فکر میں مختلف استادوں سے فیض پایا۔فقہ میں ان کی رہنمائی ابوعلی مکارمی Mukharrimi جیسے جید اُستاد نے کی۔حدیث ابوبکر ابن مظفر سے پڑھی اور تفسیر ابومحمد جعفر سے۔

پچیس سال انہوں نے عراق کے صحرائی علاقوں کی خاک چھانی۔تبلیغ کی اور

لوگوں میں علم اور ہدایت بانٹی۔

جب زندگی نے پچاس کی حد چھوئی تب واپسی ہوئی اور یہیں ٹھکانہ بنایا۔ معمول کچھ یوں ٹھہرا تھا کہ صبح وہ تفسیر پڑھاتے۔ سہ پہر کائنات کے اسرار پر سائنس کے حوالوں سے بحث مباحثہ ہوتا۔ قرآن کی حکیمانہ فلاسفی زیر گفتگو آتی۔

صلاح الدین ایوبی کا وہ مشہور جرنیل ابن کودامہ Qudamah ان کا ہی شاگرد تھا جس نے یروشلم کو فتح کر کے اُسے عیسائی غلبے سے آزاد کروایا تھا۔

تعلیم وتدریس کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ تو زندگی کے آخری سانس تک چلا۔ اُناسی سال کی زندگی عبادت اور اسلام کی خدمت میں گزاری۔

ٹیکسی تیزی سے سڑکوں پر بھاگ رہی تھی۔ جس جگہ سے گزر رہی تھی۔ سارا علاقہ غُربت کی دلدل میں ڈوبا ہوا تھا۔ کوڑا کرکٹ، اڑتے پھرتے شاپر۔ ٹوٹی پھوٹی کاروں کا ملبہ، پانچ چھ منزلہ عمارتوں کے ٹوٹے شیشے۔ دیواروں میں گولیوں کے نشان۔ پانچ سال ہوئے ہیں ابھی تک یہ عمارتیں دیکھنے والوں کو اُن المناک لمحوں کی یاد دلاتی ہیں۔ یہ دُکھ بغداد کے چہرے پر، یہ نشان اس کی صورت پر جانے کب مٹیں گے؟

یہ محلّہ گیلانی تھا۔

گدلے آسمان، کھجور کے چند درختوں اور براؤن رنگ کی بلند چار دیواری میں نمایاں مسجد کا نیلا منقّش گنبد اور مینار اسی طرح نمایاں ہوئے تھے جیسے کسی صحرا میں شب کے آخری پہر درختوں کے بیچ سے چاند نمودار ہو جائے۔ بازار میں چہل پہل اور رونق تھی۔ دوکانیں کُھلی اور عورتوں، مردوں، بچوں کے ہجوم نظر آئے تھے۔ دیہاڑی دار دوکانوں کے سامان سڑک کے کناروں سے رینگتے رینگتے کافی آگے بڑھ رہے تھے۔ عراقی دوکاندار اُس جنگجو پہلوان کی طرح نظر آئے تھے جو سینہ تان کر سڑک کے بیچوں بیچ ڈکراتے

ہوئے چلتا اور کہتا ہے۔

''کرلو جو کرنا اے، سڑک تے میرے پیو دی اے۔''

اندر داخل ہونے سے قبل کی کیفیت بڑی ہیجانی سی تھی۔خدا کی عنایت پر شکر گزاری تھی۔بھلا میں اِس قابل کہاں کہ اتنی بڑی ہستیوں کا دیدار کرسکتی۔

گیٹ کے ساتھ سیاہ گرل اندر تک چلی گئی تھی۔مین گیٹ سے بہت دور چیک پوسٹ تھی۔کیمرے تو ممنوع تھے۔میں نے کیمرہ اندر لے جانے کی درخواست بڑے عاجزانہ انداز میں کی تھی۔لڑکی خاصی حلیم الطبع سی تھی مگر جس انداز میں انکار ہوا اُس نے سمجھایا کہ یہ سب لڑکیاں بھی ایک ہی تھیلی کی چٹیاں بٹیاں ہیں۔صورت کی نری مومن اب کرتوت کافراں کہنا کچھ مناسب نہیں۔

مرکزی دروازہ بلند و بالا،خوبصورت اور نفیس ڈیزائن دار تھا۔صحن خاصا کشادہ ہے۔داہنے ہاتھ مسجد اور روضۂ مبارک ہے۔وسیع و عریض ہال کے عین درمیان میں روضہ مبارک ہے۔یہاں پردے کا اہتمام ہے۔مرد اور خواتین کے حصّے الگ الگ ہیں۔دیواریں شیشے کے کام سے سجی جگمگ جگمگ کرتی ہیں۔گنبد کی چھت میں لٹکتے فانوس سے روشنی کی لہریں پھوٹ رہی تھیں۔

قبر کا تعویذ مبارک کوئی پانچ فٹ اُونچا ہے۔مشک و عنبر سے لدی پھندی معطر خوشبوئیں ایک تقدس بھری فضا کا احساس جگا رہی تھیں۔سامنے والی سیڑھیاں پلیٹ فارم کی صورت اوپر تک چلی گئی تھیں یہاں صحن کے آگے کمرے تھے۔

میں نے کوئی سو بار شکر ادا کیا ہوگا کہ اس وقت روضہ مبارک بند نہیں تھا۔حجرے کا کمرہ چھوٹا سا تھا۔چاندی کی جالیوں سے اندر جھانکا۔فانوسوں کی تیز روشنیوں میں سبز چادروں کی چھاؤں میں آرام کرتی ایک پاکیزہ ہستی جنکی پوری زندگی کا ہر لمحہ سادگی

اورنمودونمائش سے بے نیازی میں بسر ہوا اس وقت تام جھام اور لشکارے مارتی آرائش چیزوں میں گھری پڑی تھی۔عقیدت مند بھی کیسے ظالم ہیں؟ تعلیمات بُھلا بیٹھے ہیں اور دُنیاداری کے جھمیلوں میں اُلجھ گئے ہیں۔

مجھے محسوس ہوا تھا جیسے دھوپ بڑی سرعت سے چھتوں کے بنیروں سے نیچے ہوتے اب گم ہونے لگی ہے۔عصر کا وقت تنگ تھا۔نفل چھوڑ میں نے فوراً نماز پڑھی۔دعامانگی۔پھر جیسے مجھے شدید قسم کی تشنگی کا احساس ہوا تھا۔

میرے اندر نے کہا تھا۔

''تم یہاں کس وقت آئی ہو؟ ابھی تھوڑی دیر میں اندھیرے کی چادر تننے والی ہے۔تم تو کچھ بھی نہیں دیکھ سکو گی۔یہ جگہ کیا ایسی ہے جہاں تم آؤ اور ہاتھ لگا کر چلی جاؤ۔گویا خانہ پُری کرنی تھی۔

''ہاں میں نے اپنے آپ سے بات کی تھی۔

مجھے تو یہاں کا لنگر بھی کھانا تھا۔طارق اسمٰعیل ساگر نے خصوصی طور پر مجھے لنگر کھانے کی تاکید کی تھی۔زمانوں سے پکتا خاص و عام میں بٹتا یہ یقیناً ان کے فیضانِ نظر کا اعجاز تھا۔

اور جب میں اپنے دل میں دوبارہ آنے کی منصوبہ بندی کرتی تھی۔میں نے ذرا فاصلے پر دو نوجوان لڑکیوں کو دیکھا۔تعارف ہونے پر خوشگوار حیرت سے دوچار ہوئی۔خادم ابو قاسم کی صاحبزادیاں تھیں۔والد کا تعلق حیدرآباد دکن سے تھا۔غوث اعظم سے عقیدتوں اور محبتوں کے رشتوں میں بندھے ہوئے زمانوں پہلے یہاں آکر آباد ہو گئے۔مزار کی دیکھ بھال سنبھال لی۔فائزہ اور ثناء پڑھی لکھی عربی، اُردو اور انگریزی پر عبور رکھتی تھیں۔مجھے سرشاری سی محسوس ہوئی۔میں اُن کے ساتھ باہر آئی۔

کشادہ صحن کے پاس کوئی دس بارہ سیڑھیوں پر عورتیں سیاہ عباؤں میں لپٹی بیٹھی تھیں ۔ بچے کھیلتے تھے ۔ ثنا بتاتی تھی کہ تنگ اور چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہنے والے لوگ شام کو گھروں سے نکل کر یہاں آجاتے ہیں ۔ مغرب اور اکثر نماز عشاء کے بعد واپسی ہوتی ہے ۔

مہمان خانے کی عمارت دو حصّوں پر مشتمل تھی ایک مُلکی زائرین اور دوسرا غیر مُلکیوں کیلئے ۔

''لائبریری اُوپر کی منزل میں ہے ۔ کیا اُسے دیکھنا چاہیں گی ؟''

''کیوں نہیں ۔ مگر کسی دن کے وقت آؤں گی اور تفصیلی دیکھوں گی ۔''

یہ مجھے اُن کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ کُتب خانے میں کوئی پچاس ہزار کے قریب کتابیں اور مخطوطات ہیں ۔ ایک آدھ تو ایسا نادر نسخہ ہے جو دجلہ کے پانیوں سے نکالا گیا تھا ۔

یہ جہاں مزار ہے یہاں پہلے مدرسہ تھا ۔ وہی مدرسہ جس میں پڑھنے کیلئے آپ آئے اور جہاں آپ نے زندگی کی آخری سانسوں تک پڑھایا ۔ درمیانی عمر کا کچھ وقت بغداد سے باہر تبلیغ و تدریس میں بھی گزارا ۔

کچھ یاد آیا تھا ۔ ذکر کی ایک محفل یاد آئی تھی ۔ شاید حنا بابر کے ہاں یا سید سرفراز شاہ کے ہاں ۔ گفتگو کے دوران کسی نے غوث اعظم کے بارے میں بڑی بڑی باتیں کی تھیں کہ چیزوں میں Electromagnetic waves کی موجودگی کا انکشاف اُس عظیم ہستی نے کیا تھا ۔

سیڑھیوں سے اُوپر کشادہ آنگن کے پار محرابی دروازوں والی وسیع و عریض عمارت کا سلسلہ نظر آتا ہے ۔ صحن میں ایک طرف گھنٹہ گھر ہے دوسری طرف لنگر ہے ۔ ایک بہت بڑی دیگ میں چاول، گوشت، دالیں سب ڈال دی جاتی ہیں ۔ ہزار آدمیوں کا روز کھانے کا

پکنا یہاں معمول ہے۔بدترین حالات میں بھی یہ لنگر بند نہیں ہوا۔کاش میں دوپہر کو آتی اور لنگر کھاتی ۔اس لنگر کو کھانا بھی بڑی سعادت تھی۔

مغرب کی نماز اور دعا کے بعد فائزہ نے مجھے ان کے صاحبزادوں شیخ عبدالجبار گیلانی اور شیخ صالح بن سید کے روضۂ مبارک دکھائے۔وہ سامنے والے حصّے میں تھے اور بند تھے۔

اُن کی زندگی پر کچھ مزید روشنی بھی انہوں نے ڈالی۔

وہ باکمال ولی اللہ تھے۔پانچ عباسی خلفاء کے دور انہوں نے دیکھے۔شخصی حکمران جن کے شاہانہ انداز اور درباری چکا چوند آنکھیں پھاڑتی تھی۔ایسے میں کھڑے ہو کر با آواز بلند یہ کہنا کتنے دل گردے کا کام تھا؟''اے لوگو خیال کرو دین کی دیواریں گر رہی ہیں اور اس کی بنیادیں بکھر رہی ہیں۔اے باشندگان زمین آؤ جو گر گیا ہے اُسے مضبوط کریں اور جو ڈھے گیا ہے اُسے درست کردیں۔ایک اکیلا آدمی کچھ نہیں کرسکتا۔سب کو مل کر کام کرنا ہے۔''

انہوں نے مسلمانوں میں عمل کے احیاء کی بھرپور کوشش کی۔تصوف کو واضح اور سادہ اسلوب دیا۔اُن کی تالیفات اِس لحاظ سے صوفیانہ ادب میں بڑا مقام رکھتی ہیں کہ انہوں نے اِسے عام فہم بنایا۔تصوف کے ساتھ وابستگی کے دروازے بھی عام آدمی کیلئے کھول دیئے۔اُن کے ہاں حرام حلال کا بڑا واضح تصور تھا۔

چار پا کباز بیویوں اور ایک کم پچاس بچوں کا سُن کر میرے اندر کی جدید نظریات سے وابستگی رکھنے والی عورت جو بچے دو ہی اچھے جیسے نعرے سے متاثر ہے زیرلب''ہائے اتنے بچے۔''جیسا تاثر مُنہ سے کچھ نہ بولنے کے باوجود چہرے پر سجا بیٹھی تھی۔

میرے اللہ! لڑکیاں کتنی پٹاخہ قسم کی تھیں؟پل بھی نہیں لگا اور سمجھ گئیں۔دُنیا بھر

کے زائرین کو بھگتاتے بھگتاتے کیسی خرانٹ ہوگئی تھیں کہ چہرہ شناسی میں طاق ہوئی پڑی تھیں۔انہوں نے تو میرے وہ لتے لیے تھے کہ ذہن کے دریچوں کی ساری چولیں ہلا دیں۔چھوٹی نے تو ڈھیر لگادیئے تھے مثالوں کے۔

کہیں عیسائیت کی تبلیغ کیلئے خود کو وقف کرنے والی Nuns جو غیر فطری زندگی گزارتی ہیں کے حوالے،کہیں فادرز کا ذکر۔کہیں یونانیوں اور رومنوں کی سینکڑوں بیویوں کے بارے انکشافات۔جانتی ہیں جب محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا تو را جہ داہر کی سات سو بیویاں تھیں۔

''اللہ میرے میں نے فی الفور اپنے اندر کے شیطان کو چانٹے لگائے جو میری عقیدتوں کے ایسے بھونڈے اعتراضات سے پُر کانٹے پر کمر بستہ رہتا ہے۔

دُنیا میں اسلام پھیلانے والی یہی نیک اور برگزیدہ ہستیاں ہی تو تھیں۔غوث اعظم اسلام کے وہ فرزند کہ جن پر سارا عالم اسلام نازاں۔بادشاہوں کو تو خدا نے توفیق ہی نہیں دی۔ان کے بیٹے بّرصغیر میں پہنچے۔شمالی افریقہ کے مُلکوں،عرب دُنیا کے مغربی علاقےں میں تبلیغ کی۔

عقائد کی اصلاح پر باپ بیٹوں کا بہت زور تھا۔آپ ہفتے میں تین بار وعظ فرماتے۔کوئی ستر (70)اسی(80)ہزار کا مجمع ہوتا۔تاثیر کا یہ عالم تھا کہ اکثر لوگ شدت گریہ سے بے ہوش ہو جاتے وجہ صرف یہی تھی۔

کہ گفتہ او گفتہ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبداللہ بود۔

ثنا نے مجھے ان کی تصنیفات سے بھی آگاہ کیا جو تقریباً 38 اڑتیس کے قریب تھیں۔کچھ تو زمانے کے ہاتھوں خورد برد ہو گئیں اور کچھ کتب خانوں اور عجائب گھروں میں

محفوظ ہیں۔چند نام اُس نے مجھے نوٹ کروائے اور بتایا کہ یہ لائبریری میں ہیں۔

ان کا اہم کام Al-Ghunya li Tariq al-haqq waal-din

الفتح الربانی۔Al Fath ar- Rabbani الفیض الرحمانی،القصیدہ الغوثیہ

Malfuzat

فتوح الغیب Fatuh-al-Ghaib

جلاال خاتس Jala al khatis

سرالاسرار Sir Al-Asrar

تو میں نے سوچا چلو یہ سب کام اب اگلی ملاقات پر ہی ہوں گے۔

جنگ کے دنوں بارے بات کرتے ہوئے فائزہ کہتی تھی۔ہمارے گناہوں کی سزا۔کربلا اُتری ہوئی تھی۔آپودھاپی اور نفسانفسی کا وہ عالم تھا کہ قیامت کا سماں نظر آتا تھا۔سڑکوں پر غریب بے کس لوگ مرے پڑے تھے۔کوئی دفنانے والا نہیں تھا۔پانی کا قحط پڑ گیا تھا۔

دونوں بہنیں دو مُلکوں سے تعلق کے باعث حالات حاضرہ سے واقف اور بخوبی آگاہ تھیں۔

صدام کے بارے میں بات ہوئی تو دونوں بول اُٹھیں۔

وہ بھاگ سکتا تھا۔کسی دوسرے مُلک میں پناہ لے سکتا تھا مگر اُس نے ایسا نہیں کیا۔اپنے مُلک میں رہا اور یہیں جان دی۔

صدام میری پسندیدہ شخصیت تھا۔کہتے ہیں وہ امریکی ایجنٹ تھا۔میں نہیں مانتی۔وہ محبِّ وطن سر پھرا تھا۔ضدی اور ہٹ دھرم تھا۔آمر تھا لیکن تعلیم،صحت اور لوگوں کے روزگار کی فراہمی میں بہت مخلص تھا۔آج ہر عراقی پڑھا لکھا ہے تو اِس کا کریڈٹ صدام کو جاتا

ہے۔غریب کی زندگی کتنی آسان تھی؟ اُس کا اندازہ صرف اِس ایک بات سے لگا لیں کہ خلیج کی جنگ کے دوران بجلی، پانی اور فون کا ایک مہینے کا بل صرف ایک ڈالر ہوتا تھا۔پٹرول سستا تھا۔راشن کی فراہمی کا نظام موثر تھا۔پانی کے سینکڑوں پلانٹ صاف پانی مہیا کرتے تھے۔امریکہ بہت ظالم ہے اُس نے ہماری نسلیں تباہ کردیں۔ہمارا دینار مضبوط تھا۔اب آپ نے اُس کی حالت دیکھی ہوگی۔

میں اُسے سنتی تھی اور کہتی تھی۔''دیکھنا سننا کیا؟برت رہی ہوں۔بے چارہ ککھوں ہولا۔''

وہ جیسا بھی تھا۔اپنے لوگوں کا وفادار تھا۔امن و امان کا محافظ تھا۔شیعہ سُنّی کو نتھ ڈالی ہوئی تھی اُس نے۔اب دیکھو کیسے شُتر بے مہار سے ہوگئے ہیں؟

دوبارہ آنے اور بقیہ چیزیں دیکھنے کا وعدہ کرکے اُٹھی۔

''ضرور چکر لگائیے گا۔آپ کی ملاقات سید احمد الگیلانی اور ان کے بھائی عبدالرحمٰن الگیلانی سے کروائیں گے۔سید احمد پاکستان میں عراق کے سفیر بھی رہے ہیں۔اُن سے آپ کا ملنا بہت فائدہ مند ہوگا۔آپ محفل سماع بھی دیکھیے۔''

''محفل سماع۔''میں نے قدرے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''ہاں ہاں محفل سماع۔دف،تلوار اور قرآنی آیات پر دائروں میں رقص۔''

''اوہو whirling dervishes ٹائپ کی چیز۔بھئی اسے تو ضرور دیکھنا ہے۔''

باہر نکل کر بغلی سڑک پر آئی کہ افلاق کو یہیں آنے کا کہا تھا۔ملگجے سے اندھیرے میں کشادہ سڑک کی ویرانی بڑی نمایاں تھی۔روشنیاں نہیں تھیں اور پورا حصّہ گویا نیم تاریک سا تھا۔سامنے ایک وسیع و عریض احاطے کی دیوار تھی جس کے اندر چھوٹے چھوٹے گھر

تھے۔سڑک کے کنارے بیٹھ کر میں نے سوچا اور خود سے کہا۔

''اب کیا کروں۔''

پندرہ،بیس منٹ، آدھ گھنٹہ۔اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا اور ساتھ ہی خوف کی لہریں بھی اندر کہیں اُترنے لگیں۔اُٹھوں ،دیکھوں تو سہی۔کہیں سامنے نہ گاڑی کے پاس کھڑا ہو۔تیز قدموں سے روڈ کراس کی۔اگلا منظر اور دہلانے والا تھا۔دُور تک جاتی سڑک سناٹے اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔تباہ شدہ لوہے کا سامان ،جلی ہوئی گاڑیوں کے انجر پنجر کے یہاں وہاں بکھرے ڈھیر منظر میں مزید ہولناکیاں بھر رہے تھے۔کہیں کہیں فراٹے سے گزرتی کوئی گاڑی، مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے موت ابھی یہاں رقص کرتی ہوئی بھاگی ہو۔

میں واپس مُڑی تھی۔دھک دھک کرتے دل کو سمجھاتے ہوئے کہ بڑھاپے میں ایسا خوف وڈر کسی سنگین صورت کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔حوصلہ ضروری ہے۔مزار کا متولی اور اُس کی بیٹیاں اُردو سمجھتی ہیں۔وہ مددگار ہو سکتے ہیں۔

مرکزی گیٹ کی طرف آئی۔تو خدا کی شکر گزار ہوئی کہ افلاق وہاں کھڑا تھا۔اُسے پریشانی سے آگاہ کیا۔

''دراصل پولیس والے وہاں ٹھہرنے ہی نہیں دے رہے تھے۔گاڑی کو پارکنگ لاٹ میں لانا پڑا۔میں اسی لئے خود یہاں کھڑا ہو گیا تھا۔''

محلّہ گیلانیہ سے ملاقات کروانے میں افلاق کی نیک نیتی تھی۔وگرنہ وہ مجھے وہاں سے سیدھا دجلہ کے دوسرے پُررونق حصّے میں بھی لاسکتا تھا۔

کچھ جگہیں ایسی ہیں جو دیکھنی ضروری ہیں۔گاڑی ان تنگ و تاریک گلیوں میں نہیں جاسکتی۔اس وقت جھٹ پٹے کا سا سماں ہے جتنا چل سکتی ہیں چل لیں۔اُس نے کہا تھا۔

یہ تو بہر حال میں طے کیئے بیٹھی تھی کہ ایکبار دن کی روشنی میں مجھے یہاں پھر آنا ہے۔ بغداد کا سحر ہر دن اپنی گرفت سخت کیسے جاتا تھا۔ میں اُن گلیوں میں تھی جہاں وہ میر اسندباد جہازی پھرا کرتا تھا۔

چھوٹی چھوٹی دکانیں۔خریداری کرتے ماٹھے ماٹھے لوگ۔کناروں پر جلتے مدھم سی روشنی والے بلب جو بہر حال صُبح کاذب جیسی صورت پیدا کرتے تھے۔

افلاق راستوں کے یہ پیچ وخم اور گلیوں کی یہ اونچ نیچ کہیں مجھے اور کسی سیاپے میں نہ ڈال دے۔مجھے دن کی روشنی میں دوبارہ یہاں ضرور آنا ہے۔

پیارا سالڑکا ہنس پڑا تھا۔

''دوبارہ کیا، سہ بار، چہار بار آئیں۔آپ کی تو پیاس بجھنی چاہیے نا۔''

''چلیے ایک چکر رشید روڈ کا لگاتے ہیں۔''

رات کی تاریکی۔دجلہ کا کنارہ سڑک پر تیزی سے بھاگتی گاڑی۔نیلی پیلی روشنیوں میں جگمگاتی بغداد کی شاندار عمارتیں۔کھانے پینے کے سلسلے۔کافی اور کولڈ ڈرنکو کے کھوکھے۔لوگوں کے ہجوم، کہیں شطرنج کھیلتے، گپیں ہانکتے، مچھلی کھاتے، کہیں حُقے پیتے، کہیں قہوے کی چھوٹی چھوٹی گلاسیاں پکڑے زندگی کی رعنائیوں میں گُم تھے اور نہیں جانتے تھے کہ دور دیس کی ایک سیاح اُن ہی جیسے ستم رسیدہ حالات کی شکار بغداد کی سیر کرتے ہوئے کن محسوسات کا شکار ہے؟

ابو جعفر منصور کا بغداد، ہارون الرشید کا بغداد، اتنی تباہیوں کے باوجود مُسکرا رہا تھا۔ہنس رہا تھا۔افلاق نے مجھ سے کشتی میں دجلہ کی سیر کا پوچھا تھا۔''بوٹ ٹرمینل پر چلنا ہوگا۔''پل بھر کیلئے سوچا اور کہا۔

''نیل کے پانیوں کو ہاتھوں سے چھونے کی خواہش کی طرح دجلے کے پانی بھی

میری کمزوری ہیں۔مگر پہلے ذرا اہم جگہوں سے نپٹ لیں۔''

سیدون سٹریٹ Sadoun کے تعارفی حروف مجھے اتنا متاثر نہیں کر رہے تھے جتنی میری آنکھیں میرے جذب وشوق کو اپنے ساتھ ساتھ بھگائے پھرتی تھی۔فلسطین ہوٹل اگر چمکتا تھا تو اس کے بالمقابل ابونواس سٹریٹ پر شیرٹن کونسا کم تھا؟ میں نے فلسطین ہوٹل کی منزلوں کو گننا چاہا پر چودہ پندرہ کے بعد چھوڑ دیا کہ گڑ بڑ ہو رہی تھی۔دفع کروہوں گی بیس بائیس۔

سیدون سٹریٹ میں دیکھنے کو بہت کچھ تھا۔بس اگر کمی تھی تو وقت کی۔ یہاں لبریشن سکوائر میں نامعلوم سپاہی کی یادگار تھی۔دیوہیکل محرابی صورت تمکنت سے کھڑی عراقی فنکار عبداللہ احسان کمال اور رفعت کا اپنی اور قوم کی طرف سے نذرانہ عقیدت اُن سپاہیوں کے لئے جو۱۹۵۹ میں ملک اور قوم کی عزت ووقار کے لئے قربان ہوئے۔

پاس ہی 14 رمضان مسجد اپنی خوبصورتیوں کے ساتھ فوراً توجہ کھینچتی تھی۔ رات کی روشنیوں میں مسجد کے گنبد اور مینار چمکتے تھے۔کھجور کے درختوں کی بلندی روشنیوں میں کچھ اور بلند دکھتی تھی۔بلند و بالا عمارات چمکتی تھیں۔شاہراہوں کے گول چکر ایک دوسرے کو داہیں بائیں سے کاٹتے تھے۔روشنیوں کا ایک طوفان اُمڈا ہوا تھا جو ہراساں کیے دیتا تھا۔

باب نمبر: 17

1۔ بصرے کے ساحلی شہروں کے مارشی گھر آرٹ کے دل آویز شاہکار ہیں۔
2۔ عراقی گائیک سید عبود کی گلوکاری وقت اور زمانے سے ماوراء ہے۔
3۔ امریکہ اور برطانیہ تین لاکھ سے زیادہ عراقی بچوں کے قاتل ہیں۔
4۔ سعدی یوسف، مظفر النواب اور بہت سے دیگر شاعر آج بھی جلاوطن ہیں۔عراق میں ان کے داخلے پر پابندی ہے۔
5۔ صدام کو سمجھانے میاں نواز شریف بھی بغداد گئے۔

میں جس گھر کے سامنے کھڑی تھی وہ میرے حسابوں بمشکل دس مرلے میں ہوگا۔سیاہ گیٹ جانے کب کا پینٹ شدہ تھا۔کھجور کا اکلوتا درخت، پودینے کی چھوٹی سی کیاری تھوڑی سی گھاس اور دیوار پر چڑھی پیلے پھولوں والی بیل دو بالشت کے لان میں نظر آتی تھی۔مغرب سے ذرا پہلے کا کھلا کھلا سماں اِن دورویہ گھروں کی گلی پر پھیلا ویسا نہ دکھتا تھا جیسا میں باہر دیکھتی آ رہی تھی۔مین سڑک سے اُتر کر دائیں بائیں مڑتی گلیوں میں مجھے ایک بھی گھر ایسا نظر نہیں آیا تھا جس کی تازگی نے مجھے متوجہ کیا ہو۔

بہت کشادہ خوبصورت شاہراہ فلسطین سے بیروت سکوائر میں آئے علی درس Ali Dris کا علاقہ۔یہاں سے چار چھوٹی سڑکیں چھوڑیں۔پانچویں میں گھر تھا۔

بڑی سڑکوں کو چھوڑ کر اندر کی سڑکیں کچھ اتنی اچھی حالت میں نہ تھیں۔صفائی ستھرائی بھی ایسی ہی تھی۔کاغذوں کے ٹکڑے یہاں وہاں اڑتے پھرتے تھے۔چھوٹے موٹے کنکر پتھر پھلوں کے چھلکے فٹ پاتھوں کی بغلوں میں گھسے پڑے اور سفید و سیاہ شاپر کی

لام ڈوریاں طبعیت پر کوفت کے سے تاثر چھوڑتی تھیں۔

صدام کے زمانے میں صفائی کا معیار بہت اُونچا تھا۔چھوٹی بڑی شاہراہیں اور گلی کوچوں کی صفائی رات کو ہوتی تھی۔صُبح ہر چیز چمکتی تھی۔

میں نے حیرت سے افلاق کی اِس بات کو سُنتے ہوئے کہا تھا۔"کمال ہے۔"

دروازہ کھلا۔ذرا بھاری بھر کم کھلتے رنگ والا کوئی چالیس ۴۰ بیالیس ۴۲ کے ہیر پھیر میں سفید توپ پہنے جو آدمی باہر نکلا تھا افلاق سے بوس و کنار کی فراغت کے بعد میری طرف اھلاً و سہلاً و مرحبا کہتے ہوئے مصافحہ کیلئے بڑھا وہ اسمٰعیل مہدی تھا۔سادہ سا، مخلص سا، افلاق کے کالج میں اکنامکس کا اُستاد تھا۔

ڈرائنگ روم زیادہ بڑا نہ تھا۔مکین کی طرح سادہ۔صرف ایک صوفہ، اطراف میں رکھی چار کرسیاں، درمیان میں پڑی ایک تپائی۔ہاں البتہ کمرے میں تین چیزیں بڑی نمایاں تھیں۔کتابوں کی الماری، دیوار پر ٹنگی واحد بڑی سی تصویر اور کارنس پر دھرا ریکارڈ پلیئر۔

ایک پاکستانی خاتون کے عراق اور خاص طور پر اُن سے ملنے کیلئے ان کے گھر آنے پر مشکور ہونے کا گہرا احساس ان کے لہجے میں بہت نمایاں ہو کر میرے سامنے آیا تھا۔

صاحب خانہ عقبی دروازے سے غالباً اندر گئے۔مگر ہوا یہ کہ جانے سے قبل کارنس پر دھرے ٹیپ ریکارڈ کا بٹن آن کرتے گئے۔مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کمرہ آناً فاناً اپنایت اور مانوسیت کی میٹھی سی خوشبو سے بھر گیا ہے۔میں نے افلاق کو مسکراتی آنکھوں اور ہونٹوں سے دیکھا۔جواباً وہ بھی ہنس پڑا۔

لگتا ہے سارا عراق Give me love کے

Songs of the broken hearted Baghdad کا عاشق ہوا پڑا ہے۔"

''دراصل ہمارے قدیمی کلچر کی نمائندگی کرتی اِس پرانی شراب میں نئی کی آمیزش ہوگئی ہے۔اب ایسے میں نشہ تو دوچند ہوجاتا ہے نا۔''

اس کی بات تو ٹھیک تھی۔

سچ تو یہ تھا کہ میں تو خودافیون کی گولی کی طرح ان کی عادی ہورہی تھی۔آج میرا چوتھا دن تھا اوراس کے ہزار ریکارڈز میں سے چار پانچ کو لگاتار سُن رہی تھی۔سلم داؤد Salim Dawood،سیدالکردی،بدریہ انور،سلطانہ یوسف اور سید عبود۔

سلطانہ یوسف ہماری طاہرہ سید کی طرح پہاڑی لہجے کی گلوکارہ تھی۔پاٹ دارآواز مگرسید عبود کی کیابات تھی۔

تو میں اُس گھر میں واپس آتی ہوں جہاں افلاق مجھے لایا تھا۔

میرے لیے صوفے پر بیٹھنا محال ہورہا تھا۔کہ دیوار پر آویزاں غیر معمولی پینٹنگ جیسے مجھے قریب آنے کیلئے بلا رہی تھی۔میں اُسے دیکھنے کیلئے اس کے پاس جا کھڑی ہوئی۔کس قدر اثر انگیز تھی یہ۔ عراق کے دلدلی علاقے کی تھی۔جہاں حدِ نظر پانیوں کا پھیلاؤ تھا۔اُن پانیوں پر اُڑتے آبی پرندوں کی قطاریں تھیں۔شام کا سورج پانیوں پر ایک طویل ترچھا راستہ بنارہا تھا۔ایسا فنکاری سے بھرا ہوا جیسے کسی سُنار نے سونے میں ڈھال کر سجا دیا ہو۔

کشتی میں کھڑا عراقی چوبی ڈانگ سے سرکنڈوں میں جانے کیا چیز کھوج رہا تھا۔ذرا دور اُسکا گھر تھا۔کہہ لیجیے اُسکا جھونپڑا تھا۔پر کیا کمال کا تھا؟

تصویر میں میری محویت دیکھتے ہوئے اسمٰعیل میرے پاس آکر کھڑے ہو گئے تھے۔بتانے لگے۔یہ سرکنڈوں،نرسلوں،پپائیرس Papyrus(ایک درخت جسکی چھال کاغذ جیسی ہوتی ہے)مٹی اور کولتار سے بنتا ہے۔

جوگھر میرے سامنے تھا اُس کا باہر اور اندر آرٹ کا ایک دلآویز شاہکار تھا۔چلو باہر سے جو مُبت کاری تھی سو تھی پر اندرونی تو اِس درجہ کمال کی کہ بے اختیار اُسے دیکھتے رہنے کو دل چاہ رہا تھا۔تھوڑے تھوڑے فاصلے سے نیم قوسی دائرے جو دراصل اِس مارشی گھر کو سپورٹ دیتے تھے۔زمین سے چھت تک ان کے درمیان لگے سرکنڈوں کی کیا ڈیزائن داری تھی۔یہ محراب درمحراب ایک وسیع وعریض سرنگ کیطرح دُور تک جاتا ہوا ایسا راستہ تھا جسکے فرش پر بچھی نرسلوں سے بنی مظبوط چٹائیوں پر بیٹھے افرادخانہ صدیوں پرانی کسی تہذیب کا حصّہ نظر آتے تھے۔

''میں یہاں نہیں جا سکتی ہوں۔''

میرے اِن چھ لفظی جُملے میں بہت سے معانی پوشیدہ تھے۔حالات کی نزاکت کا اگر اعتراف تھا تو وہیں اُس کے ساتھ ساتھ ایک سوال بھی "حسرت" جیسی خواہش میں لپٹا ہوا۔

جُملہ کہہ کر میں نے اُس مہربان میزبان کو دیکھا تھا اس امید پر کہ وہ کہے نہیں یہاں تو آپ جا سکتی ہیں۔

اُس نے کُرسی پر بیٹھتے ہوئے مُٹھی بھی سی شیشے کی گلاسی میں چھوٹی سی سٹیل کی چائے دانی سے قہوہ انڈیلتے ہوئے کہا تھا جو دس بارہ سال کا لڑکا ابھی رکھ کر گیا تھا۔

''آیئے قہوہ لیں۔''

میں نے کڑوے قہوے کا چھوٹا سا سِپ لیتے ہوئے امید بھری نظروں سے پھر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''بصرہ میں تو بہت سختی ہے۔''

لمبی سی آہ یاس میں لپٹی ہوئی اسمٰعیل کے لبوں سے نکلی تھی۔

''بصرہ تو برطانیہ کی ہمیشہ سے کمزوری تھا۔اب باقی بھی مل گئے ہیں۔انہیں بھی بہت پسند ہے۔چپّے چپّے پر بیٹھے ہیں۔ناصریہ میں بھی صورت کچھ اتنی حوصلہ افزا نہیں۔یوں اگر چلی بھی جائیں تو راستے میں جگہ جگہ چیک پوسٹوں پر جانچ پڑتال۔سوال جواب کے لمبے سلسلے۔چیبیش Chebayish ناصریہ سے کوئی سوکلومیٹر ہے وہاں سے پھر کشتیوں پر دلدلی علاقوں کا سفر ہے۔سردست جانا خطرے سے خالی نہیں۔

انہوں نے پاکستان کے بارے میں پوچھا تھا۔کاش میرے پاس کوئی فخر سے بھرا جملہ ہوتا۔مایوسی اور دُکھ میں ڈوبے احساسات۔

''دراصل ترقی پذیر ملکوں کی قیادت اگر غیر معمولی فہم وفراست اور وژن کی مالک نہ ہو تو ملک آگے جانے کی بجائے سوسال پیچھے چلے جاتے ہیں۔ہمارے تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ جنہیں ہم دیس نکالا دے چکے ہیں وہ بدبخت پھر ہم پر حاوی ہو جائیں گے۔عراقیوں کو ہمیشہ سے اپنے قبیلے،اپنی قوم،اپنی تہذیب،اپنی شناخت اور اپنے مُلک پر فخر رہا ہے۔''

''صدام کو اس منظر نامے پر کہاں رکھتے ہیں؟''

''دنیائے عرب کا لیڈر بننے کا شوق لے بیٹھا۔اپنی ذات کے بُت کو خدا بنا دینا چاہتا تھا۔گھروں،گلیوں،کوچوں،سڑکوں،بازاروں،چوراہوں،دوکانوں،دفتروں میں تصویریں سجا دینا کوئی کارنامہ نہیں اگر یہ دلوں میں نہ لگیں۔ناصر بننے کا خواہاں تھا۔

یوں کچھ انتظامی معاملات میں بہتر تھا۔جوڑ توڑ میں بھی ماہر تھا۔دونوں بڑی طاقتوں سے اپنے اقتدار کو پکا کرنے کیلئے سیاست کرتا رہا۔اُن کا آلہ کار بھی بنا۔بہرحال سیاسی دانشوری سے خالی تھا۔''

تبھی ایک اونچی لمبی گوری چٹی موٹی تازی خاتون کمرے میں آئیں۔بڑی

خوبصورت سی بچی نے ماں کا بازو تھاما ہوا تھا عمر یہی کوئی آٹھ نو سال ہوگی ۔تعاقب میں بیٹا بھی تھا۔وہ کوئی دس بارہ کا ہوگا۔ میں فی الفوران کی طرف متوجہ ہوئی ۔میری توقع اور خیال کے مطابق وہ خوبصورت تو تھیں مگر جس حد تک ماڈرن تھیں اُس کا مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ میں تو اِن دنوں گلیوں بازاروں میں سیاہ عباؤں میں ڈھکی ڈھکائی عورتوں کو ہی دیکھتی تھی ۔کہیں کوئی نانواں نانواں سادا نہ مغربی لباس میں نظر آتا تھا۔نہرین اسمٰعیل شوخ چھوٹے چھوٹے گلابی پھولوں والا سکرٹ پہنے تھیں ۔ٹانگیں ننگی اور پاؤں میں عام سی چپل تھی ۔گلے میں موٹے موٹے چمکدار موتیوں والا ہار تھا جو سینے پر لوٹنیاں لگاتا ناف کو چھوتا تھا۔بال شانوں تک کٹے تھے۔

خاتون متاسف سی تھیں کہ افلاق نے اطلاع دینے کی ضرورت نہیں محسوس کی ۔انہیں آج رات کسی کے ہاں کھانے پر جانا تھا۔اب وہ اسے ملتوی بھی نہیں کرسکتی ہیں۔

''ارے آپ ذرہ برابر محسوس نہ کریں ۔یہ جو اتنی سی ملاقات ہوگئی ہے میرے لیے یہ بھی بہت اہم ہے۔''

میں نے فی الفور دلداری کرنا ضروری سمجھی تھی۔

وہ مجھ سے وعدہ لینا چاہتی تھیں کہ میں دوبارہ چکر لگاؤں۔

''دیکھیے یہ تو وہی بات ہوگئی کہ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں ۔آپ جتنی بار کہیں گی میں آؤں گی ۔میرے لیئے اِس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہوگی۔''

نہرین اسمٰعیل ڈگری کالج میں اکاؤنٹس پڑھاتی تھیں۔بہت اچھی انگریزی بولتی تھیں اور بہت خوش اخلاق بھی تھیں۔

اچھی سی چائے پلانے کیلئے جب وہ اجازت لے رہی تھیں۔ میں نے ہاتھ تھام لیا تھا۔

''چائے تو پی لی ہے۔چائے سے زیادہ آپ کا بیٹھنا اور باتیں کرنا ضروری۔''

''بس ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔'' کا کہتے چلی گئی۔عرب علاقوں میں چائے میں دودھ ڈالنے کا رواج نہیں۔

خلیجی جنگ کیا ناگزیر تھی کیوں ہوئی آخر یہ؟

''عراق ایران جنگ نے اقتصادی طور پر عراق کو بہت متاثر کیا تھا۔صدام تیل کی قیمتوں پر مذاکرات چاہتا تھا مگر کویت تیار نہیں تھا۔سعودی عرب بات کرنے کیلئے آمادہ نہ تھا۔

کویت اوپیک OPEC کو بھی دھوکہ دے رہا تھا۔یہ بات بھی اپنی جگہ درست تھی کہ کویتی صباخاندان سے خوش بھی نہیں تھے۔

یہ بات تقریباً ہر عراقی کے ذہن میں ہے کہ کویت ہمیشہ سے عراق کا حصہ تھا۔مگر دراصل کویتی شیخوں کی دولت سے برطانیہ کے بینک کالے ہوئے پڑے ہیں۔وہ کویت کے معاملے میں بہت حساس تھا۔عراق کی جانب سے پیش کردہ سب مطالبات کویت نے ردّ کر دیئے۔

اب یہاں ایک زیرک حکمران کو سوچنے کی ضرورت تھی کہ انگشتِ شہادت کی پور جتنا کویت اور وہ ایسی سرکشی پر اترا ہوا ہے تو کچھ دال میں کالا کالا ہے۔یوں بھی صدر آئزن ہاور سے بش سینئر، جونیئر تک سبھی امریکی صدور کے خلیجی عزائم گہرے اور خطرناک رہے ہیں۔اوپر سے ماشاءاللہ متحدہ امارات کے شیخ خاندانوں کا طرزِ عمل کہ جنہیں تیل کی آمدنی نے عیاشیوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔ان کے حسابوں یار لوگوں کو دانہ دنکا ملتا رہے باقی گھر چور اُچکے لوٹ کر لے جانا چاہیں سو بسم اللہ لے جائیں۔

صدام کی طرف سے امریکی سفیر اپریل گلاس پائی کو باقاعدہ سندیسہ بھیجا،اس کے

اعزاز میں دعوت سجائی ۔دونوں بیٹھے ۔گلاس پائی ثرانٹ سفارت کار۔کمرے میں تیسرا بندہ نہ تھا۔مترجم بھی نہیں کہ خیر سے وہ خود فر فر عربی بولتی تھی۔اُس نے اطمینان سے صدام کے سارے شکوے شکایات سُنے ۔سر ہلایا اور کہا وہ سمجھتی ہے سب جانتی ہے دراصل اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ چاہتا ہے کہ دونوں فریق اپنے اپنے تنازعات خود طے کریں ۔

اذان تو مل گیا۔2اگست 1990 کو کویت اور تیل کی تنصیبات پر قبضہ ہوگیا۔ اس قبضے میں جو تباہی اور مار دھاڑ ہوئی وہ ایک الگ داستان۔ہزاروں فلسطینی ،ہزاروں ایشیائی ،یورپی ،دیگر قوموں کے لوگ خالی ہاتھ اور بے سرو سامانی میں نکلے ۔

اسی پر اکتفا نہ ہوا۔سعودی عرب کی سرحد پر 60000فوجوں کو لا کھڑا کیا۔یقیناً آپ کو بھی یہ معلوم ہوگا آپ کے وزیر اعظم میاں نواز شریف بھی اپنے اس سرپھرے مسلم برادر کو سمجھانے بغداد آئے تھے کہ وہ کویت سے فوجیں نکال لے مگر تکبر سے بھری کھوپڑی میں کوئی بات نہیں سما رہی تھی۔آپریشن ڈیزرٹ اسٹارم میں اپنے فوجی اور سول کوئی 85000 لوگوں کو مروا دیا۔اور پھر کویت سے دستبرداری کا اعلان کیا۔جنگ بندی بھی قبول کر لی۔اسی کو کہتے ہیں نا پتھر چاٹ کر مڑنا ۔اب اگر کہیں سیاسی ،ذہنی افق کی وسعت ہوتی تو صباخاندان کی غیر مقبولیت سے فائدہ اٹھایا جاتا اور فوری انتخابات کے ذریعے ایک حکومت تشکیل دے کر کویتیوں کی ہمدردی حاصل کر لی جاتی ۔

یقین جانیے انہوں نے تاسف سے لبریز لمبی سانس لی۔مہم نے کامیاب اور مغرب نے منہ دیکھتے رہ جانا تھا۔مگر ایسا کیوں ہوتا ؟اپنے ملک میں جو ڈکٹیر شپ قائم کر رکھی ہوئی تھی اُس کا کیا بنتا ؟

مجھے اپنے حکمرانوں کی حماقتیں یاد آرہی تھیں کیسے اُنہوں نے ملک اور قوم کو دولخت کیا اور ابھی بھی مُلک کا بیڑہ غرق کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔

بچے نے آ کر کچھ کہا تھا وہ اٹھ کر اندر گئے ۔میں کتابوں کے پاس جا کھڑی ہوئی ۔ میں انوکھی سی مسرت سے ہم کنار ہوئی تھی ۔ تالہ نہیں تھا ۔ الماری کے پٹ میں نے کھول لیئے ۔شیلف عربی شعرا سے بھرے ہوئے تھے ۔مجھے افسوس ہوا ۔میرے پلے کیا پڑھنا تھا ۔کاش میں نے کہیں قرآن ترجمے سے ہی پڑھا ہوتا تو شاید درد و سوز میں ڈوبی اِس شاعری کو کچھ نہ کچھ تو سمجھ لیتی ۔

مگر اتنا ضرور تھا کہ میں اِن سبھوں سے تھوڑی بہت واقف ضرور تھی ۔دوسری زبانوں کے توسط سے ہی سہی ۔پر یہ میرے لیے اجنبی نہ تھے ۔ احمد ابن حسین المتنابی Mutanabbi ،عبدلوہاب ۔سعدی یوسف ،مظفر النواب ،جمیل صدقی الزاہوی ، شام کا انقلابی شاعر اور دل کو چُھو لینے والی شاعری کا خالق نزار قبانی اور محمد العبیدی جیسے وہاں ستاروں کی طرح چمک رہے تھے ۔

افلاق بتا تا تھا ۔سعدی یوسف اور ابن الحسین المتنابی دونوں میسوپوٹیمیا کے شاعر ہیں ۔دسویں صدی کا کوفی شاعر ابن الحسین المتنابی جس کا اپنی شاعری کی طاقت اور اس کی تاثیر کے بارے میں دعوٰی تھا کہ اسے اندھے پڑھ سکتے ہیں اور بہرے سُن سکتے ہیں ۔

اور میں جب اس کی صداقت کے بارے میں پُوچھتی تھی اسمٰعیل کمرے میں داخل ہوئے تھے اور اُنکا کلام میرے ہاتھوں میں دیکھ کر بولے تھے ۔

''بہت پُر اثر کلام ہے ۔انہوں نے شاعری کی ہر صنف رومانوی ،غزل ،قطع اور مزاحیہ میں دلآویز رنگ جمائے تھے ۔

اِس قوم کی کیسے مٹی پلید ہوتی رہی ہے ۔اِس دُکھ کا اظہار اگر عام عراقیوں کے لبوں پر ہے تو ہمارے جیالے شاعروں نے بھی اپنے اور ہمارے احساسات و جذبات کو کھُل کر زبان دی ہے ۔

سعدی تو گزشتہ اور اس صدی کا جلاوطن شاعر ہے۔جلاوطنی کا کرب اپنی جگہ مگر سمجھوتہ نہیں ۔وطن کی یاد میں مظفرالنواب کیسے اپنے دکھ کا اظہار کرتا ہے؟

میری قسمت کسی پنچھی جیسی ہے
میرا دل سلطان کے محل میں گروی پڑا ہو
تو یہ کبھی گوارا نہ ہوا
پراے بغدا پرندے بھی گھروں کو لوٹتے ہیں

صدام بھلے اُس سے،سعدی یوسف اور ان جیسے اوروں کی شُعلہ بیانی اور باغیانہ شاعری سے الرجک تھا پھر بھی وہ انہیں لکھتا مانتا اور اعتراف کرتا تھا کہ وہ عراق کا قیمتی سرمایہ ہیں ۔مشاعروں میں ان کی شرکت کا متمنی رہتا تھا۔ان جلاوطن شاعروں کو پیغام بھیجتا تھا کہ آؤ عراق تمہارا منتظر ہے۔

مگر یہ اکیسویں صدی کا چنگیز جو ہمیں اُس ظالم کے چُنگل سے آزاد کروانے آیا تھا۔اُس نے جن ناپسندیدہ افراد کی عراق داخلے پر پابندی لگائی ہے اُن میں سعدی یوسف بھی ہیں۔

امریکہ اور برطانیہ تو اپنے شوق پورے کر چکے تھے اقوامِ متحدہ کی کسر باقی تھی ۔سو اُس نے اقتصادی،تجارتی ،دفاعی اور عسکری پابندیاں لگا کر ہمیں ایک سو سال پیچھے پہنچا دیا۔

امریکہ اور برطانیہ ہمارے تین لاکھ سے زائد معصوم بچوں کے قاتل ہیں۔میں نے بڑوں کی گنتی نہیں کی ۔ہاں اسپتالوں میں جانا نہ بھولیں۔

چائے کی لڑائی آ گئی تھی ۔چائے کے نام پر تو وہی کڑوا کسیلا قہوہ ہی تھا پر ساتھ میں ایک پلیٹ میں کھجوریں تھیں ۔مغز اخروٹ میں گندھی ہو ہیں ۔کیا مزے کی چیز تھی۔

''یہ بغداد کی خاص الخاص زہدی کھجور ہے جسکی پیٹ بھرائی نہرین نے گھر پر کی۔

قہوے کا کسیلا پن اور کڑواہٹ ہونٹ بھول گئے تھے۔

میرے اِس سوال پر کہ دو جنگوں اور عالمی پابندیوں کے باوجود صدام نے مُلک کو بہت سرعت سے اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا تھا۔ اس میں کس حد تک حقیقت ہے؟

انہوں نے طویل سانس کھینچ کر کہا تھا۔ "کہتے ہیں۔ بیوقوف دوست سے دانا دشمن اچھا ہوتا ہے۔ میں اِسے کریڈٹ نہیں دیتا۔ پہلے بگاڑلو پھر پھرتیوں سے سنوار لو۔ ایک اچھا لیڈر بحران سے قوم کو سلامتی سے نکالتا ہے۔ ویسے کسی حد تک یہ درست ہے۔ صدام کی شخصیت میں کچھ غیر معمولی عناصر تو تھے نا اور مغرب کو اس پر تعجب بھی تھا اور حیرت بھی۔ شاید یہ اِسی کی سزا ہے کہ اتنی پابندیوں کے باوجود انہوں نے دیکھا کہ یہ تو ابھی بھی زندہ ہے۔ اسے زمین میں گاڑ دو۔"

رخصت ہونے سے قبل میں اندر گئی کہ خاتون خانہ سے مل لوں۔ دو بیڈروم کا گھر۔ عراقی گھروں میں زمین پر بچھے قالینوں پر بیٹھنا پسند کرتے ہیں۔ بڑے سائز کے خوش رنگ قالینوں اور پھولوں نے سادے سے کمرے سجا رکھے تھے۔

باب نمبر: 18

1۔ دنیائے اسلام کا ایک مقدس ترین اور زائرین سے لبالب بھرا کربلا شہر تو خوبصورتیوں کا مرقع ہونا چاہیے تھا۔

2۔ شیعہ سُنی اتحاد کے حامی شیعہ قبائل جو ظالم اور خضائل عراقی حکومت اور امریکیوں کیلئے قابل قبول نہیں۔

3۔ صدام تاریخ میں نو بخت نصر دوم کی طرح دنیا کی عظیم ترین سلطنت کا حکمران بننے کا خواہش مند تھا۔

4۔ بابل جیسے تاریخی اور ثقافتی ورثے کو دنیا کی سپر پاور نے بڑے گھٹیا انداز میں تباہ کرنے کی پوری کوشش کی۔

تو آج کربلا کے لیے روانگی تھی۔ رات کو ہوٹل آنے پر نسرین سے پتہ چلا میں نے فکرمندی سی ہو کر اپنے آپ سے کہا تھا۔

''لوان کا تو کوچ کا پروگرام ہے اور میری بغداد کے نوسٹلجیا کی تشفی ہونے میں نہیں آرہی ہے۔ ابھی تو ڈھیر ساری چیزیں باقی ہیں۔ آج کا آدھا دن تو گل ہی ہو گیا۔ وگرنہ کافی کچھ دیکھا جا سکتا تھا۔''

افلاق پر بھی تھوڑا سا غصہ آیا۔ صبر بھی نہ ہو سکا۔ اسی وقت موبائل بجا دیا۔ بڑے سے بچے کا لہجہ سکون بھرا تھا۔

''جانے کا پروگرام ان کے ساتھ رکھیے۔ زیارات اور شہر کو دیکھیے۔ پھر مجھے فون کر دیجیے۔''

اُس نے میرے لہجے میں کچھ چھپے، کچھ کُھلے تفکرات محسوس کرلیے تھے۔

’’آپ اطمینان سے سوجایئے اب۔ان کے ساتھ جو کچھ دیکھ سکتی ہیں اُسے دیکھیے۔باقی میں ہوں نا۔‘‘چلو تسلی ہوگئی۔

باتھ روم میں پانی نہیں تھا۔ترقی یافتہ ملکوں میں اپنے وطن کے ساتھ موازنوں کی صورت جو آہیں کلیجے سے نکلتی ہیں اُن میں یاس کی گھلاوٹ زیادہ ہوتی ہے۔عراق جیسے جنگ اور دہشت گردی کے مارے ملک میں مماثلت کے رنگوں میں کوفت، دُکھ اور چبھن جیسی کیفیات کا تاثر زیادہ نمایاں ہوکر اذیت کا باعث بن رہا تھا۔

موڈ تو سویرے سویرے ہی برہم ہوگیا تھا۔کچھ نکالنے کیلئے پرس کھولا تو پچیس ہزار دینار کا نوٹ غائب۔اب پورے پرس کی شامت آگئی تھی۔پر وہاں ہوتا تو ملتا۔سوفیصد شک کا گمان ساتھ والی پر تھا۔مگر گھر اور باہر ایسے معاملات میں تماشے کرنے سے مجھے ہمیشہ چڑ سی رہی ہے۔اپنی مرحومہ ماں کی اِس بات سے مجھے سوفیصد اتفاق رہا ہے کہ کھیسہ اپنا سانجھو۔تے چور کسے نوں نہ آکھو۔(یعنی اپنی جیب کی حفاظت کرو اور چور کسی کو نہ کہو)

پھر میری پھٹکار کا نزلہ خود میرے اپنے اوپر گرا۔’’کیا تھا جو خود اپنے ہاتھ سے دے کر نیکی کما لیتی۔پر وہ تیرے مقدر میں ہوتی تب نا۔‘‘

بس تو ہونٹوں کو سیئے رکھا کہ جب رات کو گھوڑے بیچ کر سونا ہے تو سرہانے رکھے پرس میں کوئی بھی آسانی سے ہاتھ ڈال کر کچھ بھی نکال سکتا ہے۔چلو دفع کرو۔

بغداد سے کربلا،کوفہ اور نجف اشرف کے شہر دراصل میسوپوٹیمیا کے علاقے ہیں۔دجلہ وفرات سے مستفیذ ہونے اور اِن کی زرخیزی سے بھرپور فائدہ اٹھانے والے۔

صبح تھی تو کیا سورج حسبِ معمول قہر آلود تھا۔گاڑی کے شیشوں سے پردہ ہٹا کر چہرہ شناسی کرتی تو ویرانیوں کے جھکڑ نظر آتے۔ذرا بغداد سے نکلے تو شارع الغط کا بڑا سا

بورڈ دیکھا۔سڑک بن رہی تھی ۔ساتھ ہی خوبصورت فلیٹوں کا سلسلہ تھا پر اردگرد گند بکھرا پڑا تھا۔راستے میں جا بجا چیک پوسٹیں ،ریت کی بوریوں سے بنی مدافعتی دیواریں، کچے پکے گھروں پر مشتمل بستیاں اور چوراہوں پر لگے بورڈوں پر ان کے نام درج تھے۔چند دکانوں پر مشتمل بازار، گرما، تربوزوں کے ڈھیر سجائے اور بیچتے نوعمر لڑکے اور کہیں کھیتوں کے پھیلے سلسلے آپ کی توجہ کو کھینچے چلے جاتے تھے۔

ایک تو جگہ جگہ چیک پوسٹوں کا سیاپا۔گاڑی رک جاتی ۔پولیس کا پورا جتھا چیکنگ کے جدید ترین آلات کے ساتھ اندر آتا۔پہلا مرحلہ تو گھورگھور کر دیکھنے کا ہوتا یوں جیسے القاعدہ کے لوگ ہوں۔

صحرا کا نخلستان دیکھنے کا بھی اپنا مزا ہے۔بلدیہ مصیب کا جب دیدار کرتے تھے کوئی عقب سے حضرت عون کے مزار کی بات کرتا تھا۔

مدینہ کربلا سے خارجیوں کیلئے راستے بنائے گئے تھے۔ان دو رویہ راستوں کی تنگی نظر پر گراں گزرتی تھی۔اطراف کوڑے کباڑ سے لدے پھندے ہوئے تھے۔اب جا بجا افسوس اور دُکھ کی آہوں سے فضاؤں کو غم آلود کرنے کا فائدہ؟

بلدیہ کربلا میں بسوں کا اڈہ کیسی کسمپرسی کی تصویر دکھتا تھا۔کھجوروں کے جھنڈوں کی کہیں کہیں چھدری چھاؤں میں کھڑے سوزوکیوں کیلئے بھاؤ تاؤ ہوتے دیکھتے حشر ہوگیا تھا۔سوزوکیوں میں بیٹھ جاؤ،اُتر جاؤ والا معاملہ من وعین وہی بغداد والی صورت ۔ریڑھیوں میں سامان کی لدلدائی اور ''چلو پیدل مارچ کرو۔''

اب تیل نکلنے والی بات تھی نا۔

دھوپ کربلا کی گلیوں میں اتری ہوئی تھی۔ویرانی کا گھمبیر سا تاثر ہر شے پر بکھرا ہوا نظر آیا تھا۔مکانوں کی خستگی اور کہنگی بھی بڑی نمایاں تھی۔

برقی تاروں کے بے ہنگم پھیلاؤ سے بھی کوفت ہورہی تھی۔درختوں کی شجر کاری ضرور تھی مگر کثرت کہیں نہ تھی۔یہ شہر پوری دنیائے اسلام کیلئے مقدس ترین جسکی زیارت کیلئے آنے والوں کاایک نہ ختم ہونے والا تانتا۔اسے تو خوبصورتیوں کا مرقع بنانا چاہیے تھا۔اسکے ویرانوں کو نخلستانوں میں بدل دینا چاہیے تھا۔تیل کے ذخائر سے مالا مال ملک اورزائرین سے بھی لبالب بھرا ہوا۔

ہم ایک طویل بازار سے گزر رہے تھے۔دو رویہ عمارات سے گھرا ہوا کشادہ سڑک والا بازار جوٹرن لیتے ہوئے سیدھا مزار مقدس تک جاتا تھا۔بازار،اس میں بنی دو منزلہ،ایک منزلہ،سہ منزلہ عمارتیں اور گاڑیوں کی کثرت تھوڑی سی خوشی دیتی تھیں کہ ان کا حال احوال بہتر نظر آتا تھا۔

ہوٹل فندق الجنائن قلب روضہ عالی امام میں گھسا ہوا تھا۔دو چھلانگیں مارو اور مرکزی گیٹ پر پہنچ جاؤ۔میں نے بھونچکی سی ہو کر وسیع وعریض ریسپشن روم کی دیواروں پر عظیم المرتبت حضرت امام حسینؓ کی وجیہہ صورت تصویروں کو دیکھا تھا۔حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے جلوے بھی وہاں بکھرے ہوئے تھے۔تصورات نے جھٹکا کھایا تھا۔اب اس پر بھی شکر گزاری ہوئی کہ کہیں اُس عظیم ہستی کا پیکر نہیں تراش لیا وگرنہ تو ہم جیسے مارے جاتے۔اب تو اپنی مرضی ہے جیسی مرضی تراش لیں۔

کمرے اچھے تھے۔ شکر تھا کہ لوگ چار تھے اور اے سی آن تھے ۔ جی چاہتا تھا لیٹوں اور سو جاؤں۔مگر میں سو نہیں سکتی تھی۔مجھے مائع کی شکل میں ہر طور تین چار گلاس اپنے اندر انڈیلنے تھے۔ سو اٹھی اور باہر نکلی۔ہوٹل کی عقبی گلی سے ایک اور بازار میں داخل ہوئی۔حلب لیا بوتل لی واپس آئی تو ہوٹل کے مالک آغا یاس علی سے ہیلو ہائے کی۔پاس بیٹھی اور پوچھا۔

''آغا آپ کیا سوچتے ہیں؟''

''میری تو دلی تمنا ہے کہ امریکہ یہاں جم کر بیٹھ جائے۔میرا تو کاروبار ٹھپ ہوا پڑا تھا۔ایرانی زائرین پر پابندیاں تھیں۔گرما میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے۔اب دیکھو کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔مجال ہے جو میرے تین ہوٹلوں میں سے کسی ایک میں چھوٹا موٹا سا کمرہ بھی دستیاب ہو۔ہاؤس فل۔

میرا اندر پانی کی کمی سے تڑخ رہا تھا۔آغا کی ان جی جلانے والی باتوں پر مزید تڑخنے لگا۔

فوری اٹھنے میں سلامتی درکار تھی۔کوریڈور میں چلتے ہوئے سست سی چال کے ساتھ ساتھ چہرے پر بھی جھلاہٹ تھی اور لہجے میں بھی۔

''ارے یہ آغا کمبخت تو من وعن میرے مرحوم ابا جیسا ہے جنہیں آزادی تو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔رہ رہ کر وہ کمبخت مارے گورے یاد آتے رہتے۔

''بڑا امن تھا اُن زمانوں میں۔ارے اکیلی عورت چاہے بیس تولے سونا پہن کر کلکتے سے پشاور جاتی۔مجال ہے جو اُسے کوئی ڈرڈ کر ہوتا۔میاں جی کا کاروبار کتنا بڑھا ہوا تھا؟ گھر میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی تھیں۔''

میں تو سر پکڑ کر بیٹھ جاتی تھی۔شکر تھا کہ انہوں نے یہ آج والا زمانہ نہ دیکھا۔پہلے ہی چل بسے۔

دودھ اور سوڈے نے جلتے بلتے کلیجے کو ٹھنڈا کر کے رکھ دیا۔

اُٹھی تو تازہ دم تھی۔کربلا کی شام خوبصورت تھی۔سنہری کرنیں اگر چہار سو سونا بکھیرتی تھیں تو میرے بلند مرتبت عالی امام کے روضہ مبارک کا گنبد بھی نگاہوں کو خیرہ کرتا تھا۔روضہ مبارک کے اندر شیشے کی جھلملاہٹوں، روشنیوں اور زیبائشی کام کی کوئی انت نہ تھی۔

نقاشی اور مینا کاری میں رنگوں کا امتزاج نگاہوں کو کھینچے لیے جاتا تھا۔

ہم نے بھی عقیدتوں اور محبتوں کو کیسے زرو جواہر میں لپیٹ لیا ہے۔

یہاں آہ وزاریاں تھیں۔سسکیاں تھیں۔خاموش آنسوؤں کے ساتھ چاہتوں اور محبتوں کے نذرانے تھے۔

جالیوں تک میری کہاں رسائی تھی؟ کیسے جگہ بنائی نہیں جانتی۔کسی انجانے ہاتھ نے جیسے پکڑ کر تھام لیا۔

علی اصغر اور علی اکبر بھی وہیں آرام فرماتے ہیں۔

تو یہاں صدیوں پہلے صحرا تھا۔جس نے میرے عرب کے راج دلارے کا خون پیا اور سیراب ہوئی اور رہتی دنیا تک اِسے ظلم و جبر کے خلاف ڈٹ جانے کی کہانی سناتے رہنا ہے۔محبتوں کے نذرانے پیش کیے۔مغرب ادا کی اور حضرت عباس کے روضہ مبارک کی طرف چلی۔

روضہ مبارک سے پہلے بڑا وسیع و عریض میدان تھا۔خوش رنگ قالینوں پر عورتوں،مردوں بچوں کے جمگھٹے موجیں مارتے تھے۔پیڈسٹل پنکھے چلتے تھے اور ایک بھریا میلے کا ساسماں تھا جو طبیعت کو شگفتگی دیتا تھا۔

خواتین کے ایک گروپ کے پاس بیٹھ گئی۔زبان کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا تھا۔تاہم پتہ چلا کہ ترکمانی فیملی تھی۔

میری آنکھوں میں یقیناً ناواقفیت کے رنگ ہوں گے۔قریب بیٹھے مرد نے فوراً توجہ کی تھی۔

عراق میں سُنی تقریباً تیں فیصد،شیعہ ساٹھ،کرد پانچ سے سات فیصد،ترکمانی 2 سے تین اور بقیہ اقلیتیں جن میں عیسائی،یہودی،آرمینین،یزیدی اور اشوری ہیں۔ترکمانی

لوگ سُنی عقیدے کے حامل زیادہ اربل Arbil اور کرکوک Kirkuk میں رہتے ہیں۔ ترکمانی بولتے ہیں جوٹرکش زبان کی ہی ایک شکل ہے۔

جنگ کے بارے میں میرے سوال پر مردنے امریکہ کیلئے جس نفرت کا اظہار کیا اس سے کہیں زیادہ صدام کیلئے تھا۔اور تو اپنی قومیتوں کیلئے بھی اُس کی گوہر افشانیاں مزے کی تھیں۔

''یہ جو کُرد ہیں ناسچی بات ہے ان کا تو نہ دین، نہ ایمان۔کبھی کسی کے پیچھے بھاگتے ہیں کبھی کسی کے۔خودمختاری اور آزاد علاقہ کردستان انہیں پھر بھی نہیں ملے گا۔چاہے اسرائیل کے تلوے چاٹیں، چاہے امریکہ کی مٹھی چاپیاں کریں۔اور یہ سُنی نوے فیصد اینٹی امریکن، شیعہ 50% پچاس فیصد پرو امریکی اور پچاس فیصد اینٹی امریکی۔

نتیجتاً پورے ملک کی باگ دوڑ سنبھال کر بیٹھ گئے ہیں اور سُنیوں کا بیج مار رہے ہیں۔50% پچاس فیصد شیعوں نے پہلے امریکیوں کو رگڑا لگایا۔پھر امریکیوں کو سمجھ آ گئی۔اب دونوں کولڑوا کر ایک دوسرے کا بیج مار رہے ہیں۔کرکوک پر اتنی شدید بمباری ہوتی تھی کہ دیہاتوں کے دیہات تباہ ہو گئے۔موت گلیوں میں ناچتی تھی اور بچوں بوڑھوں سے ہسپتال بھر گئے تھے۔

یہ تو ظالم ہیں ہی۔اندر خانے جانے ہم سے کن صدیوں کے بدلے لے رہے ہیں۔مگر یہ نام کے مسلمان، ہمارے ہمسائے، ہمارے ماں جائے حکمران کیسے خودغرض اور اپنے مفادات کے حصاروں میں گھرے ہوئے ہیں۔اردن کو دیکھیں۔ان بڑے فریبیوں کا چیلا چانٹا ہمیں مارنے کیلئے اُنکا سامان بھی اپنے راستوں سے بھیجتا تھا اور ہمیں زندہ رکھنے کیلئے اپنے کاروباری طبقے سے خوردونوش اور دیگر اشیاء کی تجارت بھی کروا رہا تھا گویا پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔

قریب بیٹھی ایک دوسری فیملی بھی ہماری باتیں سُنتی تھی۔ بڑی نازک اور خوبصورت سی خواتین تھیں جن کے گورے چٹے خوبصورت بچے انگلش میڈیم سکولوں میں پڑھتے اور انگریزی سمجھتے اور تھوڑی تھوڑی بول بھی سکتے تھے۔

یہ بچے افنان، محمد علی اور فریال تھے۔ ساری فیملی انڈین فلموں کی عاشق۔ ہند کو پسند کرنے والی، ایشوریا رائے، امتیابھ بچن، شاہ رخ خان، سلمان اور عامر خان کی دیوانی۔

بچوں نے ان کے بارے میں سوال کر کر کے پاگل کر دیا تھا۔ میں بھی اس پیاس کو بجھانے میں ناکام تھی کہ میری ہندی فنکاروں سے کون سی عصری معلوماتی رفاقت تھی۔ وحید مراد، صبیحہ، شمیم آراء یا سنتوش کمار کی بات ہوتی تو یقیناً شرابور کر دیتی۔

پر ان ہندوالوں پر غصہ آرہا تھا۔ کمبخت ماروں نے کیا یورپ، کیا مشرق وسطی، کیا وسطی ایشیا سب جگہوں پر اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑ رکھے ہیں۔ استنبول کے بازاروں میں اِن کے ناموں کی پکاریں ہیں۔ مصر کی دور افتادہ جگہوں پر ریڑھیوں اور تانگے بان ان کے عاشق صادق۔ ایشوریہ رائے کے ذکر پر تو چہرے ٹہنیوں پر لگے گلابوں کی طرح کھل اٹھتے ہیں۔ کہیں سمرقند، بخارا میں ان کے کارناموں کی دھومیں ہیں اور جنوب مشرقی ایشیا کے شہر تو خیر تو ان کی مٹھی میں ہیں ہی۔

ہماری بشریٰ انصاری، شہناز شیخ اور مرینہ خان کے بھی بہتیرے عاشق پیدا ہو جاتے اگر ہمارے سفارت خانے کچھ ہل جل کرنے والے ہوتے، پر انہیں اپنے پیٹوں کے کنوئیں بھرنے سے فرصت ملے تو کچھ ملک وقوم کا سوچیں۔

اب اٹھی کہ چل کر حضرت عباس علمدار کو سلام کر آؤں۔ چار آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر آؤں۔ مرکزی گیٹ پر ہی گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ عقیدت مند آگے بڑھنے کی کوشش میں ایک دوسرے کا ملیدہ کرنے میں دل و جان سے مصروف تھے۔ بس یوں لگا جیسے

ایک قدم آگے بڑھا تو حُسن کی پریوں اور جنی مُیاروں کے پاؤں میں قیمہ بن جاؤں گی۔

''نہ بھئی نہ۔واپس پلٹی تھی۔رات گہری ہوگی تو دیکھوں گی۔''

ہوٹل کے ریسپشن پر کافی لوگ تھے۔سوچا ذرا بات تو کروں۔جنگ کے حوالے سے پوچھا۔

''جنگ بڑھکوں سے نہیں جیتی جاتی۔دشمن بھی وہ جس کی جنگی ٹیکنالوجی کا زمانہ معترف۔اس زون کا انچارج صدام کا بیٹا قصے حسین تھا۔لفٹیننٹ جنرل رعد علی ہمدانی کربلا ریجن کو کمانڈ کر رہا تھا۔دونوں میں ٹھن گئی تھی۔قصے حسین یہاں سے فوجیں شمال کی جانب بھجوانا چاہتا تھا جبکہ ہمدانی کے خیال میں ایسا کرنا غلطی تھی۔امریکی فوجیوں نے کشتیوں میں فرات کو عبور کیا اور ہمارے سروں پر آموجود ہوئے۔''

''آپ کی ہمدردیاں کن کے ساتھ تھیں؟''میں نے پوچھا تھا۔

''پکی پکی حملہ آوروں کے ساتھ۔''

مجمع میں سے اکثریت کی آوازیں تھیں۔سچی بات ہے ایسی صاف گوئی پر ہنسی چھوٹ گئی۔

''کمبخت ڈکٹیٹر تھا۔بدترین ظالم تھا۔سفاک تھا۔انسانی جذبات سے عاری شخص تھا۔ہمیں ماتم کرنے کی اجازت نہیں تھی۔عزاداریوں کی محفلیں نہیں سجتی تھیں۔سوز خوانی نہیں ہوتی تھی۔ماتمی جلوس نہیں نکل سکتے تھے۔ہمارے کاروبار پر جھاڑو پھیرا ہوا تھا۔وہ ہمارے عقیدے کا دشمن تھا۔اُس نے ہم پر جانے کب تک مسلّط رہنا تھا؟''

بارہ تیرہ کے مجمع میں سے صرف دو آوازیں تھیں جن میں ایک جس نے اُسے سراہتے ہوئے کہا تھا۔

''تو اب دیکھ رہے ہو نا اِن انتہاپسند دہشت گردٹولوں کی کرتوتیں۔کیسے

انہوں نے ہمارے شکنجے کس دیئے ہیں کہ باہر نکلو تو واپسی کا پتہ نہیں ہوتا۔ اُس نے کم از کم اِن سبھوں کو نتھ تو ڈال رکھی تھی۔''

''کڑوا سچ تو یہ ہے کہ شیعہ سُنیوں کی پرانی دشمنیاں اور عداوتیں بھی ایک طرف، عربوں اور کردوں کے درمیان دبے ہوئے نسلی فسادات بھی پوری شدت سے جاگ گئے ہیں۔ تیل کے وسیع ذخائر سے مالا مال شمالی کرد علاقوں اور کم وسائل کے حامل مرکز کے درمیان علاقائی اور معاشی کھینچا تانی بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ چلو وہ ظالم تھا پر تب امن تو تھا۔ ڈنڈے کے زور پر دبے ہوئے تھے۔''

دوسرے نے جوشیلی آواز میں کہا تھا۔

''دنیا کا سب سے بڑا اگر کوئی لعنتی ہے تو وہ یہ کمبخت امریکہ ہے۔ یہ اُسنے ہمیں صدام سے نجات نہیں دلوائی۔ اُس نے ہماری نسلوں کا بیڑہ غرق کیا۔ بدترین اقتصادی پابندیوں کا شکار کیا۔ کیا اُس کا شکار صدام یا اس کی آل اولاد ہوئی نہیں۔ ہم غریب لوگ اور ہمارے بچے دوائیں نہ ملنے کے سبب مرے اور اپاہج ہوئے۔''

1988 میں ایران نواز کُردوں کے دیہاتوں پر جس طرح زہریلی گیس کی بارش کی گئی اُس کے پیچھے کس کی بلا شیری تھی۔ 1990 اور 1991 میں شیعاؤں کو کچلا گیا۔ ایسا کرنے میں کس کی شہہ تھی؟

ایران عراق جنگ کے پس منظر میں بھی امریکہ اسرائیل عزائم تھے۔ مینا حم بیگن کا بیان تو ابھی بھی ریکارڈ پر ہے۔

''ہم خوش ہیں دو مسلمان ملک ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ ان کی کمزوری ہماری مظبوطی ہے۔'' سچی بات ہے دونوں ملکوں کے سربراہوں کو ڈوب مرنا چاہیے تھا۔ گالیوں کی ایک بوچھاڑ برسی۔ بش، ٹونی بلیئر، رمزفیلڈ، کولن پاول، کونڈولیزا رائس سب کو

انہیں نہلایا۔خود تو اپنی محفوظ کچھاروں میں بیٹھے ہیں اور ہمیں جہنم میں سڑنے چھوڑ دیا۔
موجودہ حکومت کیا ایک نمائندہ حکومت ہے؟ کیا یہ جمہوری ہے؟ ایک کٹھ پتلی حکومت اور وہ بے غیرت اپنی کارپوریشنوں کا پیٹ بھر رہا ہے۔''

تبھی بڑے سے طباق میں تلوں سے سجا شہد بھرے کوٹ سے دمکتا جلیبی جیسے بلوں میں الجھا گرم گرم سمون خوشبوئیں اڑاتا کمرے میں آ کر تپائی پر سج گیا تھا۔

اور وہ سب جو مجھ سے باتوں میں اُلجھے ہوئے تھے ندیدوں کی طرح اس پر لپکے اور اس کی تکہ بوٹیاں شروع ہو گئیں۔میں نے تو کھسکنے میں ہی عافیت جانی۔

اور جب میں اپنے کمرے کی طرف آتی تھی۔میرا راستہ ایک اُدھیڑ عمر کے مرد نے روکا جس نے بڑی شستہ اردو میں مجھے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ وہ پاکستانی ہے اور عرصہ دراز سے نجف اشرف اور کربلا میں رہ رہا ہے۔مسلکی اعتبار سے وہ خود بھی شیعہ ہے مگر وہ سمجھتا ہے کہ عراق کی بقا شیعہ سُنی اتحاد میں ہے۔عراق کی موجودہ حکومت اور یہ سب ٹولے ایران نواز ہونے کے ناطے اس کے حق میں نہیں۔کوئی چھ ماہ پہلے کوفہ کے جس زائرن گروپ پر عراقی فوج اور امریکی ہیلی کاپٹروں نے حملہ کیا تھا وہ حواطم اور خضائل قبائل کے لوگ تھے جو شیعہ ہونے کے باوجود مقتدی الصدر کی مہدی ملیشیا کو ناپسند کرتے ہیں ان کے ہاتھوں کئی بار زک اٹھا چکے ہیں۔جنوبی عراق کے عرب شیعہ بھی شیعہ سُنی اتحاد کے قائل اور ایران نژاد آیت اللہ سیستانی سے اختلاف رکھتے ہیں۔اِن گروپوں کی آپس میں نہ صرف اتفاق رائے ہے بلکہ یہ سُنی شیعہ اتحاد کے بھی بڑے داعی ہیں اور یہی بات عراقی حکومت اور امریکیوں کیلئے قابل قبول نہیں۔

بڑی لمبی آہ بھرتے ہوئے میں کمرے میں داخل ہوئی تھی۔اب بھلا مجھے نزار قبانی کیوں یاد نہ آتا۔

''دشمن تو چیونٹی کی طرح ہماری کمزوریوں کے راستے آیا ہے۔''

رات گیارہ بجے حاضری کیلئے باہر آئی تو نظارے حرم کعبہ جیسے ہی تھے۔ برقی روشنیوں کی تندی و تیزی ایسی بلا کی کہ رات پر دن کا گمان گزرے۔ عشاق کے پُرے۔ دوکانوں پر خریداریاں۔ آپ عالی مقام امام حسین کے بھائی اور علم بردار کربلا میں صرف سقہ گیری کرنے پر مامور تھے۔ فرات سے کن مصیبتوں اور جتنوں سے پانی لائے مگر آپ عالی وقار کے خیمے تک پہنچ ہی نہ پائے اور شہادت نوش فرمائی۔

واپس آتے ہوئے میں نے خود سے کہا تھا۔

''پرانے کربلا کو دیکھنے میں بھلا وقت کتنا لگے گا؟ یہی کوئی دو تین گھنٹے۔ بقیہ وقت کا کیا مصرف ہوگا؟ پرانا شہر روضہ مبارک کے اردگرد ہی پھیلا ہوا ہے۔ صبح افلاق کو پہنچنے کا کہنا ہے۔ کل کا دن ضائع نہیں ہونا چاہیے۔''

ناشتہ حسب معمول غریبڑہ سا تھا۔ تین چار عورتیں پراٹھے پکانے میں ہلکان ہوگئی تھیں۔ رات کا سالن تھا اور چائے۔ چلو شکر نو بجے اٹھ کر بغیر کہیں جائے یہ نیم ٹھنڈا نیم گرم نصیب ہو گیا تھا۔

اپنے آپ کو حسب معمول عراقی عورت کے قالب میں ڈھالا اور پرانا شہر دیکھنے نکلی۔ ناشتے کے بعد نکلنے سے پہلے افلاق کو فون کرتے ہوئے پہنچنے کا کہہ دیا تھا۔

چار پانچ فٹ چوڑی گلیوں میں چلتے اور انہی گلیوں میں کہیں کہیں بنی ہٹیاں (دوکانیں) جنکی خستگی کو دیکھتے ہوئے میرا جی دھپ سے وہاں بیٹھ جانے اور بین ڈالنے کو چاہتا تھا۔

کیا اُس نے کبھی اِن گلی کوچوں کو نہیں دیکھا تھا؟ وہ جس کے محل کی وسعتوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ دنیا کا دوسرا بڑا تیل پیدا کرنے والا ملک اور غربت کی پسماندگی اِس درجہ پہنچی

ہوئی۔اِن میں چلتی، کہیں کھلے دروازوں سے تنگ و تاریک ڈیوڑھیوں میں جھانکتی، کہیں دروازوں پر ٹنگے ملگجے پھٹے پردوں پر نظریں ڈالتی، خوبصورت چہروں والے بچوں کو چلتے پھرتے دیکھتی چند گھروں میں گھسی بھی۔وہی غربت کے دہلانے والے منظر۔ایک کمرہ، کہیں صحن کے نام پر بہتان، ہوا اور روشنی کی گزرگاہ سے محروم۔ان میں بسنے والی عورتیں جن کے پیلے پھٹک مدقوق چہروں کے نیچے غالباً خون کی کوئی رگ ورید نہیں تھی۔زبان کا مسئلہ ہر جگہ آڑے آنے کے باوجود کچھ بھی تو سمجھنا مشکل نہ تھا۔چیزیں تو عیاں تھیں۔

''پروردگار اس مسکین و یتیم ملت اسلامیہ کو کب کوئی دیدہ ور نصیب ہوگا؟ کب اِن دروازوں پر علم کی روشنی دستک دے گی اور کب گلیوں میں پھرتے ان مفلوک الحال بچوں میں ویسی علم دوست شخصیتیں پیدا ہوں گی جنہوں نے اس ناکارہ سی قوم کو ایک شاندار ماضی ورثے میں دے کر دوبارہ ان کے ہاں جنم لینے سے منہ پھیر لیا ہے۔''

تین گھنٹے کی جُل خواری کے بعد جب واپس آئی۔جی چائے پینے کو چاہ رہا تھا۔مگر چائے نہیں قہوہ تھا۔میں نے بیگ سے اپنا گلاس نکالا۔قہوہ اُس میں ڈلوایا اور ہوٹل آگئی۔ریسپشن روم اس وقت خالی تھا۔صوفے پر بیٹھ کر گھونٹ بھرا اور سامنے چلتے ٹی وی کو دیکھا۔

ہائے آگ دھوئیں اور جلتی گاڑیوں کے شعلوں میں بعقوبہ میں بم پھٹنے کی خبر تھی۔ہلاکتوں کے سین تھے۔کٹی پھٹی لاشوں کے ڈھیر تھے۔آہیں اور بین تھے۔گالوں پر زار زار بہتے آنسو تھے اور دماغ میں کشور ناہید تھی۔

وہ جب چاہیں ہمیں اپنی غلامی میں سمیٹیں
وہ جب چاہیں ہمیں انکار کی دہلیز پر لا کر کہیں

بس اِس قدر رہی ساتھ ممکن تھا
وہ جب چاہیں ہمارے ملک پہ
یلغار کر ڈالیں
ہمیں نابود کر ڈالیں
ہزاروں اور کروڑوں لوگ
ایسی ناروا اور وحشیانہ
خون کی بارش پہ ماتم گیر ہیں
تو بھی انہیں کیا
تمہیں معلوم ہے کمزوروں میں
کِس قدر بھی جوش میں آ ہیں
مقدر میں تو پھر وہ کربلا ہے
تمہیں معلوم ہے تم کربلا میں ہو
ہمیں معلوم ہے ہم کربلا میں ہیں

آنسو پونچھتی، ناک صاف کرتی اُٹھ کر کمرے میں آ گئی۔ لیٹی تو آنکھ لگ گئی۔ نسرین نے کوئی دو بجے اٹھایا۔ وہ میرا اور اپنا کھانا لے آئی تھی۔ گروپ کے کسی صاحب کی نیاز کا مزیدار کھانا۔

افلاق کی کال تھی وہ ڈھائی بجے تک کربلا پہنچ رہا تھا۔

اُس دلبر سے لڑکے کو دیکھتے ہی میری آنکھوں میں ممتا کے چراغ جلے۔ میں نے اُس کے سینے پر بوسہ دیا۔ میرے اندر نے حوصلہ پکڑا۔ دلیر ہوا۔ ہوٹل میں جتنے لوگوں سے بابل جانے کی بات کی تھی سبھی نے کہا تھا ''رسک ہے۔''

اوپر تپتا سورج تھااور نیچے چھتری تانے میں۔ بہت سے جھٹکوں کی زد میں تھی ۔فرات کو جیتے جی دیکھنا کیا کسی خواب سے کم تھا؟ بہت دیر اُسے دیکھتی رہی۔ آنکھوں میں بسی ازلی پیاس کو بجھاتی رہی ۔تا حد نظر پھیلے سر سبز کھیتوں، کھجور کے باغوں، درختوں، دور تک بکھرے گندم سے خالی کھیتوں کے رڑے میدانوں اور صحرائی وسعتوں کو تکتی رہی۔

یہی وہ فرات ہے اور یہیں کا وہ کلدانی شہنشاہ نوبخد نضر Nebuchadnczzar جس نے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجائی اور یہودیوں کو ریوڑوں کی طرح ہانکتا ہوا یہاں لے آیا تھا۔اسی فرات کے کنارے بخد نضر نے انہیں آباد کیا۔اسی بستی کا نام انہوں نے تل ابیب رکھا اور یہیں وہ توریت کو یاد کر کے روتے اور آہیں بھرتے تھے۔اور یہی وہ بخد نضر تھا جو معلق باغات کیلئے مشہور رہا۔

گاڑی میں دوبارہ بیٹھی ۔افلاق بتاتا تھا بابل Babylon بغداد کے جنوب میں کوئی نوے اور کربلا سے پینتیس کلومیٹر پر ہے۔یہ مشہور ہلا Hilla شہر سے کوئی دس کوس پر ہے۔

اورجب بابل کے عشطر Ishtar گیٹ کے سامنے گاڑی رکی۔ میں نے قدم باہر رکھا اور ملگجے آسمان اور زمین کی وسعتوں کو دیکھتے ہوئے خود سے کہا تھا۔

''اف دُنیا کی قدیم ترین تاریخ کا یہ شہر تہذیب وتمدّن کا گہوارہ، دنیا کو فکر وشعور کی آگہی دینے والا۔

تو میں یہاں ہوں ۔اور وہ وقت میرے خیالوں میں دوڑا چلا آیا تھا جب میں بابل کو پڑھتی تھی ۔اس کے معلق باغوں کے بارے سوچتی تھی پر کیا کبھی سوچا بھی تھا کہ تاریخ سے لبالب بھری اس دھرتی پر کبھی پاؤں بھی دھروں گی۔اِسے اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے دیکھوں گی۔

شکریے کےتو لفظ ہی پاس نہیں تھے۔

میرا اور اس کا تعلق بڑا ہی محبوبانہ قسم کا ہے۔نم آنکھیں پیار و محبت کی لو میں دمکتی اُسے لامحدود وسعتوں میں بیٹھے دیکھتی تھیں۔

افلاق گاڑی پارک کرنے گیا ہوا تھا۔واپس آیا۔میری بھیگی آنکھیں اور رروندھے گلے کو محسوس کرتے ہوئے اُس نے قدرے حیرت سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔میں ہنس پڑی۔

''جذباتی عورت ہوں۔آنسو تو پلکوں پر دھرے رہتے ہیں۔''

گیٹ کے داہنے ہاتھ درختوں کی چھاؤں میں بیٹھے گارڈ نے جلدی جلدی کا سگنل دیا اور جب میں سڑک پر چلتی تھی مجھے وہ پینٹنگ یاد آئی تھی جو میں نے سیدون سٹریٹ کی ڈیوٹی فری شاپس میں دیکھی تھی۔گھوڑوں سے جتی رتھوں میں بیٹھے بادشاہ اور خوبصورت پہناووں میں لپٹی عورتیں جن کے بالوں میں جڑی ماتھا پٹیاں اور پھیلے ہاتھ اور فوجوں کی قطاریں جو عشطر گیٹ سے اندر داخل ہوتی تھیں۔

تب گیٹ تک جانے والی سڑک پر چلتے ہوئے میں نے سوچا تھا بس تو چند لمحوں بعد میں اس بلندو بالا محرابی دروازے سے جسکی دیواریں نیلے پیلے رنگوں کے جانوروں سے بھری پڑی ہیں۔پرانی تاریخ کے ایک لیجنڈری شہر میں داخل ہونے والی ہوں۔یہ گزرگاہ اور ان دیواروں پر یہ جانور بنوکدنضر کی یادگار ہیں۔ اس کی فصیلیں اور معلق باغ بھی دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتے تھے اور یہی وہ سرزمین ہے جس کا ذکر قدیم عہد نامہ عتیق میں ملتا ہے۔اور یہی وہ زمین ہے جس نے حمورابی جیسے بادشاہ کا زمانہ دیکھا جس نے دنیا کو تحریر دی،ایجادات اور تہذیب وتمدن دیا۔

مرکزی دروازہ صدیوں پرانی والی جگہ پر اُسی نام سے وابستہ ہے۔اصلی تو جرمنی

والے لے گئے ہیں ۔برلن کے پرگامن Pergamon میوزیم میں ہے ۔یہ یورپی قومیں بھی بڑی لٹیری اور لالچی ہیں ۔انہیں تو چیزیں لوٹنے کے ہاڑے پڑے رہتے ہیں ۔

بیبلون کے گرداگرد پرانی حفاظتی دیوار 16 میل لمبی اور 8 میل چوڑی تھی ۔نئی تعمیر شدہ بھی کچھ ویسی ہی مضبوطی لیے ہوئے ہے ۔

عشطر گیٹ تو بے چارہ زخمی زخمی سا تھا ۔چند جگہوں پر ڈریگونوں کی شبیہیں عجیب بے ڈھنگے سے تاثر اور ادھورے پن کی عکاس تھیں ۔جیسے کسی نے زور زبردستی سے بے چاروں کو ریپ کرنے کی کوشش کی ہو ۔پتہ چلا تھا کہ ماشاءاللہ سے یہ دنیا کی مہذب ترین قوم کی فوج کا کارنامہ ہے کہ دیواروں سے اُن قدیم ترین اینٹوں کو اکھاڑ لیا جن سے یہ تصویریں صورت پاتی تھیں ۔واہ کیا کہنے ہیں اُس سپر پاور کے ۔

خیر سے یہ جنگ کے دنوں کا بیس کیمپ بھی تھا ۔ہیلی پیڈ بنانے کیلئے زمین کو ہموار کرتے ہوئے ہر اُس چیز کی شکل بگاڑ دی گئی جسے اُس کی ماضی کی صورت دینے کیلئے جتنوں سے گھڑا گیا تھا ۔اینٹوں کی توڑ پھوڑ فوجیوں کی ٹینک توپیں ،عمارت کے بعض حصّوں پر گولہ باری ،اس کی روشوں کا ستیاناس ۔ایک مہذب قوم کا طرزِ عمل ۔

عشطر میسوپوٹیمیا کے باسیوں کی دیوی کا نام تھا ۔محبت اور حسن کی دیوی ۔

داخل ہونے کے ساتھ داہنی اور بائیں ہاتھ دو عمارتیں تھیں ۔ایک طرف بیبلون سوینیرز کی شاپ اور ٹورزم کا دفتر تھا ۔دوسری طرف میوزیم تھا ۔

میوزیم کو دیکھنا میں نے واپسی کیلئے رکھ چھوڑا تھا ۔محرابی راستے سے اندر داخل ہونے پر ایک وسیع احاطہ ۔لمبے چوڑے طاقوں والا کہیں عراق کے نقشوں اور کہیں عراقی تہذیبوں کے مختلف رنگوں کی عکاسی کرتی پینٹنگز سے سجا نظر آیا تھا ۔عشطر گیٹ سے ذرا آگے نشیب پر سٹریٹ آف پروسیشن Street of Procession ہے ۔جس کی دونوں

جانب کی دیواروں پر کہیں Adad تھا طوفانوں کا دیوتا تو کہیں ڈریگون جانوروں کی تصویریں بجی تھیں۔ان میں بڑا دیوتا مرڈک Marduk تھا۔

اندر ور اندر بیشمار سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔دیواریں بیروں کی خوشنما کنگریوں سے بجی ہوئی تھیں۔

دیواروں کے اندر مقید یہ شہر چھت سے دور بکھرے ہوئے کھنڈرات کی صورت میں زیادہ وسعتوں کے ساتھ نظر آتا تھا۔یہ صدام نے جرمن آرکیالوجی انسٹی ٹیوشن کی مدد سے تعمیر کروایا۔عالی شان محلات کے ساتھ عام شہریوں کے مکانات بھی تھے۔روشن دانوں اور کھڑکیوں کے بغیر۔لوہے کی جدید پتیوں کی صورت والے گیٹ سے سیدھی راہداری جو اردگرد بڑے بڑے چوکور کالموں پر اٹھے کالموں سے گھری تھی کو دیکھتی میں سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔سیڑھیاں شیطان کی آنت تھیں۔کیسے چڑھی؟خود کو لعن طعن اور پھٹکار کی مار مارتے۔

چھت پر اگر سورج کی چمک دمک جوبن اور حدت زوروں پر تھی تو سراٹے مارتی ہواؤں کے بلّھے بھی تھے۔جو جلد کو جلاتے تھے۔میں نے موٹے ڈوپٹے سے سارا چہرہ سوائے آنکھوں کے ڈھانپا ہوا تھا۔جب میں تصویر کشی کرتی تھی تو تاریخ کا عروج وزوال بھی کسی فلمی ریل کی طرح میرے دماغ میں چکر کاٹے چلا جاتا تھا۔

تو دو دریاؤں کے درمیان کا یہ علاقہ جو ہماری دیسی زبان میں دو آبہ اور یونانی زبان میں میسوپوٹیمیا (دریاؤں کا درمیان) کہلایا۔چھ ہزار سال قبل اپنے آغاز میں تو بس یونہی سے یہاں وہاں بنے گھروں والے گاؤں پر ہی مشتمل تھا۔پر جب پتھر کے زمانے کے کسانوں کی آل اولاد جانے کہاں کہاں سے آ کر مارشی زمینوں پر بسی تو یہ سمیری کہلائی اور یہ کیسی ذہین فطین قوم تھی کہ جس نے دنیا بھر کے خانہ بدوش لوگوں کو ایک تہذیبی تمدن سے آشنا

کیا۔یہ تاجر، یہ سوداگر، زر کا ایکٹ رائج کرنے والے۔آرٹ اور فن نے انہی کے ہاں جنم لیا۔انجینئر بنے کہ پہیہ اور رتا نے کا ہل بیلوں کی جوڑی کے ساتھ زمین کے سینے پر چلایا اور ذرائع آبپاشی میں جدتیں پیدا کیں۔مٹی کے ڈیم بنائے اور شدف Shaduf کو رواج دیا۔پڑھنے لکھنے کے آغاز کا سہرا بھی انہی کے سر سجا۔میخی رسم الخط ایجاد کیا۔طب کو فروغ اور جڑی بوٹیوں پر تحقیق ان کے زمانے میں ہوئی۔یہ ان کا شہرہ آفاق بادشاہ حمورابی ہی تھا جو قانون سازی میں دنیا کا باپ بنا۔اور طرز تعمیر میں زگرت Ziggarat (چوڑے چبوترے نما پلیٹ فارم پر منزل درمنزل عمارت جو اوپر کی طرف مختصر ہوتی جاتی ہے) بھی ان کے ذہنوں کی اختراع تھی۔کیا قوم تھی تو جب عین عروج سے زوال پذیر ہوئی تو بین بھی بڑے دردناک سے تھے۔

How, O Summer are thy mighty fallen!

the holy king is banished from his temple.

The temple itself is destroyed. the city demolished.

The leaders of the nation have been carried off into captivity

A whole empire has been overthrown by the will of the gods.

سامی نسل کے اشوریوں کو لمبی لمبی داڑھیوں اور پیروں والے شیر اور جانور بنانے کا بہت شوق تھا۔اربیلا موجودہ (اربیل) نمرود اور نینوا جیسے بڑے شہر بنائے۔بڑی لڑاکی قوم تھی۔

کہیں ٹکتے ہی نہیں تھے۔پہلے ان کے بادشاہوں نے اشور کو پایہ تخت بنایا پھر نینا Nina دیوتا کے نام پر نینوا بنایا۔ان دیوتاؤں کے ماننے والے بھی بڑے پکّے تھے۔ڈھنڈورا پیٹتے تھے کہ ہمارا نینا دیوتا بابل والوں کی دیوی عشطر سے کسی صورت مرتبے میں کم نہیں۔

ان کے بادشاہ بھی بڑے مہم جو اور لڑاکا تھے۔کیا اشور نصر پال Ashurnasir

pal-،کیاپلیسر Pileser۔اول یا دوم یا سوئم سبھی جنگوں میں جتے رہے۔ہر بادشاہ کے
کھاتے میں گاؤں اور شہروں کی تعداددرج ہوئی۔آخری بادشاہ کے اُناسی ۸۹
شہروں،۸۲۰ گاؤں پر قبضے ۷۰۰۰ گھوڑوں،۱۱۰۰۰ گدھوں،۸۰۰۰۰ بیلوں اوراتنی ہی بھیڑ
بکریوں کے ملنے اور ۲۰۸۰۰۰ انسانوں کے قیدی بننے کی خبروں نے بائرن کو بڑا متاثر کیا
تھا۔تبھی تو اس نے بے اختیار لکھا تھا۔

The assyrian came down like a wolf on the fold,

and his cohorts were gleaming in purple and gold

And the sheen of their spears was like stars on the sea

Where the blue wave rolls nightly on deep Galilee

مجھے کلدانیوں نے بھی بڑا متاثر کیا تھا۔یہ ان کا ہی بادشاہ نوبخذ نضر تھا۔بڑا دلیر
جنگ وجدل کا شوقین،سیاست دان،فاتح بننے کا آرزومند۔

پہاڑی میڈین ایمیٹس Amyitis شہزادی بیاہ کر لایا تو پہاڑی دوشیزہ کو اِن
صحراؤں،گرماگرم ہواؤں،ان میں اڑتے بگولوں نے بڑا مغموم کیا۔بادشاہ نے معلق باغ
بنائے اور دنیا کے سات عجائبات میں میسوپوٹیمیا کو درج کروایا۔

بابل کے معلق باغوں کا احوال میں نے ساتویں جماعت میں پڑھا۔بیان کس کا
تھا یہ یاد نہیں پر یہ معلق باغ کیسے ہونگے؟ زمانوں اسی ادھیڑ بن میں گزرے۔ہزاروں
تصویریں اور شبیہیں بنیں۔

عمارتیں بنوانے کے بڑے شوقین تھے۔خوبصورت انیمل ٹائلیں جو نیلی پیلی اور
سفید جانوروں اورانسانی شبیہوں سے سجی تھیں۔دجلہ وفرات کو بھی گھیر گھار کر اپنے محلوں کے
گرد لے آئے تھے۔کناروں پر معلق درختوں،پھولوں اور بیلوں سے سجے سہ منزلہ چہار
منزلہ گھر اور دوسرے کنارے کے پختہ فرشوں پر ان کی رانیاں چہل قدمی کرتی تھیں۔بابل کو

اُس نے قدیم تاریخ میں ایک عظیم ملک کےطور پر درج کروایا۔اینٹوں پر اپنے نام کھدوائے۔اور یہ بھی لکھوایا کہ بابل دنیا کا ایک عظیم ملک ہے۔

میں نوبخذ نضر شاہ پلیسَر کا بیٹا ہوں۔

''ہائے یہ نام چھوڑنے کا ہوکا۔کیا چھوٹے،کیا بڑے۔بس سارا رولا اسی کا ہے۔''

سمیریوں کے بعد عکادآئے۔ Akkad بڑے شاطر اور سلطنت کو وسعت دینے کی حرص میں مبتلا قوم تھی۔

فوجی طاقت اوپر سے سمیری تہذیب سے بہرہ ور کہیں مغرب کو بھاگے جاتے۔ مصر کو زیر کیا۔کہیں مشرق میں ہندوستان پر حملے۔سرگن کے بیٹے رمش Rimush اور Manistusu دونوں حملوں میں ہی سرگرم رہے۔

یہودی آئے،یونانی آئے،ستھین آئے،رومی آئے،پارتھی آئے،ساسانی آئے،عرب آئے،اسلام آیا،احمق اور انا کا مارا صدام آیا اور پھر وہ خبیث امریکہ آیا۔

اور دنیا بھر کیلئے قابل مثال اور قابل رشک ملک امریکہ کے جاہل اور احمق حکمران جنکی نظریں صرف اس کے تیل کے ذخائر پر تھیں۔جنگ سے پہلے اعلان کرتا تھا کہ ہمیں دنیا کے کسی غیر معروف گوشے میں حملہ کرنے کیلئے تیار رہنا چاہیے۔

''اُلو کا پٹھا اتنی بڑی سلطنت کا شہنشاہ اور نرا جاہل کہ جسے یہ نہیں پتہ کہ تحریر کہاں ایجاد ہوئی؟تہذیب وتمدن کا آغاز کس خطہ زمین پر ہوا۔نینوا کے کتب خانے،بابل کے معلق باغ،کیا اس نے کبھی بغداد کی شہرہ آفاق کہانیاں ایک ہزار ایک راتوں میں سے کسی ایک کی بھی کہانی نہیں سُنی۔جاہل نہ ہوتو۔

افلاق مجھے ڈھونڈتا ہوا اوپر آ گیا تھا۔میں دوربین آنکھوں سے لگائے بیٹھی چھم چھم کرتی بارش کی طرح دماغ کے آسمان سے اُترتی سحر انصاری کی دنیا میں گم تھی۔نظر کے

سامنے تاریخ بابل خون چکاں آئی۔

اندھیروں کے شکنجوں میں ابھی تک کیوں اجالے ہیں۔
جو مظلوموں کی لاشوں پر بھیانک رقص کرتے ہیں۔
وہ کرگس کس نے پالے ہیں۔
تمدن ساز نقاشوں کی تخلیقات کے ہوتے
سگان خیرہ سر کیسے گلی کوچوں میں آ پہنچے۔
چلو ہم بُرج پر بابل پر خدا سے بات کرتے ہیں
جو گھر میں اک دیئے کی روشنی کرنے سے قاصر ہوں
وہ دہشت گرد کہلائیں
جو لمحہ میں بھر میں زندہ بستیاں تاراج کر ڈالیں
وہ امن و آشتی و صلح کے ہمدرد کہلائیں
جو میزان عدالت ہے نہ احساس ہلاکت ہے
کوئی قانون بھی باقی رہا ہے تیری دنیا میں؟
چلو ہم بُرج بابل پر خدا اس سے بات کرتے ہیں۔

اُس نے میری تصاویر بنائیں اور بولا۔

''جلدی کیجیے۔حلا Hilla کے نزدیک صدام کا محل بھی آپ کو دکھانا ہے۔جو وہ اپنے لیے فرات کے کنارے سمیرین زیگورت ziggurat سٹائل پر بنا رہا تھا۔نو بخذ نصر کے محل کے کھنڈرات پر۔

میوزیم میں نے افراتفری میں دیکھا۔دراصل بغداد آرکیالوجی میوزیم میسوپوٹیمیا

کا ہی تو نمائندہ ہے۔ہاں البتہ یہاں وہ کنواں میرے لیے بہت دلچسپی کا باعث تھا۔جس کے بارے میں میں نے جانا تھا کہ یہ ہاروت وماروت کا کنواں ہے۔

2500 سال پرانے بوڑھے شیر کا مجسمہ جوشہر کا علامتی نشان تھا۔کس طمطراق سے کھڑا تھا۔صدیوں کی دھوپ چھاؤں پالے اور کہر کو اپنے اوپر سے گزارتا۔میں نے اُسے دوربین کی مدد سے دیکھا اور خدا حافظ کہا۔

ہواؤں میں تیزی تھی اور تپش کا زور قدرے ماند پڑ رہا تھا۔

ببلون کے راستے میں پہلے ایک پارک آیا۔دا ہنی سمت بابل سٹیڈیم بھی ہے۔پہلے شاید اس کا نام ایمفلی اسٹیڈیم تھا۔یہ یونانیوں کی یادگار ہے۔سکندر اعظم نے کچھ وقت کیلئے بابل کو اپنا پایہ تخت بنایا۔گو حقیقت یہ ہے کہ وہ یہاں حکومت کرنے نہیں مرنے کیلئے آیا تھا۔

ہلا Hilla کو میں نے آفلاق کی نشان دہی پر دیکھا۔یہ نجف کو جانے والی شاہراہ پر واقع ہے۔شہر نے جنگ کی بہت اذیت برداشت کی۔پہلے ہی دن اس کے گلی کوچوں میں کلسٹر بموں کے ٹکڑے بارش کی صورت لوگوں کے گھروں کی کھڑکیوں اور دروازوں پر برسے اور معصوم لوگ ان کا نشانہ بنے۔ہلا اسپتال میں دوائیں ناپید تھیں۔بستر تھوڑے تھے۔کٹے پھٹے اعضاء والے زخمیوں کو اٹھانے اور شہید ہونے والوں کو دفنانے والے بے چارے معصوم لوگوں کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ انہیں کہاں لے جائیں؟

شہر سے ذرا فاصلے پر صدام کا یہ دیو ہیکل محل فرات کے ایک طرف ایک اونچی پہاڑی پر جسکی ڈھلانیں عنابی وبلوٹ جیسے پھولوں اور ہرے کچور رنگ پودوں سے بھری ہوئی تھیں۔اس کے آہنی گیٹ بیلوں سے ڈھکے ہوئے۔سطح زمین پر عمدہ سیاہ سڑکیں ایک دوسرے کو کاٹتی دائیں بائیں پھیلی ہوئی تھیں۔میں تو گنگ سی اتنے بڑے محل کو دیکھے چلی جا رہی تھی۔

اس وقت جو منظر فضاؤں میں بکھرا ہوا تھا وہ حسن و رعنائی کے اعتبار سے ایسا خوبصورت تھا کہ دل چاہتا تھا وقت تھم جائے ۔سورج جو تیزی سے نیچے جا رہا تھا کاش اِسے کوئی پچھی ڈال کر کھینچ لے۔

میں تو گرین زون کے محل کی وسعتوں اوراس کے شاہانہ رنگ ڈھنگ پر حیران تھی ۔اور یہ جانتی ہی نہ تھی کہ اُس نے تو ذاتی محل باڑیوں کا مینا بازار سجار کھا ہے ۔کہیں تکریت جہاں وہ پیدا ہوا تھا بر تھ ڈے پیلس بنوا رہا تھا۔کہیں رضوانیہ پیلس ،کہیں صدام حسین پیس پیلس ،کہیں اس کے بیٹے اودے حسین کا الفا Al.Faw ۔محل تو بصرے والا بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

افسوس وہ کسی ہائی فائی خاندان کا فرد نہ تھا۔1982 میں جب اُس نے نو بخذ نصر دوم کے محل کے کھنڈرات پر چھ سو کمروں کا محل بنانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ بھی بخذ نصر دوم کی طرح دنیا کی عظیم ترین سلطنت کا حکمران ہوگا۔

آثار قدیمہ کے ماہرین کے نزدیک کھنڈرات پر رہائشی محل بنانا بدشگونی تھی ۔وہ خوف زدہ تھے چند ایک نے کہا بھی کہ قدیم artifacts کی چوٹیوں پر کوئی تعمیر تاریخ کو محفوظ نہیں کرتی بلکہ بدصورت کر دیتی ہے۔

کھنڈرات میں سے جو اینٹیں نکلی تھیں وہ تو نو بخذ نصر کے نام کا ڈنکا بجاتی تھیں ۔صدام حسین کے چیلوں کی بھی یہی حماقتیں تھیں ۔افلاق اس محل کو دیکھ چکا تھا۔آجکل یہ بند تھا مرمت ہو رہی تھی ۔اِسے پبلک کیلئے کھولنا تھا۔ نیلامیاں ہوں گی ۔اس کے ڈھیروں ڈھیر محلوں اور رولاز کی جنت کے ساتھ بھی اب یہی کچھ ہونے والا ہے ۔کچھ ہوٹل بن گئے اور کچھ موئل ۔شاید کہیں آنکھوں اور دل والوں کیلئے سامان عبرت بھی ہو۔

یہ ایک طلسمی محل ہے ۔ایک ہزار ایک کہانیوں جیسا اسرار اور طلسم لیے ۔

افلاق سیکورٹی گارڈوں سے مجھ پاکستانی سیاح کیلئے اجازت لے آیا تھا۔مگر میں تھکی ہوئی تھی۔بس چند کمروں کو ہی دیکھ کر انگشت بدندان باہر آ گئی۔انسان تو سراسر خسارے میں ہے۔

سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھ کر میں نے فرات کے نظارے لوٹے۔اور ساتھ ساتھ سُنا بھی کہ یہ پول اینٹوں پتھروں سے بھرا پڑا تھا۔اور تکریت کے محل کے اِن ڈور تالاب میں امریکی نہاتے تھے۔اس کے ہالوں میں امریکی جھنڈے آویزاں اور خواب گاہوں میں سپاہی سوتے تھے۔اپنے اطراف میں پھیلے صحرا کے بولتے سناٹے کی رنگینیوں سے سیر ہوئی۔سورج کو ڈوبتے دیکھا اور پروردگار کی عظمتوں کے سامنے سرنگوں ہوئی کہ بس دنیا میں ثبات اسی کو ہے۔

باب نمبر:19

1۔ قبائلی نظام کے زیر اثر عراقی عورت ظلم اور جبر کو صرف خاندان پر انگلیاں نہ اٹھنے کیلئے برداشت کر جاتی ہے۔

2۔ کوفہ یونیورسٹی بارہ کالجوں کے ساتھ ایک عظیم الشان ادارہ ہے۔

3۔ نجف اشرف مسلمانوں کا تیسرا مقدس ترین شہر، لائبریریوں کا مرکز یہاں علم کے دریا نہیں سمندر بہتے ہیں۔

4۔ قلعہ Uk Haidher آٹھویں صدی کے اسلامی طرز تعمیر کا دلکش شاہکار ہے۔

''بورسپہ Borsippa ایسی جگہ نہیں کہ جسے چھوڑا جائے۔

الفاظ اس کے گلے کے فوارے سے نکلتے موتیوں کی طرح اچھلتے کودتے میری سماعتوں سے ٹکراتے تھے۔

رضاظہ جھیل Razzazeh Lake کی مچھلی کھلانی ہے۔''

''چلو ایک کریلا اوپر سے نیم چڑھا۔'' میں نے فقرہ دانتوں میں پیس دیا۔

''کوفہ میں کوفہ یونیورسٹی دیکھنے کی چیز ہے۔ نپور Nippur کا بھی دیکھنے سے تعلق ہے مگر اُسکو دیکھنا خالصتاً آپ کی مرضی پر ہے۔ ویسے کبھی میسوپوٹیمیا کا ممتاز شہر تھا۔ یوں اللہ کے پیارے دوست خلیل اللہ کا تعلق بھی اُر سے ہے۔ تھوڑا سا اُر میں قیام کرنا ہو تو پندرہ کلومیٹر پر ناصریہ میں ریسٹ ہاؤس بھی ہے۔''

''پر اُس شیر خدا کے شہر کی قدم بوسی کے بغیر۔ فلاق نجف اشرف کا تم نے نام نہیں

لیا۔''وہ ہنسا اور بولا۔''اسکی ضرورت ہی نہیں۔سب سے اہم تو وہیں جانا ہے۔کوفہ سے دس میل پر تو ہے۔''

ایسی باتیں، جگہوں کی یہ چھوٹی موٹی تفصیلات سُننا میرا معمول تھا آج کوئی بارھواں روز تھا۔سوچے چلی جاتی تھی کہ تخم ملنگا اور قیترہ کوند جس تواتر اور کثرت سے میرے اندر یہاں گیا ہے۔اس کا تو پچاسواں حصّہ بھی میں نے اب تک کی زندگی میں نہیں پیا اور اگر یہ کہیں اسی رفتار سے وطن میں میرے اندر جاتا تو یقیناً ہڈیاں گوڈے تو جڑ گئے ہوتے۔

مگر صد شکر اُس کی ذات کا یہ گرمی کے بیج کو مارنے والی گیڈر سنگھی، جڑی بوٹیوں کی یہ سوغاتیں ہی تو تھیں کہ جنہوں نے عراق کی اِس نارِ جہنم کو میرے لئے گل و گلزار کر رکھا تھا۔یا دل کی گہرائیوں سے مانگا ہوا دُعا کا کوئی ٹوٹا تھا جو اوپر والے کے دل میں سیدھا جا گھسا تھا۔کچھ تو تھا کہ جس نے 54,55 ڈگری ٹمریچر میں پھرنے کے باوجود ابھی تک مجھے سن سٹروک کے مُنہ میں نہیں پھینکا تھا۔خیر اب تو بغداد ڈرامے کا آخری اپی سوڈ چل رہا تھا۔تین دن مزید۔

پر اگلی صبح پروگرام کی ساری ترتیب اُلٹ پلٹ ہوگئی کہ جب میں تیار ہو کر باہر آئی جہاں مجھے افلاق کے ساتھ پیدل چل کر ٹیکسی سٹینڈ تک جانا تھا جہاں اُس نے اپنی گاڑی پارک کی ہوئی تھی۔اُس نے مجھے بتایا تھا کہ بغداد گورنس کونسل کی ممبر ڈاکٹر حمیدی دولائی Dulaini کوفہ آئی ہوئی ہیں۔اُن سے آپ کا ملنا بہت ضروری سمجھتا ہوں۔

گاڑی قومی شاہراہ پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔صحرا میرے دائیں بائیں پھیلا ہوا تیز دھوپ میں نہاتا آنکھوں میں چبھا جاتا تھا۔چھوٹی بڑی بستیاں، کھیتوں میں اُگی سبزیاں جنہیں سخت دھوپ سے بچانے کیلئے کور کیا گیا تھا۔

علاقہ ریتلا ضرور تھا مگر خشکی اور تری کے امتزاج نے بڑی دلکشی پیدا کر رکھی تھی۔ کھجوروں کے باغات، فصلوں کی فراوانی اور پھولوں کی بہتات تھی۔ اسلامی فتوحات سے پہلے یہ ایران کا حصہ تھا اور عجمی دنیا میں حیرہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اُس جیالے جنگجو حضرت سعد بن ابی وقاص نے اِس مقام کی اہمیت کو ایک مدبر منتظم کی نظر سے جانچتے اور پرکھتے ہوئے حضرت عمر کی خدمت میں درخواست بھیجی تھی کہ یہاں اگر ایک فوجی چھاؤنی قائم کی جائے تو مفتوحہ علاقوں کو کنٹرول کرنے میں بہت آسانی رہے گی۔ منظوری ملی تو شہر بسنا شروع ہوا۔ چونکہ زمین اور آب وہوا سے لیکر حالات سازگار تھے۔ اس لیے دور نزدیکی جگہوں سے نقل مکانی ہوئی۔ بہت اونچی جگہ پر عظیم الشان وسیع وعریض مسجد اور اس کے ساتھ حضرت سعد کا گھر بھی تعمیر ہوا۔

حضرت عمر فاروق نے اسے دارُسلام کا نام دیا۔ صحابہ کے زمانے میں قبۃ الاسلام کے نام سے بھی مشہور تھا۔

پہلا گورنر مغیرہ بن شعبہ تھا۔ حضرت عثمان نے اپنی خلافت میں اُنہیں بدل دیا اور ولید بن عقبہ کو تعینات کیا۔ میرٹ کا معیار حضرت عمر کے زمانے تک سختی سے رہا۔ حضرت عثمان کے دور میں یہ متاثر ہوا۔ انہوں نے اقربا پروری بہت کی۔

گاڑی نے مرکزی شاہراہ کو چھوڑا۔ کچھ آگے گئی تو دریائے فرات نظر آیا۔ فرات پر آنکھیں پڑتے ہی جیسے میری آنکھیں جھلملانے سی لگیں۔ ''ہائے فرات''۔ کلیجے سے بڑا لمبا سا ''ہائے'' نکلا تھا۔ پل سے کراسنگ ہوئی جس کا نام امام علی تھا۔

گاڑی شہر میں داخل ہوگئی تھی۔ اسلامی تہذیب وتمدن کا نمائندہ شہر، اس کی وسعت گیری کا مرکز اور اس کے رنگوں کو اپنے دامن میں سمیٹنے والا شہر کوفہ جسکے لوگ انتہائی بے وفا، مطلب پرست خیال کیئے جاتے ہیں۔ تاریخ اسلام کے سب سے بڑے المیے کے داغ

انہی کوفیوں کے ماتھوں پر چمکتے ہیں۔

تاریخ نے بھی ساتھ ہی سرگھمانا شروع کر دیا تھا۔

پل سے گزرنے کے ساتھ ہی جونہی شہر میں داخلہ ہوا۔افلاق نے گاڑی کوفہ کی قلعہ نما مسجد کے سامنے روک دی۔

''زیارت کر آیئے ۔میں ذرا ناشتہ کرلوں ۔یہ وہی مسجد ہے جہاں شیرِخدا نے مدینہ منورہ کے بعد کوفہ کو اپنا دارالخلافہ بناتے ہوئے قیام کیا تھا۔''

اندر داخل ہوئی ۔عظیم الشان مسجد محرابی برآمدوں کے ساتھ چمکتے گنبد اور چوکور مینار کے ساتھ میرے سامنے تھی ۔سامنے وسیع وعریض میدان اور عین درمیان میں ایک کٹہرہ تھا۔

سویرے سویرے لوگوں کے پُرے تھے۔پاکستانی یا ہندوستانی چہرے بھی دیکھنے کو ملے۔کسی سے پوچھا۔

''ارے یہی تو وہ جگہ ہے جہاں نوح کی کشتی آ کر ٹھہر گئی تھی ۔یہ میدان فضیلتوں والا ہے۔اِس میں انبیاء کے سجدوں کی خوشبو ہے۔

تو وہاں سجدہ دیا اور خدا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا بھی کہ دیکھ گواہ رہنا پیشانی یہاں ٹکی ہے۔

آگے بڑھی ۔مسجد کے اُس حصے میں آہ و بکا تھی ۔سسکیاں تھیں ۔بین تھے۔ یہاں حضرت علی پر حالت نماز میں عبدالرحمٰن بن ملجم نے حملہ کیا تھا۔چاندی کی جالیوں میں مقید جس کے گرد عقیدت مند لپٹے ہوئے ہیں ۔فریادیں لبوں پر ہیں ۔باتیں ہو رہی ہیں ۔آنسو بہہ رہے ہیں ۔فاتحہ پڑھی ۔دعا کی۔

''پروردگار وہ ہستی توکّل کی کس معراج پر تھی کہ تصور محال ہے ۔رات بہت دیر

تک اکیلے عبادت میں مشغول رہتے تھے۔چاہنے والوں نے محافظ مقرر کیے۔آپ کو پتہ چلا تو محافظوں سے مخاطب ہوئے۔

''یہاں اِس روئے زمین پر ہر چھوٹی بڑی حتیٰ کے نہ نظر آنے والی مخلوق کی قسمت کی نگہبانی اور کنٹرول بھی اُس خدا کے ہاتھ میں ہے تو پھر تمہاری ضرورت کیا ہے؟یوں انہیں فارغ کردیا۔

ذرا آگے مسلم بن عقیل کا روضہ ہے۔ان کی شہادت بھی یہیں ہوئی۔بہت شاندار جگمگ جگمگ کرتا۔نفل پڑھے۔برآمدے میں تھوڑی دیر بیٹھی۔باہر آئی۔

کوئی گھنٹہ بھر بعد نکلی۔افلاق منتظر تھا۔گاڑی سڑکوں پر بھاگنے لگی۔شہر اپنے عام سے خدو خال کے ساتھ سامنے آرہا تھا۔

پھر ایک خوبصورت سا پارک آیا۔پاس ہی کوفہ کلب سٹریٹ تھی۔بڑے سے ایک گیٹ والے گھر کے سامنے گاڑی رک گئی۔بیل کرنے پر نوکر کے باہر آنے اور میرے اندر جانے تک کے سارے معاملات میرے لیے بہت دلچسپی کے حامل تھے۔گھر کا مہمان خانہ جدید طریقے سے سجا تھا۔بس دیواروں پر قدیمی تاریخی ورثے کی صورت تین بندوقیں اور حنوط شدہ باز کا سر ٹنگے تھے۔

چند لمحوں میں ڈاکٹر حمیدی دولانی Dulaini آگئیں۔اونچی لمبی جٹی مٹیار جیسی۔ بہت چاہت سے بغل گیری اور بوس و کنار کے مرحلے طے ہوئے۔صوفے پر بیٹھتے ہوئے میرے حوالے سے چند سوال ہوئے کہ کب آئیں اور کس کس سے ملنا ہوا؟

قہوہ،کھجوریں اور بسکٹ فوراً ہی آگئے تھے۔

میں نے اُس لڑکی فاطمہ کے متعلق پوچھا تھا جس کے بارے میں میں نے پاکستان میں بھی پڑھا تھا۔اُس بچی کے علاوہ ایک دوسری عورت فاطمہ نامی بھی تھی جس نے

ابوغرب جیل سے ایک خط کسی گارڈ کی مدد سے باہر پہنچایا تھا۔اس خط نے امریکی سپاہیوں کے پست اور بھیانک کرداروں پر پہلی بار تفصیلاً روشنی ڈالی تھی ۔

مگر تاسف بھرے لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے قہوے کا سپ لیا اور کہا۔

ایک بغداد کی ابوغرب جیل کیا وہ تو ہر جیل میں جا گھسے تھے۔کاظمیہ میں صدام کے زمانے کی بہت بڑی جیل ہے جسمیں سینکڑوں عورتیں ہیں۔جن میں بہت سوں کے ساتھ بیشمار واقعات ہوئے۔تکریت اور سامرہ کی جیلوں میں بھی یہی کچھ ہوا۔

میرے ایک سوال پر کہ یہ عورتیں کس کس جرم میں جیلوں میں تھیں؟

کچھ تو صدام کے زمانے کے سلسلے تھے۔وہ بھی بڑا ظالم تھا۔اپنے خلاف ایک بات سُن لیتا تو خاندان کو یا کلھو میں پیس دیا جاتا۔اُن کے شوہر مارے گئے یا قیدی بنا کر جیلوں میں ٹھونسے گئے۔تاہم امریکی حملے کے بعد جو شدت آئی وہ صدام حامیوں کی گرفتاریوں کی تھی۔مردوں کو قتل اور عورتوں کو جیلوں میں ڈال کر انہیں ریپ کرنے اور تشدد کا نشانہ بنانے کی مثالیں بہت زیادہ ہوئیں۔تکریت کی جیل تو خاص طور پر اِس زیادتی کا زیادہ نشانہ بنی۔

دوسرے القاعدہ کے حامی لوگوں میں سے جہاں اور جس پر خفیف سا شک گذرتا اُسے اٹھا لیا جاتا۔نوجوان لڑکیاں ریپ اور عورتیں جیلوں میں۔

اس ضمن میں عام لوگوں کی تو بات ہی کیا صباحسن جیسی جرنلسٹ اور ہیومن رائٹس ایکٹوسٹ کے ساتھ یہی کچھ ہوا۔

بڑی لرزہ خیز داستانیں تھیں۔رونگٹے کھڑے کرنے والی، مزاحمت کاروں کی بیویوں، بیٹیوں، بہنوں اور ماؤں کسی کو بخشا نہ جاتا۔تشدد کی وہ انتہا ہوتی کہ کئی کیسوں میں مزاحمت کار آ کر خود کو اُنکے سامنے پیش کرتے مگر پھر بھی رہائی نہ ہوتی۔

اب میں خود شیعہ ہوں ۔مگر عین عید کے روز صدام کو پھانسی دینا کس قدر سفاکانہ عمل تھا۔نسلی فسادات کا ایک لاوہ تھا جو اِس پھانسی کے ساتھ پھوٹا ۔وہ لوگ بھی رگڑے گئے جو صدام مخالف تھے۔اب امریکہ اور اس کے اتحادی یہی کچھ چاہتے تھے۔Khadimiya women prision میں سنی عورتوں پر بہت تشدد کیا گیا۔پھولوں جیسی خوبصورت لڑکیوں کو کہیں سامرہ،کہیں موصل کے تہہ خانوں میں رکھا گیا جہاں کچھ وقت کے بعد انہیں زندہ جلا دیا جاتا۔

عراقی فوج اور عراقی پولیس کے رویوں بارے بات ہوئی کہ وہ کسی حد تک امریکی فوجیوں کا ساتھ دیتی رہی۔

بہت سے معاملات میں دل نے جو کہا اُس کے مطابق کام ہوئے ۔نہ نوکری کی پرواہ کی اور نہ جان کی ۔لوگ اپنے لوگوں پر خود چاہے جتنے مرضی کولہ بارود برسائیں وہ الگ مگر کسی غیر قوم کے ہاتھوں اپنی عورتوں کی تذلیل برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا تھا۔بہت سے کیسوں میں جب یہ حمایت سامنے آئی تو امریکیوں نے زیادہ تشدد کیا۔فورٹ سوزا میں تو امریکی سپاہیوں کو قتل بھی کر دیا گیا تھا۔

دراصل عراق زیادہ تر قبائلی نظام کے زیر اثر ہے۔عورت اپنے اوپر جبر اور ظلم کو برداشت کر جاتی ہے کہ خاندان کی تذلیل نہ ہو۔اس پر انگلیاں نہ اُٹھیں۔

دُکھ کی بات تو سراسر یہ ہے کہ ان اتحادی افواج پر عراقی حکومت کا کوئی قانون لاگو نہیں۔اسی لیے انہیں سب کچھ کرنے کی کھلی چھٹی ہے۔

ہاں کچھ ظلم اور زیادتیاں مسلکی اختلاف پر ہوئیں۔

پاکستان کے حوالے سے بھی بہت باتیں ہوئیں۔میرے مزید قیام کے دنوں بارے جاننے کے بعد انہوں نے بغداد میں ملنے کی تاکید کی۔

کوفہ بُہت پھیلا ہوا، بہت شاندار، بہت جاہ وجلال والا شہر نہیں ہے۔جیسے اِسے ہونا چاہیے تھا۔صفائی ستھرائی کی حالت بڑی ماٹھی تھی۔بازار بھی ہمارے شہروں جیسے ہی تھے۔کوفہ یونیورسٹی البتہ باہر سے بہت شاندار نظر آتی تھی۔یقیناً اندر سے بھی ایسی ہی ہوگی۔1987میں بننے والی اس یونیورسٹی کی بنیادیں تو بہت پرانی ہیں۔کبھی مسجد کوفہ سے ملحق کسی اسلامی سکول کی صورت،کبھی کالج کی صورت۔اب یہ بارہ کالجوں کے ساتھ ایک عظیم الشان ادارے کی صورت کام کر رہی ہے۔

افلاق بتا رہا تھا کہ چند ماہ پہلے یونیورسٹی نے کوفے کے بیٹے طیب احمد ابن الحسین المتنابی(915-965)جو عرب کلاسیکل شاعری کا بہت بڑا نام ہے کا ہفتہ منایا تھا جسمیں شرکت کیلئے وہ برطانیہ اور سویڈن کے عراقی لوگوں کو اپنی گاڑیوں میں یہاں لایا تھا۔

اسلام کی بہت ساری نامور شخصیات کوفہ سے ہیں۔

دلبستان فقہ کی بنیاد ایک طرح اِس شہر میں رکھی گئی۔یہ شہر فقہ اور حدیث رسول کا مرکز تھا۔خط کوفی کا آغاز بھی یہیں سے ہوا۔

کیسا عظمتوں والا شہر تھا۔مگر کیسا گہنایا گہنایا لگتا تھا۔

وہ زوال اور مردنی جو عالم اسلام پر چھائی ہے۔اس پر بھی طاری ہے۔سچ ہے جب قوموں کے مقدر چمکتے ہیں تب شہر بھی چمکتے ہیں۔

نجف اشرف کوئی دس میل ہوگا۔کوفہ اور نجف اشرف روالپنڈی اور اسلام آباد کی طرح ہیں۔روایت ہے کہ شہر کی بنیاد ہارون الرشید نے رکھی تھی۔اس کے تعاقب میں بھی ایک واقعہ ہے کہ ہارون الرشید کوفے کے گردونواح میں شکار کیلئے آیا۔ساتھ شکاری کتے اور باز تھے۔ہرن نظر آئے تو پیچھا کیا۔مگر وہ ذرا فاصلے سے ایک ٹیلے پر چڑھ گئے۔کتوں اور بازوں کو ہانکا گیا کہ تعاقب کریں۔مگر ٹیلے پر چڑھنے سے جانوروں کی دونوں اقسام نے

رخ پھیر لیا۔چند بار جب ایسا ہوا ہارون الرشید کو تجسس ہوا کہ آخر ماجرہ کیا ہے؟ قریبی آبادی حیرہ کی تھی۔نوکروں کو بھیجا کہ وہاں کے معمر ترین افراد کو لایا جائے کہ شاید وہ اس پر کچھ روشنی ڈالیں۔ایک عمر رسیدہ بوڑھا حاضر خدمت ہوا جس نے ساری کہانی کے جواب میں بتایا کہ یہاں حضرت علیؓ دفن ہیں۔

اب جگہ کھودی گئی تو قبر کے نشان ظاہر ہوئے۔ساتھ ہی ایک لوح نظر آئی۔جس پر سریانی خط میں لکھا ہوا تھا کہ یہ مدفن حضرت علیؓ کا ہے۔

وہاں روضہ تعمیر ہوا۔پھر اردگرد حجرے اور کوٹھڑیاں بننے لگیں۔آبادی بڑھتی گئی علاقہ نجف اشرف کے نام سے جانا جانے لگا۔

یہ تفصیل مجھے معلوم تھی۔افلاق نے جب بتائی تو جاننے کے باوجود میں نے سُنی کہ شاید کوئی نئی بات پتہ چلے۔

گاڑی سڑکوں کے چکر کاٹ رہی تھی۔یہ مقدس اور معتبر شہر تھا۔مکہ اور مدینہ کے بعد مسلمانوں کا تیسرا مقدس ترین شہر۔

دنیا کے ہر پرانے شہر کی طرح یہ بھی دو حصوں میں بٹا ہوا ہے قدیم اور جدید۔پرانے حصے میں حضرت علیؓ کا روضہ مبارک ہے۔اِسکا عالیشان سنہری گنبد ہر طرف سے نگاہوں کی زد میں تھا۔

یہ سٹی سٹریٹ ہے۔مقامی زبان میں اسے شارع المدینہ کہتے ہیں۔شہر کو ذرا دیکھ لیں۔میں نے سکول دیکھے،اسپتال اور ہیلتھ کیئر سینٹروں کے بورڈ پڑھ کر ان کے بارے جانی۔پلازے تھے۔بازار در بازاروں کے سلسلے۔ غلعی حکومتی عمارتیں۔زائرین کے قافلے۔

یہ لائبریریوں کا شہر ہے۔اس کے مدرسوں میں دنیا بھر کے طالب علم موجود

ہیں ۔میں نے گاڑی میں ہی بیٹھے بیٹھے میڈیا سینٹر کی شاندار عمارت دیکھی ۔پبلک لائبریری گئی ۔علم کا دریا نہیں وہاں سمندر بہہ رہا تھا۔

روضہ مبارک پر میلے کا سا سماں تھا۔وسیع وعریض میدان پر زائرین کے پرے تھے ۔ڈولی ڈنڈوں کے ساتھ آئے ہوئے زائرین برآمدوں میں دھونی رمائے بیٹھے تھے ۔

دوکانوں پر چہل پہل کا بازار گرم تھا۔خریداریاں تسبیح ،کھجوریں دیگر خوردنوش کی اشیاء کھیوں کی بہتات ،سبز چادریں اور مٹھائیاں ۔میں نے اُتر کر چند دوکانوں میں تا کا جھانکی بھی کی ۔یہ دیکھنے کیلئے کچھ میڈ ان پاکستان کی بھی کوئی چیزیں وہاں پڑی ہیں ۔ایک دوکان میں باسمتی چاولوں کے تھیلے دیکھ کر تھوڑی سی ٹھنڈ پڑ گئی ۔

حضرت علی اور امام حسن وحسین کی تصویریں بک رہی تھیں ۔

روضہ مبارک کے اردگرد ایک وسیع وعریض عمارت ہے ۔دیواروں کی نقش گری آنکھوں کو متوجہ کرتی ہے ۔شیشہ ہی شیشہ ہر جانب یوں لشکارے مارتا ہے کہ لگتا ہے آپ کسی آئینہ خانے میں کھڑی ہیں ۔

رش کا وہ عالم تھا کہ مجھے لگتا تھا کہ میں تو زیارت سے ہی محروم رہ جاؤں گی مگر بڑا کرم ہوا ۔

افلاق کی مدد سے یہ پل صراط طے ہوا ۔روضے کے گرد سنہری جالیاں ہیں ۔ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھی ،نفل پڑھے اور اقبال کو گنگناتے ہوئے باہر نکل آئی ۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ

سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ ونجف

دوپہر کا کھانا افلاق نے مطعم طجرہ میں کھلایا ۔بہت بڑا ریسٹورنٹ تھا ۔کھانا لذیذ تھا ۔

وادی السلام میں اُتری نہیں ۔گاڑی میں بیٹھے بیٹھے دیکھتی رہی ۔قبروں کے لامتناہی سلسلے کہیں دومنزلہ اور کہیں سہ منزلہ ۔دنیا کا شاید سب سے بڑا قبرستان تھا یہ۔یہاں ایک بازار بنا ہوا تھا۔قبروں پر چڑھاوں کیلئے پھول چادریں سبھی دستیاب تھیں ۔گاڑی چلتی رہی ۔میں دنیا کی بے ثباتی پر فکر میں ڈوبی ہوئی ہول کھاتی رہی ۔

جب گاڑی نیشنل ہائی وے پر چڑھی ۔افلاق نے مجھ سے پوچھا۔

''بتائیں اُدھر چلیں گی ۔''

''نہیں افلاق نجف اشرف دیکھ لیا ۔وہاں سجدہ دیا تو بس سبھی کچھ حاصل ہوگیا ۔باہر دیکھو ذرا ۔سورج سوا نیزے پر آیا ہوا ہے ۔خدا کی ذات اگر مہربان رہی ہے تو اب اس کا ناجائز فائدہ نہ ہی اٹھاؤں ۔جھیل پر ضرور جانا ہے کہ شام وہاں خوبصورت ہوگی ۔وہاں سے واپسی ۔''

''مگر اُس نے تیزی سے میری بات کاٹ دی۔اُک حیئی در Uk Haidher castle دیکھ لیجیے ۔یہ کربلا کے جنوب مغرب میں ہے ۔جھیل بھی راستے میں ہے ۔

مجھے تامل تھا ۔مگر افلاق کا اصرار تھا اُسنے ساتھ ہی یہ بھی کہا ۔

اُس قلعہ کی موٹی موٹی دیواروں اور چھتوں میں ٹھنڈک کا رچاؤ ہے ۔دوپہر کے دو گھنٹے اطمینان سے گزاریئے وہاں ۔''

میں افلاق کی ممنون تھی کہ وہ تھوڑی سی زبردستی سے مجھے ایک ایسی چیز دکھانے لے گیا ۔جس کا یقیناً دیکھنے سے تعلق تھا۔لق و دق صحرا میں کھڑے جہاں سورج قیامت کا سا منظر پیش کرتا تھا میں نے دیوہیکل موٹی اونچی کسی نوکیلی چٹان کی طرح اوپر اُٹھتی دیواروں کو دیکھا تھا۔اسے قلعہ کہہ لیں اسے محل کا نام دے لیں ۔یہ آٹھویں صدی کے اسلامی طرز تعمیر کا

وہ دلکش شاہکار تھا۔ جسے محرابوں اور قوسی چھتوں کی صورت پتھروں اور پلاسٹر کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ بنانے والے کا نام عباسی خلیفہ الصمی کا بھتیجا علیٰسی بن موسیٰ تھا اور جسے اسے وقت اور زمانے کی دبیز تہوں میں سے نکالا وہ جیرٹروڈ بیل تھی۔ Ukhaidher کا مطلب چھوٹی سی سرسبز جگہ سے ہے۔

جولائی 2000 سے اسے یونیسکو ورلڈ ہیریٹیج کی لسٹ میں شامل کرلیا گیا ہے۔

اندر داخل ہوتے ہی جیسے میں کسی نخلستان میں آگئی تھی۔ کچھ حصّوں کی Renovation دوبارہ ہوئی ہے۔ کچھ ابھی پرانی حالت میں ہیں۔

کمال کی چیز تھی۔ مجھے تو بہت سے حصوں پر شاہی قلعے کا گمان ہوتا تھا۔ دومنزلہ سہ منزلہ۔ اس کی ہرسمت کے درمیان میں مینار ہیں۔

استقبالیہ ہالوں کی کشادگی اور دیواروں پر کی گئی ڈیزائن کاری کیا کمال کی تھی۔

اندر ہی اندر پھیلتی کوٹھڑیاں۔ ہوائیں فراٹے بھرتی اندر آتی تھیں۔

ریسٹورنٹ سے ٹھنڈا ٹھار مشروب 7 up پیا۔ نماز پڑھی۔ مسجد میں آرام کیا اور شام ڈھلنے پر باہر نکلی۔

جھیل کی سیر نے لطف دیا۔ مچھلی کھائی۔ اندر پانیوں کے پتھروں پر چڑھ کر تصاویر بنائیں۔

باب نمبر: 20

1۔ ال شابندر کافی گھر ہمارے پاک ٹی ہاؤس جیسی ہی تربیت گاہ ہے۔

2۔ جمیز بیکر تم امریکی کل کی پیداوار عراقیوں کو بموں کی بارش سے پتھر کے زمانے میں پہنچانے کی دھمکی دیتے ہو۔ ہم چھ ہزار سال سے سینکڑوں بار ایسی قیامتوں سے گزر کر ہمیشہ نئے عزم سے پھر کھڑے ہونے والی قوم ہیں۔ طارق عزیز کا طنزیہ متانت بھرا جواب تھا۔

یہ کربلا معلّی سے بغداد کیلئے واپسی کا سفر تھا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے قبل میں نے صبر و رضا کے پیکر امام عالی مقام وذی شان کے روضہ مبارک کے چمکتے گنبد کو الوداعی نظروں سے دیکھا اور دھیرے سے کہا۔

’’آپ کا شکریہ۔ آپ نے بُلایا۔ دیدار کروایا۔ مجھے تو کبھی اس دید کی آس امید ہی نہیں تھی۔‘‘

تاحد نظر پھیلے صحرا کو دُور ملگجے آسمان سے بغل گیر ہوتے دیکھتے، ہواؤں کے بگولوں کے سراٹے مارتی پُھنکاروں کو محسوس کرتے، خس و خاشاک کو یہاں وہاں چھلانگیں مارتے اور گرتے دیکھنا سب بہت دلچسپ تھا۔

مجھے اپنے کمرے کی ساتھی خواتین یاد آئی تھیں جنہوں نے مجھ جیسی آوارہ گرد خاتون کو محبتوں سے الوداع کہا تھا۔ جو میرے گھر جانے پر خوش تھیں۔ انہیں تو ابھی ایران کا سفر درپیش تھا۔

افلاق کو خوشی تھی کہ اُسنے میرے ناں ناں کرنے کے باوجود مجھے بورسپہ Borsippa دکھاہی دیا۔

''آپ کونہیں پتہ سیاحتی نقطہ نگاہ سے یہ کتنی اہم چیز ہے؟ گواسکی ابھی تک تشہیر زیادہ نہیں ہوئی ۔عام لوگوں کوتو پتہ ہی نہیں کہ یہ عظیم بابلی دیوتا مرڈک کے بیٹے نبو Nabu کی جائے عبادت تھی اور مذہبی طور پراس کی کتنی اہمیت تھی؟

''چلو اچھا ہوا میں بھی اسے نہ دیکھ پاتی تو افسوس رہ جانا تھا۔مڑ دوبارہ کب آنا نصیب ہے؟''

میری آنکھوں کے سامنے بورسپہ کے منظر رقص کرنے لگے تھے۔آسمان اور زمین پراس وقت شام کا حُسن پھیلا ہوا تھا۔ اردگرد کے ماحول کی ویرانی ،گونجتا سناٹا اور سورج کی زرنگاری نے بڑے عجیب سے منظروں کی آمیزش سے گندھے نظاروں کے سنگ متوجہ کیا تھا۔ دور سے اونچے تہہ درتہہ چبوتروں پر کھڑے دو مجسمے باہم ہم آغوش نظر آتے تھے۔دراصل یہ کبھی بلند مینار تھا۔کسی دم دارستارے کے ٹوٹنے اوراس سے ٹکرانے کی وجہ سے پگھل کر یہ شکل اختیار کرگیا ہے۔

''چلو اِس نے جوشکل اختیار کی ہے وہ اچھی ہے۔یہ زگورت Ziggurat سٹائل ہی تھا۔کبھی ہونگی چھ سات منزلیں اب تو ٹیلا سانظر آتا تھا۔افلاق نے مجھ سے اوپر چڑھنے اورتصویر بنانے کا پوچھا۔میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تم چاہتے ہو یہاں میری قبر بن جائے۔بس میں نے دیکھ لیا ہے۔مجھے اس کےاندر بھی نہیں جانا۔''

بغداد پہنچ کر مجھے ہجری ہوٹل میں ٹھہرنا تھا۔اس چارستارہ ہوٹل کا انتظام افلاق نے کیا تھا۔یہ دجلہ کے دہانے پر واقع کاظمیہ کے علاقے میں تھا۔جس سے بہرحال میں کافی

واقف ہوچکی تھی۔ میں نے بھی دل میں کہا تھا۔

''چلو یہ زبردستی کی عیاشی کرلوں۔وگرنہ تو جس طرح میں رہی تھی اُسنے حشر کرڈالا تھا۔

آج کی شام مجھے بغداد پریس کلب جانا تھا۔بغدادی صحافیوں سے ملنا تھا۔کاش میری ملاقات اُس جیالے لڑکے منتدر ل زیدی سے ہوسکتی جو بیچارہ جیل کاٹ رہا تھا۔

افلاق نے مجھے اپنے چچا کے گھر کی آفر کی تھی۔الحریت میں چھوٹا سا گھر جو صرف دو کمروں پر مشتمل تھا۔ایک کمرے میں چچا چچی اور دوسرا افلاق کے پاس تھا۔کربلا سے واپسی پر میں سیدھی انکے گھر آئی تھی۔اپنی جان کیلئے خاصی کمینی ہونے کی وجہ سے میں نے ایک پل کیلئے سوچا بھی کہ چلو اِس کی دعوت قبول کرلیتی ہوں۔مگر دوسرے لمحے سارے خاندان کو اپنے دو پیسے بچانے کیلئے مصیبت میں ڈالنے کا سوچتے ہی انکار کردیا۔

یہ بھی کیسا عجیب اتفاق تھا کہ افلاق نے بہت بار چاہا اور کہا کہ چچی اور چچا آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔آپ دوپہر یا رات کو گھر چلیے۔مگر بات وہی دانے پانی کی۔اُن کی ہنڈیا میں میرے نام کی کوئی چیز پکتی تو جاتی۔کبھی رات دیر ہوجاتی اور کبھی میرا تھکن سے بُرا حال ہوتا اور کبھی دوپہر کو آرام کیلئے میں قریب ترین مسجد کو زیادہ مناسب سمجھتی۔

میر کاروان سے افلاق مل چکا تھا۔ایک دن مزید مجھے بغداد رہنا تھا۔اگلے دن شام کو میری بغداد سے روانگی تھی۔مجھے ٹکٹ کہاں سے لینا تھا؟ اُس کا انتظام بغداد میں جس شخص کے ذمہ تھا اُس کا نام، پتہ اور رابطہ نمبر سب مجھے دے دیا گیا تھا۔

الحریت کا علاقہ کاظمیہ میں تھا۔کہیں دومنزلہ،کہیں یک منزلہ گھر۔گلی کافی کشادہ تھی۔ایک سرے پر ہمارے ہاں کی طرز پر جھولے والا جھولے میں محلے کے بچوں بالوں کو جُھولے جُھلا رہا تھا۔لوہے کے تین مظبوط پایوں کی تکونی صورت راڈوں میں نیلے، پیلے

بدرنگے ڈبوں میں بچے بچیاں بیٹھے اوپر نیچے جھول رہے تھے۔ہنس رہے تھے۔بے فکری کے دن دھوپ گرمی ہر احساس سے بے نیاز۔

چھوٹے سے آنگن میں کھجور کا درخت کھجوروں سے بھرا ہوا تھا۔ابھی شاید اُتاری نہیں گئی تھیں۔سامنے کے رُخ پر باورچی خانہ تھا۔ایک طرف چھوٹا سا مہمان خانہ۔آگے برامدہ اور پیچھے دو کمرے۔گھر میں اتنی صفائی ستھرائی تھی کہ چھوٹا ہونے کے باوجود بہت اچھا لگ رہا تھا۔کمرے میں چھوٹی سی کھڑکی پر بڑا سا ہرے رنگ کا پردہ لٹک رہا تھا۔ہرے رنگ کا میٹ بچھا ہوا تھا۔دیواروں کے ساتھ روئی کے بھرے ہوئے لانبے ڈھائی تین فٹ چوڑے سرخ اور نیلے پھولوں والے گدے بچھے ہوئے تھے۔کونے میں رکھی میز پر ٹی وی چل رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں زوجیل علی آگئی۔افلاق کی چچی۔عبایا پہنے حجاب اوڑھے سُرخ و سفید سی ہنستے ہوئے اُس نے میرے دونوں گالوں پر باری باری بوسے دیئے۔

افلاق نے بتایا تھا کہ وہ ساتھ والے گھر گئی ہوئی تھی۔اُن کی بیٹی کی منگنی ہوئی ہے۔مبارکباد دینی تھی۔

پانی آیا۔تھوڑی دیر بعد قہوہ آیا۔پلیٹ میں بے حد گرم جبھس(تنوری نان کہہ لیں)پر پگھلی کریم جس پر شمال کے پہاڑوں کا بے حد لذیز شربتی شہد بکھرا ہوا تھا۔میری آنکھیں چمکیں اور ہاتھوں نے فی الفور بُرکی توڑتے ہوئے اُسے شہد اور کریم میں ذرا کوٹا۔ہائے کیا لذت تھی؟قہوے کا ساتھ میں گھونٹ۔ہمارے دیہاتوں جیسا جہاں گرما گرم تنوری روٹی مکھن کے پیڑے پر راب(گڑ بننے سے ذرا پہلے کا حاصل ہونے والا مواد)سے کھائی جاتی ہے۔تھوڑے سے فرق سے ایک سا کلچر۔

مجھے قہوہ پینے میں اتنا لُطف و سرور کبھی نہیں محسوس ہوا تھا جتنا میں نے اس وقت

محسوس کیا تھا۔شاید یہ خالصتاً گھریلو ماحول کی قربت کا اثر تھا۔چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتے ہوئے افلاق کی چچی سے آنکھوں کے اشاروں سے باتیں کرنا کہیں سمجھنا،کہیں نا سمجھنا،افلاق کاترجمہ کرنا کھلکھلاکر ہنسنا سب مجھے مزہ دے رہے تھے۔

ٹی وی پر عراقی نیشنل سمفنی آرکسٹرا کا کوئی پرانا ریکارڈ کیا پروگرام چل رہا تھا۔رک(Riq)اورڈرم بجانے والےلڑکوں کی وجاہت بے مثال اورگٹار بجاتی لڑکیاں بھی کتنی خوبصورت اوردل آویزسی تھیں۔میں تو انہیں ہی دیکھے چلی جارہی تھی۔

آرام کیا خاک کرنا تھا۔لوڈشیڈنگ کا حال ہمارے ملک جیسا ہی ہے۔ذرا سی اُونگھ آتی تو آنکھ کھل جاتی۔زوجیل میرے قریب ہی بیٹھی ایک رسالہ پڑھ رہی تھی۔پوچھاتو پتہ چلا کہ خواتین کا پرچہ ہے جو قاہرہ سے چھپتا ہے۔کہانیاں معاشرتی قسم کی ہی تھیں۔میں نے قدیم شعرا کے بارے میں بات چیت کی کوشش کی تو جانی کہ زوجیل صرف ان کے ناموں سے آشنا ہے یا اُس کلام سے جو گایا گیا ہے۔ہاں البتہ وہ دُنیا میخائل اور نازک الملائیکہ سےخوب واقف تھی۔"عاشقات اللیل" اُس کا ایک مجموعہ بھی اُس کے پاس تھا جسے وہ اپنی الماری سے نکال کرفوراً لے بھی آئی تھی۔آزادنثری نظم کی خالق شاعری کو نیا رنگ،نیا رُخ،نئی فکراورنئی سوچ دینے والی خوبصورت آوازاورخوب رو چہرے والی شاعرہ جو 2007میں دنیا سے رخصت ہوگئی۔

کاش مجھے اپنے قاہرہ قیام کے دوران معلوم ہوتا کہ وہ قاہرہ میں ہےتو میں اُسے پوچھ پوچھ کرڈھونڈنے نکل کھڑی ہوتی۔میں بھی عجیب عورت ہوں۔

پانچ بجے قہوہ پینے کے بعد گھر سے نکلے اور یہ کہوں گی کہ اُس سارے دن کا ماحصل اُن دوگھنٹوں کا دورانیہ تھا جو میں نے المتنابی سٹریٹ کی ال شابندر کافی شاپ میں گزارے تھے۔میں المتنابی سٹریٹ کی باقاعدہ سیر کرکے بیٹھی تھی۔افلاق سے سُن سُن کرروز

متاثر تھی کہ علم کا گہوارہ ہے یہ بازار۔ پھر ایک دوپہر میں آرام کرنے کی بجائے اُسے دیکھنے نکل پڑی کہ مسجد اس کے ہمسائے میں تھی مگر ال شابندر کافی گھر نہ دیکھ سکی۔ آج افلاق اس تاریخی کافی ٹی ہاؤس میں لے آیا تھا جسکی کھڑکیوں سے دجلہ لشکارے مارتا ہے۔

دومنزلہ عمارت بالکونیوں اور آہنی چھجے دار شیڈوں کے ساتھ کونے پر گولائی کی صورت پھیلی ہوئی تھی۔

دیوار کے ساتھ جڑی سیٹیں، چوبی ڈیزائن دار خم کھاتے صوفے آمنے سامنے دھرے، اُن پر بیٹھے دل کش عراقی مرد کہیں پینٹ قمیضوں اور کہیں توپ میں ملبوس اخبار پڑھتے، کہیں قہوہ پیتے، کہیں کونے میں نرد کھیلتے نظر آئے تھے۔

جب ہم داخل ہوئے۔ افلاق نے باآواز بلند" الباکستان الباکستان" کی تکرار کرتے ہوئے عربی میں یقیناً میرے متعلق کچھ کہا ہوگا۔ میں نے دیکھا تھا پورا کمرہ جیسے متوجہ ہوکر میرے چہرے پر جم گیا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے انگریزی میں اپنے بارے بتایا۔

بیٹھنے کے تھوڑی دیر بعد چھوٹی سی نفیس پلیٹ میں دھری قہوے کی گلاسی پیش کی گئی جو درمیان سے کسی نازنین کی پتلی کمر کی طرح بل کھاتی تھی۔

باتیں شروع ہوئیں۔ ظاہر ہے صدام ہی کی بابت پہلی بات ہوئی۔

کونے سے ایک نوکیلی آواز ابھری۔" ارے اُس نے تو اگلے سوسال بھی ہماری جان نہیں چھوڑنی تھی۔"

"مگر اب کیا ہورہا ہے؟" میں نے بھی فوراً سوال داغ دیا تھا۔

میرے قریب بیٹھے ایک نوجوان نے پل نہیں لگایا اور فی الفور بول اٹھا" اب جو ہورہا ہے یہ اِن حرامزادوں کی بدنیتوں کی وجہ سے ہُورہا ہے۔ کب تک یہ خانہ جنگی کا بازار

گرم رکھیں گے۔ایک دن تو انشاءاللہ ایسا آئے گا ہی جب لڑتے مرتے ایک دوسرے کا گلا کاٹتے اِن عقل کے اندھوں کو سمجھ آجائے گی ۔اُس بد بخت کے زمانے میں تو آپ ہمہ وقت سولی پر لٹکے رہتے تھے ۔سگے رشتوں تک اعتماد نہیں رہا تھا۔''

میرے سامنے بیٹھے ایک عمر رسیدہ شخص نے متانت سے کہا تھا۔''سچی بات ہے ہم اگر صدام کی دفع دوری چاہتے تھے تو ہمیں یہ کب گوارہ تھا کہ یہ منحوس آکر ہمارے سروں پر بیٹھ جائیں ۔مگر کیا کریں جی ذلیل حکمران کی حماقتوں نے ہمیں یعنی عام آدمی کو تو مروا دیا نا۔''

میرے عقب سے ایک بھاری سی آواز سنائی دی۔

میں نے رُخ پھیر کر دیکھا سُرخ وسفید سا بوڑھا بڑی شستہ انگریزی بول رہا تھا ''میں الرشید سٹریٹ میں ایک قدیمی سیلون کا مالک ہوں۔امریکی سپاہی میرے ہی سیلون میں باقاعدگی سے آتے ہیں مگر کیا مجال کہ وہ ہتھیار اپنے جسموں سے پل بھر کیلئے الگ کریں۔بے شک کٹنگ خراب کروالیں ۔نہ انہیں ہم پر اعتماد ہے اور نہ ہی ہمیں اُن پر۔وہ بھی ڈرتے ہیں کہ اُسترے بلیڈ سے کھیلتے کھیلتے ہم کہیں انہی سے اُن کا گا نا نہ کاٹ دیں اور ہم بھی خوف زدہ رہتے ہیں کہ گودوں میں رکھی بندوقوں کا رُخ پل جھپکتے میں ہماری طرف نہ ہو جائے۔''

ایک اور نے لقمہ دیا۔''انہوں نے صدام کو تو ہٹا دیا مگر ملک برباد کر دیا ۔وہ ہمارے لئے نہیں اپنے مقاصد کیلئے آئے ہیں۔اور ساتھ ہی گالیوں کی بوچھاڑ تھی ۔وہ ہمیں آزادی دلانے نہیں بلکہ حملہ آور بن کر ہمارا تیل لوٹنے آئے ہیں۔''

ایک اور آواز گونجی تھی۔''صدام شیعاؤں کا تخم مارنا چاہتا تھا اور یہ شیعاؤں کو آگے رکھ کر ان کے کندھوں سے بندوقیں چلوا رہے ہیں۔سُنی شیعہ فسادہی ان کی ترجیح ہے۔''

آوازوں میں سے ایک اور آواز ابھری تھی ۔ ''چھوڑیئے آپ تو جہاں سے آئی ہیں وہ بھی ایسے ہی حالات کا شکار ہے۔

میں نے فوراً اس آواز کی طرف توجہ کی تھی اور مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ''آپ نے کتنی صحیح بات کی ہے۔ یہ درد تو مشترکہ ہے۔''

پھر جیسے جسم و جان میں رچے ہوئے گھلے ہوئے دردوں میں سے کچھ کراہیں باہر نکلیں۔ آغاز میں اکثریت کا خیال تھا کہ ان کے ملک پر امریکیوں کا قبضہ بہت فائدہ دے گا۔ ان کے پاس بہت دلائل تھے۔ مگر اب سبھوں پر حقیقت آشکار ہوگئی ہے۔ لوگوں کو اپنے خاندانوں کے مالی حالات خراب ہونے، لوڈشیڈنگ، صاف پانی، فیول، صحت اور تعلیم جیسے مسائل کے تباہ ہونے کا دُکھ ہے۔

قہوے کی دوسری پیالی میرے ہاتھوں میں تھما دی گئی تھی۔

ابھی پہلا گھونٹ حلق سے نیچے اُترا تھا جب ایک نغمہ بار سی آواز تیز پھوار کی سی صورت میں مجھے بھگوئے بغیر میرے سر پر سے گزرنے لگی۔ کمرے کی کشادہ کھڑکیوں کے شیشوں میں سے دو ہاتھ پرے بہتا دجلہ میری بصارت کو تا حد نظر پھیلی نقرئی کرنوں جیسا لگا تھا اور کونے میں بیٹھا دلبر سا نوجوان میری سماعتوں میں رس گھولتا تھا۔ لوگ متوجہ تھے۔ میں نے جاننے کیلئے ملتجی نظروں سے افلاق کو دیکھا تھا۔ اُسنے ترجمہ کیا۔

یہ مشکل وقت ہے، یہ کٹھن گھڑی ہے عراقی قوم کیلئے۔ مگر ہمیں فخر ہے صدام کے وزیر خارجہ طارق عزیز پر جس سے اُس چھچھورے امریکی وزیر خارجہ جیمز بیکر نے جینوا کانفرنس میں نخوت اور تکبر بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''امریکہ کی بات نہیں مانو گے تو بموں کی ایسی بارش عراق پر برسے گی کہ پتھر کے زمانے میں پہنچ جاؤ گے۔''

طارق عزیز نے کمال بردباری سے کہا تھا۔

''جناب عراق کی تاریخ چھ ہزار سال پرانی ہے۔ہم سینکڑوں بار پتھروں کے زمانوں میں پہنچے ہیں اور ہر بار ایک نئے حوصلے، نئے عزم اور نئے جذبہ تعمیر سے سرشار پھر اپنے پاؤں پر کھڑے ہوگئے ہیں۔آپ دوسو سال تاریخ کے مالکوں کو ہماری کیا سمجھ آئے گی؟''

مجھے اپنا حاکم وقت یاد آیا تھا۔پتھر کے زمانے میں پہنچانے کی دھمکی پر اُس کا ردِّعمل ''یس سر'' کی صورت میں تھا۔

"یس سر" کہنے والے بھی خون میں لت پت اور "نو سر" والے بھی لہولہان۔میں چھوٹی سی عقل کی مالک کیا تجزیہ کروں۔میں دیواروں کو دیکھتی تھی۔عراق کی جدوجہد کی تاریخ بلیک اینڈ وائٹ تصویروں کی صورت فریموں میں قید وہاں ایک ترتیب سے لگی ہوئی تھی۔ کچھ غم کتنے سانجھے ہوتے ہیں۔

پھر جیسے دو تین منچلوں نے گیت گانا شروع کر دیا۔مجھے بے اختیار نیلم احمد بشیر یاد آئی تھی۔ایسی ہی منچلی سی، کہیں خاص، کہیں عام کسی بھی جگہ وہ تان کیا اٹھاتی سیما پیروز اور حزیں انجم جہاں اور جیسی ہیں کی بنیاد پر فوراً اُسکی ہم آہنگ ہو جاتیں۔وہ سماں بندھتا کہ محفل شرابور ہو جاتی۔

کچھ ایسا ہی حال یہاں تھا۔میں سمجھ نہیں رہی تھی مگر ماحول میں جو ترنم اور درد سا گھلا ہوا تھا۔وہ سمجھ نہ آنے کے باوجود محسوس ہوتا تھا۔افلاق انگریزی میں مجھے بتا رہا تھا۔یہ بغداد کا نوحہ ہے۔میں بغداد ہوں۔میرا نام بغداد ہے۔افلاق نے مجھے اگلے دن اِسکا انگریزی ترجمہ دیا۔پڑھئیے اِسے۔

My name is Badhdad

In my palaces of black gold and Precious stones

The Tigris River used to flow on the crystle slabs

A thousand caliphs used to jostle to be on my cards

They called me the city full of grace

Oh! God time passes by so fast

They called me the capital of light

Oh! God how every thing disappears

My name is Baghdad

And i fell under the fire of the tanks

A defaced princess Scheherazade

Forgot me Forgot me

I live on my lands

As a poor beggar under the bulldozers

اور جب میں وہ وہاں سے اٹھی تھی میرے اندر نے بے اختیار کہا تھا۔ ''پروردگار کب اِن راندہ درگاہ قوموں کو حیات نو ملے گی۔ کب؟ کب میرے مولا۔

پیدل چلتے ہوئے قدیمی شہر کے گلی کوچوں سے گزارتے، عراقی اپر کلاس کے پچھے دار بالکونیوں کے طرحدار ڈیزائنوں اور انگوروں کے خوشوں کی طرح ساتھ ساتھ جڑے گھروں کو دکھاتے افلاق مجھے ایک ڈھابہ قسم کے ریسٹورنٹ میں لے آیا تھا جہاں جگر اور دل گرل کیلئے کبابوں کی صورت کھاتے ہوئے میں نے بہت لُطف اٹھایا تھا۔

باب نمبر: 21

1۔ **سوق ال سفافیر میں تانبے اور پیتل کی چمک سے لشکارے مارتی دکانیں اور ٹھک ٹھک کی آوازیں آپ کو ایک حیرت انگیز مانوس اور پُرمسرت تجربے سے ہم کنار کرتی ہیں۔**

2۔ **خان مرجان رشید سٹریٹ کا ایک بے مثل تحفہ جس کی پشت پر لمبا تاریخی سلسلہ بندھا ہوا ہے۔**

3۔ **صدام نے گلی کوچوں اور چوراہوں کو نیا رنگ و آہنگ دینے کی بھرپور کوشش کی تھی۔**

چور نالوں پنڈ کاہلی۔شاپنگ کے بارے میں میرا اور افلاق کا وہی حال تھا۔شام ڈھلے وہ ضرور کہتا۔

''ایک چکر لگا لیجیے۔کچھ خریدنا نہیں آپ کو۔بغداد کی کوئی سوغات،کوئی سووینیر تو لے لیں۔چلیے سوق الغزل چلیے،سوق الجدید میں خوبصورت چیزیں ہیں۔رواںڈسٹی کی دُکانیں دیکھیے۔وہ بہت سستی ہیں۔''

ایک دوبار میں نے اُسے بتایا بھی کہ مجھے ہر ملک کے پرانے شہر اور اس کے بازاروں سے بس دیکھنے کی حد تک دلچسپی ہے۔اور وہ میں تمہارے ساتھ تھوڑے،بہت ہر روز دیکھ ہی رہی ہوں۔ہاں ایک بار میں نے انہیں اکیلے بھی دیکھنے ہیں۔مجھے اپنے دل کا رانجھا راضی کرنا ہے۔پیچ در پیچ پھیلے اِن سلسلوں میں خود ہی مجل ہو ہو کر کہیں رکتے،کہیں پوچھتے،

کہیں کچھ کھاتے پیتے ،دوکانداروں سے گپیں ہانکتے ،اوٹنگیاں بوٹنگیاں مارتے لُطف اٹھانا ہے۔اب اجنبی دیسوں کا بیٹے جیسالڑکا ساتھ ہوتو کہیں شرم دامن تھام ہی لیتی ہے کہ اے ہے بچہ کیا کہے گا؟''

دوپہر کی تپتی ساعتوں میں اُس نے مجھے صدر رخاماں کی مسجد میں چھوڑنا چاہا تھا۔مگر میں مانی نہیں ۔شارع المستعصر پر اُس نے مجھے خدا حافظ کہا۔سچ تو یہ تھا کہ میں نے لمبی سانس بھرتے ہوئے اپنے اندر ھمکتی ایسی خوشی محسوس کی تھی کہ جو کسی قیدی کونصیب ہوتی ہے۔اصل میں میں ہمیشہ سے سہاروں کے بغیر چلنے کی عادی ہوں ۔یہاں مجھے حالات کی نزاکت نے جکڑلیا تھا۔

چلوخیر میں چندلمحوں کیلئے ایک دکان کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔مجھے کچھ نہیں خریدنا تھا۔نہ کوئی کپڑا نہ کوئی جیولری۔جیولری تو ساری زندگی نہ پہنی نہ رغبت رکھی۔بیٹی اور بہوؤں کے لئے کبھی چکروں میں نہیں پڑی۔ایک بار یہ حماقت کی تھی۔منہ سے تو نہ پھوٹیں پر چہروں نے لاؤڈ سپیکر پر جیسے چڑھ کراعلان کیا تھا۔

''ارے یہ کیا اماں بے ہودہ سی چیزیں اٹھا کر لے آئی ہیں ۔ان سے تو اچھی ہماری لبرٹی میں ملتی ہیں ۔''

وہ دن اور آج کا میں نے ایسی حماقت دوبارہ نہیں کی ۔یوں بھی میں اُن ماؤں میں سے نہیں ہوں جواپنے بچوں کے بارے بڑھ بڑھ کر باتیں کرتی ،تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملاتیں ،ان کی قابلیتوں اور فرمانبرداریوں کی یاوہ گوئیاں کرتی ،پھر آگے اُن کے بچوں کے بیچ میں ہلکان ہوتی اور ہر نئے ملنے والے کوانکی معصومیت اور ذہانت کی داستانیں سُناسُنا کر بور کرتی ہیں۔

افلاق میرے لیئے بہت اہم تھا۔میں اُسے سُنتی تھی ۔اُسے شادی کا کہتی اور دل

میں یہ عہد کرتی کہ اُس کی شادی پر اگر زندہ رہی تو انشاء اللہ ضرور آؤں گی اور وج گنج کے آؤں گی۔

شہدا اور احرار پل کا درمیانی سارا علاقہ مارکیٹوں ،بازاروں سے بھرا پڑا ہے۔مغربی سمت حیفہ سٹریٹ کے ساتھ سوق الجدید اور مشرقی سمت سوق الغزال ہے۔یہ سارا علاقہ بہت اہم۔شیرٹن فلسطین،پام بیچ اور الرشید جیسے بہترین ہوٹل ،ریسٹورنٹ ، کیفے ،نائٹ کلب ،کسینو اور شاپنگ پلازوں کا جال بکھرا ہوا ہے۔اس کی راتیں جوان رہتی ہیں۔رنگ رنگیلی دنیا ئیں آباد ہیں۔جنگ کی تباہ کاریوں کے اثرات نظر آتے ہیں تاہم زندگی اپنی توانائی کے ساتھ سرگرم بھی ہے۔

یہاں زندگی مسکرا رہی تھی ۔رواں دواں تھی ۔مسکراہٹیں ،باتیں ،قہقہے اور شوخیاں تھیں ۔قہوے پکتے تھے ۔خوشبوئیں بکھرتی تھیں ۔

بغدادی چہرے کے بہت سے دلکش لینڈ مارک ہیں ۔جن میں سے ایک اہم الرشید سٹریٹ بھی ہے ۔بغداد کے ڈاؤن ٹاؤن کی جان جسکی پشت پر تاریخ بندھی ہوئی ہے کہ عثمانیوں سے ناطہ جڑا ہوا ہے جو سولہویں صدی سے اس کے حکمران تھے۔بہت سے ناموں کے چولے اس نے پہنے اور اُتارے ۔کبھی شارع النہر کہلائی اور جب انگریز بغداد اور میسوپوٹیمیا پر قبضہ کرنے اینگلو انڈین سپاہیوں کے ساتھ آئے تو خلیل پاشا نے انہیں بڑی ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا اور یادگار کے طور پر Real street بنانے کا عزم کیا۔پہلا نام Jaddi Si دیا گیا۔کئی ناموں کے بعد اب یہ الرشید سٹریٹ ہے ۔اس سٹریٹ میں جا کر احساس ہوتا ہے کہ جیسے یہ ایک Random Society کی نمائندہ ہے۔

خوبصورتیوں ،بدصورتیوں ،شاندار بلند و بالا عمارات کے جلو میں خستہ حال ٹوٹی

چھوٹی کہنہ سال بلڈنگز،امیر ترین لوگوں کے پہلوؤں میں غریب ترین لوگ۔قہوہ کیفوں میں بیٹھے قہوہ اڑاتے ،آئس کریم باروں سے آئس کریم خریدتے اور کھاتے لوگوں کے ہنستے مسکراتے چہرے۔رشید سٹریٹ اس کے ساتھ اگلی اہم شاہراہ خلیفہ اور سیدون Sadoon سٹریٹ ہیں۔یہاں بازاروں کی بُھول بھلّیاں تھیں۔ایک کے اندر سے دوسرا بازار نکلتا تھا۔محرابی صورت والے، چھتے ہوئے، جہاں اس گرمی اور تپش کا اثر نہیں تھا جو میں باہر جھیلتی آئی تھی۔میرے قدیم شہر کے بازاروں جیسے رنگ محل کے سینے سے کناری بازار نکلے اور کناری بازار کے پیٹ سے چھتہ بازار برآمد ہو۔چھتے بازار کی دم سے کُٹی بازار اور آگے یہ پیچ در پیچ سلسلہ لوہاری دروازے میں گم ہو کر ماڈرن انارکلی میں جا نکلے۔

بزازین مارکیٹ میں داخل ہوتے ہی اپنائیت کی خوشبو سارے میں مہکنے لگی۔منظر دلّی دروازے والا تھا۔تھانوں سے سجی دکانوں کے سامنے پڑے سٹول پر بیٹھنا اور کپڑوں کو دیکھنا اچھا شغل تھا جو میں نے کیا اور لطف بھی اُٹھایا۔کھجور کے پتوں سے بنی آرائشی اشیاء ٹوکریاں ،شاپنگ بیگز ،روٹیوں کے چھابے ،ڈورمیٹ چٹائیاں ،ہیٹ ڈھیروں ڈھیر چیزیں جنہیں دیکھنا دلچسپ اور لے جانے کا تصور مشکل ترین۔

پھر یونہی گھومتے گھماتے میں ایک ایسے بازار میں داخل ہوگئی جس نے مجھے حیرت زدہ سا کر دیا تھا۔میں دم بخود کھڑی تھی۔یہ میرے لاہور کے کیسرا بازار کا منظر بھی نہیں تھا کہ وہاں بھی اب پیتل ،تانبے اور ظروف سازی کا کام فیکٹریوں میں ہوتا ہے۔یہ میرے ماضی کا منظر تھا۔رنگ محل کے کیسرا بازار کا۔میں ماضی کے حقیقی منظروں میں گھری کھڑی تھی۔یہ سوق الصفافیر Souq-Al Safafeer بازار تھا یا دوسرے لفظوں میں کاپر انٹک (Copper Antiques) مارکیٹ تھی۔

ٹھک ٹھک کی آوازیں سارے ماحول میں بکھری ہوئی تھیں۔پیتل کی آرائشی

اشیاء سے سجی دو کانوں میں پرانے روایتی طرز پر کام ہوتا تھا۔کہیں اوزاروں سے برتنوں اور ڈیکوریشن اشیا کی صورت گیری کی جارہی تھی ۔رنگ وآہنگ کا ایک جہان سامنے تھا۔

کہیں نقاشی کا سامان بکھیرے کرسیوں پر بیٹھے اوپن سٹوڈیو کا منظر اپنے اردگرد بکھرائے یہ فنکارلوگ دنیاجہاں سے غافل کام میں ڈوبے ہوئے نظر آتے تھے،کہیں زمینی فرش پر گدیاں بچھائے ،اوزاروں سے لڑتے کاریگران میں اُلجھے ہوئے ملتے تھے۔ہمارے ہاں کے لوگوں کی طرح نہیں کہ گندے مندے کُھلیوں میں بیٹھے ہیں۔پینٹ قمیضوں میں بابو بنے ٹھک ٹھک کرتے اور فر فر انگریزی بولتے تھے۔

پیتل اور تانبے کی چمک سے لشکارے مارتی دوکانیں جو آپ کو عجیب پر مسرت سے تجربے سے دوچار کرتی ہیں جسے محسوس کرنا تو آسان پر بیان کرنا مشکل۔کہیں مجھے محسوس ہوتا جیسے میں قوس قزح کے دھنک رنگ بادلوں کے حصار میں ہوں۔کہیں طلائی کرنوں کی چمک میں چہار جانب سے گھری ہوئی ہوں۔سامان سے بھری دوکانیں جنکی ڈیزاین کاری،مینا کاری،نقاشی نے انہیں قابل دید بنا رکھا تھا۔دیواروں پر سجی ڈیکوریشن پلیٹوں کی ورائٹی کا کوئی شمار نہ تھا۔چھوٹا بڑا ہر سائز نظر آتا تھا۔اُف ایک پُرفسوں ماحول ۔فانوس ٹیبل لیمپ بڑے چھوٹے ۔عرق گلاب کی گل پاشیاں اور جانے کیا کیا چیزیں تھیں ۔مجھے چند ایک کے سوا کسی کے نام اور مصرف کا علم نہ تھا اور وہ بھی میرے اپنے حساب سے تھے۔کتنے درست اور کتنے غلط ۔ان کی تصحیح میں نہیں پڑی۔یہ چکر تو بڑا مہنگا پڑتا۔دوکانداروں سے کتنا کچھ پوچھتی ۔بتاتے بتاتے وہ بھی عاجز آجاتے ۔سماوار تو چھوٹا سا ضرور خریدنے کو جی چاہا مگر لے جانے کا ایک مسئلہ۔

ایسے ہی گھومتے ٹوہ لیتے ایک دوکان پر بیٹھے چند لڑکوں نے سیدون سٹریٹ Sadoun st کا کہا کہ فوک لور سنٹر پر پورے ملک کی انتہائی خوبصورت ہنڈی کرافٹ

دستیاب ہیں۔عراق کا کلچر وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔سیدون سٹریٹ نزدیک ہی تھی جانتے ہوئے بھی میں نے پوچھا تھا۔کتنا چلنا ہوگا؟ زیادہ نہیں تھوڑا سا۔بس کرادا جنکشن کے پاس۔اب کرادا جنکشن کہاں ہے؟ جیسا سوال سامنے آیا۔میں نے دل میں کہا دفع کرو۔کہیں تو ہوگا ہی نہ نظر آ گیا تو ٹھیک اب کیا اس کے پیچھے بھاگتی پھروں۔

عورتوں سے متعلق چیزیں بے شمار تھیں۔بازار کے اختتام پر سونے اور سلور کی خوبصورت روایتی جیولری کی دوکانیں بھی ہیں۔جس کیلئے میں ایک دو دوکانوں میں ضرور گئی۔پھر کہیں رکتی کہیں چلتی سوق الغزل Souq-ul-Ghazel جا پہنچی۔یہاں بغداد کا قدیم ترین مینار تھا۔جو جانے کتنی صدیوں سے کھڑا ہے۔1258 میں ہلاکو خان کے حملے میں مسجد تو شہید ہوگئی تھی۔مینار ہلاکو کے بیٹے اباگا نے Abagha نے بنایا۔

جمہوریہ سٹریٹ سے خلیفہ سٹریٹ میں اُتری۔بلند و بالا عمارات کے ہمسایوں میں بستی پستہ قامت عمارتوں کے رنگ برنگے تعمیری انداز کو دیکھتے سڑک پر گاڑیوں کے اژدہام سے گزری۔

میں الف لیلیٰ کی اُن کہانیوں میں کھونے کی خواہش مند تھی جنہیں پڑھتے پڑھتے میں بوڑھی ہوگئی تھی۔

تو یہ خلیفہ سٹریٹ یا Caliphs سٹریٹ ہے۔اِسے دیکھتے ہوئے چلتے چلتے میں نے رومن کیتھولک چرچ کو دیکھا۔1866 میں بنا ہوا یہ چرچ کہنہ سالی کا شکار تھا تھوڑی دیر کیلئے اندر گئی سینٹ تھامسن کے نام پر ہے۔بہت سے مجسمے تھے۔بہت ساری پینٹنگز تھیں۔ساتھ ہی Pets مارکیٹ تھی۔وہاں سے میں نے فوراً پلٹا کھایا۔مجھے کتے ،بلیوں،طوطوں، میناؤں اور کبوتروں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔گول چکر سے مڑی تو داہیں ہاتھ عباسی پیلس تھا۔میں نے پہچان کر رُخ بدل لیا تھا۔

المتنابی سٹریٹ Al-Mutanabbi Street اور سوق السرائے کو چوتھی بار دیکھ کر بھی مزہ آیا تھا۔ دونوں اپنے اپنے چہرے مہروں سے خوبصورت اور خاصے کی چیزیں تھیں۔ کتابوں اور سٹیشنری کا پھیلا ہوا کاروباری سلسلہ پورے عروج پر تھا۔ مجھے تو یوں لگا جیسے میں سکردو کے درّہ سدپارہ میں سے گزر رہی ہوں۔ چھت اگر ہوتی تو یقیناً کسی سرنگ کا شائبہ ہوتا۔

یہاں بیٹھ کر قہوہ پینے اور کنف کھانے کا مزہ ایسا ہی تھا جیسے میں پیسہ اخبار میں کسی تھڑے پر بیٹھ کر گرم گرم گلاب جامن کھایا کرتی تھی۔

میرے لیے دجلے کے کنارے پر مقامی رنگ لیے ایسے ہوٹل دیکھنا بہت خوش کن تجربہ تھا۔ جن کے کشادہ یارڈ میں پھول ہنستے تھے۔ جن کے فرش چمکتے تھے۔ جن کے فواروں میں موتی اچھلتے تھے۔ جن کی سیڑھیاں دجلے کے پانیوں میں اترتی تھیں۔ دجلہ کے کناروں پر لوہے کی سفید جالیوں سے سفید مقید کیے ہوئے حصّوں میں مصوروں کے مقامی لوک کردار حسین رنگوں میں ڈوبے کہیں تجریدی آرٹ اور کہیں سادہ فنکاری میں ڈوبے آنکھوں کو سیراب کرتے تھے۔ چوبی بنچوں پر بیٹھ کر گھنٹوں دجلہ کو دیکھو۔ میں وہیں بیٹھی اور ساری تھکن کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹوں میں اُتاری۔

میں شدید تھک چکی تھی۔ میرے خیال میں تھکنے سے زیادہ نفسیاتی طور پر اس محاورے کا شکار ہوئی تھی کہ گڈی دیکھ کر پاؤں بھاری ہو جاتے ہیں۔ مجھے بھی معلوم تھا کہ میں جیب سے موبائل کی طلسمی انگوٹھی کو رگڑوں گی تو افلاق جن کی طرح میرے سامنے حاضر ہو جائے گا۔ اور ایسا ہی تھا کہ وہ آ گیا تھا۔

حمورابی Oblisk دیکھی۔ سنگ مرمر کی اس بلند و بالا چہار پہلو ستون نے چوراہے کو سجا رکھا تھا۔ بابل کا عظیم بادشاہ حمورابی دنیا کا پہلا قانون ساز جس کے دو سو بیاسی

مکا تیب آج بھی قانون دانوں کو حیرت زدہ کرتے ہیں۔

افلاق کہتا تھا اصل آبلسک تو فرانس کے عجائب گھر میں ہے۔اُس پر وہ قوانین کندہ تھے اور یہ مندر کے احاطے میں نصب تھا۔گردش زمانہ میں یہ ہزاروں سال گم رہا۔کھدائیوں کے دوران فرانسیسیوں کو ملا۔جنہوں نے فی الفور اسے لوور Louvre پہنچا دیا۔یہ اُس کی نقل ہے۔

صدام نے گلی کوچوں اور چوراہوں کو تاریخی اعتبار سے نیا رنگ و آہنگ دینے کی پوری کوشش کی ہے۔الرشید سٹریٹ پر کئی بار گزرتے ہوئے میں نے مرجانہ مسجد کو دیکھا تھا۔کبھی شام کے سانولے سے رنگوں میں اس کا لٹا لٹا سا مٹیالا حُسن اتنی رومانیت لیے ہوئے ہوتا کہ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دل میں عجیب سی پیاس اور مرعوبیت محسوس کرتی کہنہ سالی اس کی پور پور پر بکھری ہونے کے باوجود مجھے اچھی لگتی تھی شاید اس کے پس منظر کی تفصیل سے اس کے در دیوار پر بکھری اس کی عظمت کو اندر کی آنکھ محسوس کرتی تھی۔جس نے اِسے صدیوں علم بانٹنے پر مامور رکھا تھا۔1357 میں امیر الدین مرجان نے تعمیر کیا تھا۔تب عباسیوں کے شاندار عہد کو ختم کرتے ہوئے ایک صدی گزر چکی تھی۔آغاز میں یہ مستنصریہ جیسا ہی تھا بعد میں مسجد میں بدل دیا گیا۔

بالمقابل خان مرجان ہے۔رشید سٹریٹ کا ایک بے مثل تحفہ۔کل کے مرجانہ سکول کے عالموں اور طلبہ کی اقامت گاہ جسے منہدم ہوتے ہوتے بچالیا گیا۔1935 میں از سرنو اس کی تعمیر ہوئی۔اور اِسے عرب نوادرات کے ایک میوزیم کی شکل دی گئی۔آج کل یہ فرسٹ کلاس ریسٹورنٹ ہے۔

سچی بات ہے میں تو اس کی تعمیری ساخت دیکھ کر گنگ کھڑی تھی۔ساری تعمیر ایک ہال کے گرداگرد ہے جس کی اونچی محرابی ڈیزائن کاری سے سجی چھت کو دیکھنے کیلئے گردن کو

انتہائے پشت پر پھینکنا پڑتا ہے۔اوپر کی منزل کے کمروں کیلئے پورے ہال کے چاروں طرف آہنی گرل سے سجا راستہ ہے جہاں سے ہال کا نظارہ حد درجہ دلچسپ ہے۔اینٹ سے بنی اور سجی یہ محرابیں کس قدر حسین اور طلسمی سا ماحول پیدا کر رہی تھیں کہ بیان کرنا مشکل ہے۔ہال میں تیز موسیقی کا طوفان سا بکھرا ہوا تھا۔عراقی لوگ میزوں پر بیٹھے کھانے پینے میں مصروف تھے۔ایک بے حد دلکش رومان پرور ماحول جو آپ کو کہیں بہت دور ماضی میں لے جاتا ہے۔

باب نمبر:22

1۔ امام ابو موسیٰ کاظمین کا دربار میدان جنگ بن گیا تھا۔

2۔ دمشق، حلب، حمص، بغداد اور بابل جیسے قدیمی و قیمتی شہر کیمرے میں بند تھے۔

3۔ نجف اشرف ایرپورٹ تو جیسے امریکیوں کے ہاتھوں یرغمال ہوا پڑا تھا۔

میری آنکھوں سے برستے آنسو کسی اچانک طوفانی بارش کی ہی طرح تھے جن کی تیز رفتار لڑیوں میں سے میں نے اپنے چاروں طرف دیکھتے ہوئے سسکی بھری تھی۔ ”سارا ماحول تو بھریا میلے کا سا ہے۔ میرے لیے کیوں قیامت پھٹ پڑی؟ آخر میرے لیے ہی کیوں؟“

میرا وجود جل رہا تھا جیسے پگھلتا سیسہ کسی نے میرے اندر انڈیل دیا ہو۔ صبح تو بڑی خوشگوار سی تھی۔ کسی ہونی کا تو دور دور تک پتہ نہ تھا۔ کسی ناگہانی افتاد، کسی غم انگیز پریشانی کسی متوقع صدمے کی آمد سے پہلے جیسے اس کی پرچھائیاں سی دل میں، طبیعت میں، کوئی اضطراب، کچھ گھبراہٹ، کچھ بے چینی کی سی کیفیات پیدا کرتی ہیں۔ میرے ساتھ تو ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں تو اب بڑے خوش و خرم سے موڈ میں تھی کہ بس جانے کے دن آ گئے ہیں۔ سومنات کا قلعہ میں نے فتح کر لیا ہے تو پھر یہ کیا ہوا؟ یہ چھل پیریاں کہاں سے نکل کر اپنے منحوس سایوں سے میرا خانہ خراب کرنے آ گئیں۔

میرے گرد لوگوں کا ہجوم تھا۔ زمین پر پھسکڑا مارے بازوؤں کے ہالے میں چہرہ لیے میں رو

رہی تھی اور پنڈولم کی طرح میرا وجود ہلکورے کھاتا تھا۔

''کی ہویا تینوں'' (تمہیں کیا ہوا ہے؟)

میرے بازوؤں پر جھٹکے انداز میں پڑتے دباؤ اور تشویش زدہ لہجے میں بولا جانے والا یہ سہ لفظی جملہ سر اٹھا کر نہ دیکھنے کے باوجود مجھے بتا گیا تھا کہ یہ پاکستانی زائرین خواتین ہیں۔ میں تو دکھ کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی۔ سر اٹھائے اور کچھ بولے بغیر ہاتھوں کو جھٹک دیا تھا کہ یہ ہمدردیاں میری جان کو مزید جلا بُھن رہی تھیں۔

تو درمیان میں بات کیا تھی جس نے یہ واویلا مچا دیا تھا۔

بات تو چھوٹی سی تھی۔نظر انداز کر دی جانے والی، پر اچانک ہی بہت بڑی بن گئی تھی۔

امام ابو موسیٰ کاظمین کے مزار کی تصویر کشی باقی رہ گئی تھی۔سوچوں میں تھی کہ اُسے بھی نپٹانا ہے اور آج شام بغداد سے رُخصت ہونا تھا تو صبح سویرے یہاں آ گئی تھی۔چھوٹی موٹی چوریاں کرنے کی میں عادی ہو گئی تھی۔چھوٹا سا کیمرہ ہاتھ میں پکڑ کر عبایا کی جیب میں گھسیڑ لیتی اور چیکنگ کے پُل صراطوں سے گزر جاتی۔

ابھی تو میں اندر جانے کیلئے قطار میں بھی نہیں لگی تھی۔ابھی تو خیمہ تنی چھوٹی سی چیک پوسٹ سے قدم باہر نکالا ہی تھا۔ابھی تو میں نے اس تاثر کو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرنے کی خواہش میں کہ دیکھو صبح صبح ہی کتنی لمبی قطاریں لگ گئی ہیں اور لیڈی چیکرز کتنی مستعد ہیں کو قید کرنے کی خواہش میں شاید ایک یا دو بار کلک کیا ہی تھا۔

معلوم ہی نہیں ہوا؟ کہ کیسے ایک خونخوار چیل کی طرح دو ہاتھ اور ریلا ہوا ایک وجود مجھ پر جھپٹا۔چند لمحوں کے لیے میں بھونچکی سی ہوئی۔شاید ایسی صورت کا کہیں گمان تک نہ تھا۔وہ جھٹتی میرا کیمرہ چھیننے کی کوشش میں اور میں اُسے بچانے کی تگ و دو میں۔جانے وہ کیا اول فول بک رہی تھی اور میں گھگیاتے ہوئے شور مچا رہی تھی کہ ''غلطی ہو گئی۔معافی

معافی''

بڑا اجی دار مقابلہ تھا۔زمین پر گرنے کے باوجود میں نے اپنی گرانقدر متاع کیمرہ اپنی چھاتی سے چمٹا رکھا تھا اس بے بس عورت کی ممتا کی طرح جس کے محبوب ترین بچے کو موت جھپٹا مار کر چھین لینا چاہتی ہو۔پرانی اساطیری کہانیوں کے طوطے کی طرح میری تو جان اس کیمرے میں تھی۔دس بار پرس کھول کر دیکھتی کہ اندر کیمرا موجود ہے۔افلاق تک تو بھروسے میں شامل نہیں تھا۔دمشق،حلب اور حمص اسمیں قید تھا۔بغداد اور بابل کی تو بات ہی کیا۔

پھر یوں ہوا کہ اُسنے اپنی ایک ساتھی کی مدد سے میری کلائی کو زوردار جھٹکا دیتے ہوئے میری بند مٹھی کے پنجرے سے میرا طوطا نکال لیا اور اپنے پلے ہوئے وجود کی پوری طاقت سے زمین پر پھینکتے ہوئے اس کی گردن کو مڑور دیا۔

ایک دلدوز چیخ میرے حلق سے نکلی اور میں عالم وحشت میں کسی جنونی کی طرح اس پر پل پڑی۔عراقی پولیس اور عورتوں کے جتھوں نے بیچ بچاؤ کروانے والوں کا کردار ادا کرنا شروع کردیا۔میرے اندر کے غیض وغضب نے جیسے میرے وجود میں پارہ بھر دیا تھا۔ میں اس کی تکا بوٹی کر دینا چاہتی تھی۔غُرّاتے ہوئے عورتوں کے حصار سے نکل نکل جاتی تھی۔بددعائیں میرے ہونٹوں پر کوسنوں کی صورت تھیں۔میرے دل کا درد آنسوؤں کی صورت میری گالوں پر بہتا تھا۔میں اُس کا بوتھا نوچ لینے اور اُسے ائی کائی کرنے کی تمنائی تھی۔اس کی ہڈیاں کوڑے سے توڑ کر اس کو لولی لنگی کرنے کیلئے مری جا رہی تھی۔

اس لمحے میں قطعاً کسی خوف یا ڈر کی لپیٹ میں نہیں تھی کہ وہ مجھے کاظمیہ کی جیل میں بھجوا سکتی ہے۔میرے اوپر کوئی سنگین الزام لگ سکتا ہے۔میں پردیس میں ہوں۔ایک ایسے ملک میں جہاں قانون کی کوئی اہمیت نہیں۔

دونوجوان سپاہیوں نے مجھے بازوؤں سے تھام کر میرے قلب وجگر کی بوٹیاں میری ہتھیلی پر رکھتے ہوئے مجھے آنکھوں کی زبان سے شانت ہونے اور باہر جانے کو کہا۔

میں غصے سے پاگل اوندھی اس وقت یہ بُھول ہی گئی تھی کہ جو ٹکڑے اُس نے میری جھولی میں ڈالے ہیں۔اُنہیں دیکھوں تو سہی اُن میں وہ میموری کارڈ ہے بھی۔جب باہر آئی دیکھا وہ گوہر نایاب تو کہیں نہیں تھا۔اب پاگلوں کی طرح بھاگی، مگر سپاہیوں نے گرفت میں لے لیا۔گھگھیاتے ہوئے چلاّتے ہوئے کہے جاتی ہوں۔"کمبختو جانے دو مجھے میرا وہ خزانہ کہیں کسی کونے کھدرے میں نہ پڑا ہو۔" پھر جہاں طبل جنگ بجا تھا اُس کا چپہ چپہ دیکھ مارا۔دیوانوں کی طرح،آنسو بہاتے ہوئے ڈھنڈوے چلی جا رہی ہوں۔مگر اُسے نہ ملنا تھا نہ ملا۔

"میرا لٹیا شہر بھنبور نی۔" میں روضہ مبارک کے سامنے والے میدان میں کھڑی تھی۔روتی ہوئی، کرلاتی ہوئی، بین ڈالتی ہوئی۔

"بغدادیو! تم نے ایک غریب الوطن کے ساتھ کیا کیا؟ اس کی متاع ہی لوٹ لی۔وہ تو اِس شہر سے چند گھنٹوں بعد رخصت ہونے والی تھی۔"

میرا دل تھا جیسے ٹکڑوں میں کٹ رہا ہو۔

میں کبھی ہلوان دوبارہ نہیں جا سکتی۔قدرت مجھ پر جانے کیسے مہربان ہوئی تھی نادر ونایاب تصاویر۔میں نے چھم چھم بہتے آنسوؤں کو پونچھا۔کتنے پاکستانی زائرین مجھے دیکھتے اور مجھ سے پوچھتے تھے کہ مجھے کیا ہوا ہے؟ میں دھپ سے پھسکڑا مار کر زمین پر بیٹھ گئی۔سر کو گوڈوں میں گھسیڑتے ہوئے میرا وجود ہلنے لگا اور آنسوؤں کی باڑھ بہنے لگی تھی۔

کتنی گھڑیاں بیتیں، کتنی ساعتیں گزریں۔مجھے تو کچھ معلوم ہی نہ تھا۔

میرے قدموں میں دھرے میرے بیگ میں پڑے موبائل کی گھنٹیاں کتنی دیر سے بجتی رہی

تھیں اس کا بھی کوئی ہوش نہ تھا۔

میرے موبائل کی بیپ پھر بجی تھی۔سنی تو ہمارے گروپ کے لیڈر تھے۔جو کہتے تھے۔"آپ بغداد سے فلائی نہیں کریں گی۔آج کربلا پہنچ جایئے۔صبح نجف اشرف سے آپ کو جہاز پر بٹھایا جائے گا۔دراصل میرے ساتھی ایجنٹ ظفر علی کا کہنا ہے کہ آپ کو چونکہ اب گروپ سے اکیلے ہو کر سفر کرنا ہے۔بغداد ایر پورٹ پر امریکی بہت چھان پھٹک کرتے ہیں۔نجف اشرف میں اس کے تعلقات کا دائرہ زیادہ گہرا ہے۔سہولت سے آپ کی بورڈنگ ہوجائے گی۔ظفر آپ کو جہاز میں بیٹھا کر آئے گا۔"

میں یہ سب سنتی تھی۔یوں جیسے یہ میرا نہیں کسی اور کا معاملہ ہو۔میرے پاس بیٹھی چند سادہ لوح پاکستانی عورتیں مجھے تسلی دیتی تھیں۔

"پتر حوصلہ کر۔چل اپنی جان واصدقہ من۔"

بات اس کے قیمتی ہونے کی نہیں تھی۔اس کے ٹوٹنے کی بھی نہیں تھی۔کسی نقصان کی بھی نہ تھی۔بات تو اس کے اندر اس اثاثے کی تھی جو لٹ گیا تھا اور جسے دوبارہ حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔میری شکوے سے بھری آنکھیں جیسے اُس سے مخاطب تھیں۔

"واہ بھیا واہ تُو نے تو میرا تیل سے بھرا کپا ہی لنڈھا دیا۔میری تو انڈوں کی ٹوکری چورستے میں ہی پھوڑ دی۔نہ تو نے میری جھلساتی دوپہروں کی بھاگ دوڑ کی لاج رکھی،نہ تو نے میری صحرا نوردی کی آبرو بچائی۔کیسا ہوکا پڑا ہوا تھا مجھے۔کیسی ہابڑی ہو رہی تھی۔خطرہ مول لینے سے نہ ٹلتی تھی۔فلاں جگہ کے بارے میں مضمون شاندار رہنے گا۔تصویریں سونے پر سہاگہ کا کام دیں گی۔تصور میں لُطف اندوز ہوتی۔

اِس ماتمی کیفیت سے باہر نہیں آ رہی تھی جی چاہ رہا تھا۔یہیں لم لیٹ ہو کر بین ڈالوں۔ان کے سر چڑھ کر مر جاؤں۔تبھی میں نے افلاق کو دیکھا وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ تھا جو مجھے ایرپورٹ لے جانے کیلئے یہاں آیا تھا کہ میں نے اُسے یہیں آنے کو کہا تھا۔اس پر نظر پڑتے ہی دلی کیفیت فیض کے مصرعوں جیسی تھی۔

جیسے صحراؤں میں چلے ہولے سے بادِ نسیم جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

وہ آنکھوں میں اتھاہ حیرت لیے مجھے دیکھتا تھا۔پھر وہ میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔اُس کے مضطرب سے لہجے پر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔میں نے عبایا کی جیب سے اس دل کے جو ٹکڑے ہزار ہوئے تھے انہیں نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔پور پور دکھ چھلکاتی المیہ کہانی میری زبانی سُننے کے بعد وہ اٹھا۔اُس نے پولیس والے سے بات کی۔کیا بات ہوئی تیز لہجوں میں۔مجھے کیا پتہ؟مگر میں نے سوچا اَب اُسے اس چکر میں الجھانے کا فائدہ؟جو ہوا اس میں بہر حال غلطی تو میری ہے نا۔

میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔"دفع کرو۔چھوڑو۔اب کچھ فائدہ نہیں۔"مگر میرے منع کرنے کے باوجود بھی اُن دونوں نے تمام جگہوں کا کسی کھوجی کی سی آنکھ سے معائنہ کیا۔مگر سب لا حاصل تھا۔صبر شکر،میرے پاس ہی زمین پر وہ بیٹھ گئے تھے۔میں نے زمان صاحب کا پیغام اُسے بتایا۔بات کروائی۔اُسنے سمجھا اور کہا"یہ بہت بہتر فیصلہ ہے۔میں آپ کو ابھی کربلا لیے چلتا ہوں۔"

ہوٹل سے میں چیک آوٹ ہو چکی تھی۔سٹور میں رکھا چھوٹا سا اٹیچی کیس اٹھایا اور ایک بار پھر صحرا کی خاک چھاننے لگی۔

کربلا ہوٹل کے سامنے والے بازار میں ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔میں نے اُس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر آنسوؤں کی بارش میں

اُسے بھگو دیا۔میرا اندر بہت دکھی تھا۔میں اُس سے جس انداز میں رُخصت ہونے کا سوچتی تھی اب صورت بہت مختلف تھی۔صرف سوڈالر اپنے پاس رکھتے ہوئے بقیہ چھ سو ڈالر میں نے اس کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

''پاکستان اپنی دلہن کے ساتھ ضرور آنا۔تمہاری ماں وہاں تمہاری منتظر ہوگی۔زمانوں پہلے بابوسرٹاپ سے گلگت جاتے ہوئے ایک ڈرائیورفرس خان ایسے ہی میرا بیٹا بنا تھا۔جس سے میرا رشتہ آج بھی قائم ہے۔''

میری کمرے کی ساتھی خاص طور پر نسرین بہت خوش ہوئی۔''تمہارا دانہ پانی آج کا یہاں لکھا ہوا تھا۔''

میں نے پھیکی سی مسکراہٹ اپنے لبوں پر بکھیری اور رو دہ تماشہ یہاں لگانے سے گریز کیا جسے میں نے بغداد میں لگایا تھا۔یہ تو میرا دکھ تھا۔گھائل میں ہوئی تھی' کسی کو کیا؟ تصویریں ہی تھیں یا پچیس ہزار کا کیمرا۔زندگی میں نقصان کا کھاتا بھی کبھی بند ہوا ہے کہیں نہ کہیں کھلتا رہتا ہے۔رہی تصویریں تو ان کی اہمیت وہ کیا جانیں؟انہیں کیا معلوم عراق کی کتنی اہم شخصیات مجھے ملیں اور میں نے انہیں کیمرے میں بند کیا۔ تو بس چپ چاپ میں نے اٹیچی کیس ٹھکانے لگایا اور بستر پر لیٹ گئی۔آنسو میرے گالوں کو بھگونے لگے تھے' جانے کب تک بھگوتے رہے اور جانے کب نیند نے مجھے اس کرب سے نجات دی۔میں نہیں جانتی۔

بہت صبح میں رخصت ہوئی۔نوجوان سا ایک لڑکا قدرے بھاری تن و توش والا مجھے ٹیکسی سٹینڈ تک لایا۔ایک بار پھر ہائی وے پر چڑھی میں اسی صحرا سے گزر رہی تھی جس سے دو دن پہلے گزری تھی۔

پورا ائیرپورٹ جیسے یرغمال ہوا پڑا تھا۔جگہ جگہ امریکی بیٹھے، کھڑے انتظام سنبھالے ہوئے تھے۔جگہ جگہ کاغذات کی چیکنگ،پوچھ پڑتال۔مجھے یہاں تک لانے والا

لڑکا ظفر نامی لڑکے کے سپرد کر کے رخصت ہو چکا تھا۔ظفر خاصا با اثر لگتا تھا۔آخری مرحلے تک وہ میرے ساتھ رہا۔بس آگے رن وے پر کھڑے جہاز پر چڑھنے کا مرحلہ ہی باقی تھا۔
جہاز فضا میں بلند ہوا۔نجف اشرف مجھ سے رخصت ہو رہا تھا۔سنہری گنبد چمکا۔روضہ مبارک کا کشادہ صحن نمایاں ہوا ' پھر جیسے مجھے محسوس ہوا کہ صرف سنہری گنبد ہی مجھے نظر آ رہا ہے۔
میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے تھے لڑیوں کی صورت۔پھر گنبد بھی معدوم ہو گیا۔
شیرِ خدا میں تیرے دیار میں کیوں لٹی؟
کیوں لٹی؟
آنسو میرے گالوں پر پھر بہنے لگے تھے۔

بیسویں صدی کی ایک عظیم لکھاری، دلیر سیاح، ایک منفرد کردار اور بہترین منتظم جس سے میں بغداد میں ملی اور جس کی کہانی کا انجام لاہور آ کر جانی۔

The woman who made Iraq یعنی بانی عراق جیسا نائٹل اُسے عراقی عوام نے دیا تھا۔ صحرائی بدو اور علاقائی شیخ اُسے کوئین اف دی ڈیزٹ کہتے تھے۔ Shaper of the nations اور ٹی میل لارنس اف عریبیا کا خطاب اتحادی فوجوں کا عطا کردہ تھا۔ وہ کنگ میکر تھی۔ اُسے بے تاج ملکہ بھی کہا جاتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ میں تو اُس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ کہیں ایک آدھ بار رسمی سا پڑھا ہوگا تو وہ میرے حافظے میں کہیں نہیں تھا۔

پہلا تعارف بُرے سے تاثر کا حامل تھا۔ دمشق جاتے ہوئے جہاز میں ساتھ کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی چھفٹی جثی ٹیار کٹارا سے نین نقش والی دمشق یونیورسٹی میں جغرافیہ کی اُستاد نے شام کے بارے میں باتیں کرتے کرتے اچانک کہا۔

''یہ کمبخت مارے ذلیل انگریز اور فرانسیسی انیسویں صدی کے آواخر سے ہی فاحشاؤں جیسے کردار لیے مشرق وسطی پر رالیں ٹپکاتے پھرتے تھے۔ اُس منحوس ماری جرٹروڈ بیل Gertude Bell کو کیا کہوں۔ ناہنجار کہیں کی کیسے اُس نے میرے اتنے خوبصورت ملک کی شکل وصورت بگاڑ دی۔ کیا مرد مار عورت تھی؟ بصرے کو بغداد سے ملایا۔ موصل اس میں شامل کیا۔ کویت کو علیحدہ کر دیا۔ اردن کا ٹونا اا لگ کیا۔''

میں نے اُس کی طرف دیکھا تھا۔ مجھے احساس تھا۔ یقیناً میری آنکھوں میں لاعلمی

کے رنگ ہوں گے اور میری پتلیوں پر سایہ کرتے ناواقفیت کے عکس اور کہیں یہ خفت بھرا احساس بھی کہ چلی ہے شام اور عراق کی سیاحت اور ان پر لکھنے کو اور حقائق جانتی ہی نہیں ۔

اس کے لہجے میں جاندار قسم کی تلخی تھی۔ ''برٹش گورنمنٹ کی ایجنٹ، اُس کی منتظم اعلیٰ، اُس کی بادشاہت کے ستونوں کو مشرق وسطیٰ میں گہرے گاڑنے میں برٹش عزائم کی معاون، لارنس آف عریبیا اور ونسٹن چرچل کی ساتھی اور پورے جزیرہ نما عرب کے صحراؤں، میدانوں اور شہروں کے چپے چپے کو اپنے پیروں تلے روندنے اور علاقے کے شیخوں اور صحرائی قبائل کے سرداروں کو جاننے اور تعلق والی جو مشرق وسطیٰ پر ایک اتھارٹی کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر اُسے عراق سے محبت تھی۔ وہ بغداد کی دیوانی تھی۔ وہ دفن بھی یہیں ہے۔''

جرٹرو ڈ بیل میرے اندر اتری ضرور پر اگلے بہت سارے دنوں میں شام کے شہروں کی سیاحت اور بغداد کی سرزمین پر قدم دھرنے کے بعد تک وہ ذرا دل سے اوجھل سی رہی۔ پر جب میں عراق آرکیالوجی میوزیم میں داخل ہوئی اور گھومتے گھومتے میوزیم کے داہیں حصے میں جا گھسی تو ٹھٹھک گئی۔ وہاں جرٹرو ڈ بیل کانسی کے مجسموں اور آرٹسٹوں کے کمال فن کی صورت میں یہاں وہاں بکھری ہوئی تھی۔ اس کی لکھی گئی ڈھیروں ڈھیر کتابیں اس کے استعمال کی اشیاء سبھوں کو میں نے دیکھا۔ اُس پورشن میں سب سے خوبصورت وہ لفظ تھے جو اُسے خراج پیش کرتے تھے میں نے انہیں پڑھا اور جی جان سے سراہا۔

This window is in remembrance of Gertrude Bell versed in learning of the East and of the West, writer, Poet, Historian, Antiquary, gardner, mountaineer, explorer, lover of nature of flowers and

of animals incomparable friend, sister and daughter.

مجھے پتہ چلا تھا کہ اس شاندار میوزیم کو بنانے میں اُسکی انتہا درجے کی دلچسپی، آثار قدیمہ اور خاص طور پر میسو پوٹیمیا کی سرزمین پر بکھرے ہزاروں سالہ تاریخی ورثے سے اُس کی بے پناہ محبت اور لگن نے یہ عظیم کارنامہ اُس سے کروایا۔

افلاق کے پاس اُس سے متعلق کافی معلوماتی ذخیرہ تھا۔

''چلو میوزیم کے ریسٹورنٹ میں بیٹھتے ہوئے میں نے اپنے آپ سے کہا تھا جو یہ بتائے اِسے تو سُنوں۔ پھر کسی اور کو بھی ڈھونڈوں گی۔''

پتہ نہیں میرے وجدان نے مجھے سگنل دیا تھا کہ اس تاریخ ساز شخصیت کے پیچھے بہت دلچسپ کہانیاں ہوں گی۔

ہم دونوں نے قہوے سے بھری گلاسیاں اٹھائیں۔ سپ لیے اور میں نے آنکھیں اور کان افلاق کے چہرے پر لگا دیئے۔

1868 پیدائش کا سال اور جگہ انگلینڈ کی کاؤنٹی درہم Durham۔ خاندان سٹیل steel کا بیوپاری۔ دولت کا کچھ یہ حال کہ آج کے بل گیٹس سے ملایا جا سکتا ہے۔ ذہانت بھی بہت، دلیری بھی اور اعتماد بھی انتہا کا۔ سوتیلی ماں فلورنس نے محسوس کرتے ہوئے تربیت سازی کی کہ اپنی ماں ماریا تو اُس کی کمسنی میں ہی فوت ہو گئی تھی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں ماڈرن ہسٹری میں ایم اے میں ٹاپ کرنے والی وہ پہلی طالبہ تھی۔

''مجھے مشرق کا سحر، اُس کے صحراؤں کا طلسم، اس کے لوگ اور ان کے کلچر کی رومانیت بہت ہانٹ کرتی ہے۔ پہاڑوں کی دنیا کی ہیبت اور انہیں سر کرنے کا میرا جنون ہے۔'' ایسی باتوں کا اظہار اکثر اُس کے ہاں ہوتا۔

''مجھے ایران جانا ہے۔ انکل فرینک Frank Lasceller کے پاس۔

فارسی زبان سیکھنے کا آغاز کرتے ہوئے اُس کا گویا ایک اعلان تھا۔

چھ ماہ بعد تہران کی ایک بہت خوبصورت سی شام کو سفارت خانے کے ہال میں استقبالیہ پر کھڑے خوبرو نوجوان Legation سیکریٹری ہنری کاڈوگن Cadogan نے ایک دل کش لڑکی کو قیمتی فراوں سے سجے فراک میں برطانوی سفارت کار سر فرنیک اور لیڈی فرنیک کے ساتھ اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ ہال کی کھڑکیوں سے آتی شام کی کرنوں میں اُس کے تیز سرخی مائل بال یوں چمکے تھے جیسے اُن میں آگ لگی ہوئی ہو۔ اُس کی ابھری ہڈیوں والے رخساروں پر چمکتی نیلگوں سبزی مائل آنکھیں کانچ کی طرح چمکتی تھیں۔ اُس کے دلکش خدوخال اور اُس کے گلے میں پہنے قیمتی موتیوں کا ہار اُسکی گردن میں لپٹا بہت قیمتی نظر آتا تھا۔

ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ بکھیرے اُس نے پذیرائی کی اور وقت رخصت وہ ذرا سا اُسکی داہنی جانب جُھکا اور سر گوشی کے انداز میں بولا۔

''ایک چھوٹی سی خواہش، ایک چھوٹی سی درخواست اسے پذیرائی دینا۔ تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

جیرٹروڈ نے رُخ پھیرا اور اُسے بغور دیکھا۔ ایک دلکش نوجوان شوق واشتیاق کی لو سے دمکتی آنکھیں اُس پر جمائے پوری طرح متوجہ تھا۔

جیرٹروڈ کو بھی ہنری پسند آیا تھا۔ اب ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ پکنک پارٹیاں، رائیڈنگ، لمبی لمبی سیریں، شاموں کی کافی پارٹیاں اور طویل باتوں کے سلسلوں میں جہاں وہ اپنے بارے میں اُسے بتاتی کہ اُسے کوہ پیمائی سے لے کر صحراؤں میں گھومنے پھرنے۔ آثار قدیمہ، نئی نئی زبانوں کو سیکھنے، دنیا کو دیکھنے، دنیا کی مختلف قوموں، گروہوں، فرقوں کے لوگوں سے ملنے اُن کے کلچروں سے آشنا ہونے کا کتنا شوق ہے؟

ہنری اُسے رشک سے دیکھتے ہوئے سوچتا اور دھیرے سے کہتا "جیرٹروڈ تمہارے اور میرے شوق کتنے ملتے ہیں اور ہمارے خیالات میں کتنی ہم آہنگی ہے؟ اور زبانیں تو تم ابھی بھی چھ سات روانی سے بول سکتی ہو۔"

تب وہ کھلکھلا کر ہنستی اور کہتی۔

"نہیں ہنری یہ تو کچھ بھی نہیں۔ بیس تو کم از کم آنی چاہیں۔ ابھی تو میری فارسی بھی اتنی اچھی نہیں۔ مزید مہارت کی ضرورت ہے۔ یوں مجھے یہ زبان بہت پسند آئی ہے۔ میٹھی اور اپنی پشت پر بھاری اثاثہ لیے۔ ویسے ہنری مجھے مڈل ایسٹ بہت فسینیٹ کرتا ہے۔ میں نے اب اس کی سیاحت کرنی ہے۔

ہنری اس کی خوبصورتی سے کہیں زیادہ اُس کے بھیجے میں چھپے دماغ سے متاثر ہوا تھا۔ وہ ذہانت کی انتہاؤں پر تھی۔

ایسی ہی ایک ملاقات میں ہنری نے کہا تھا۔ "جیرٹروڈ مجھے لگتا ہے تم نے کوئی عظیم کام کرنا ہے۔ تم بہت خاص اور انوکھی ہو۔ میں تمہیں بہت پیار کرنے لگا ہوں۔ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

اُس نے چچا اور چچی کو آمادہ کیا اور منگنی کر لی۔ مگر جب اُس نے اپنے باپ کو اس کے بارے میں لکھا۔ ہگ بل کا جواب بہت دل شکنی والا تھا۔

"میں نے اُسے قطعی پسند نہیں کیا۔ ہنری بہت عام سے خاندان کا لڑکا ہے۔ معاشی طور پر بھی فیملی مضبوط نہیں۔ اور خود ہنری کی تنخواہ بہت تھوڑی ہے۔ اتنی کم تنخواہ میں میری بیٹی کا گزارہ نہیں ہوگا۔ یوں بھی وہ جوئے کا دلدادہ ہی نہیں بلکہ عادی کھیلنے والا ہے۔ تم خود سوچو جیرٹروڈ میں تمہیں کسی جواری کے ساتھ تو نہیں بیاہ سکتا۔ ہمارا خاندان اعلیٰ وکٹورین اقدار کا حامل ہے۔"

خط ہاتھوں میں تھامے اور اُسے پڑھتے ہوئے جرٹروڈ نے خود سے کہا تھا۔

''اف کاش مجھے اپنے باپ سے اتنی محبت نہ ہوتی اور میرا خاندان وکٹورین اخلاقیات اور روایات کا ایسا اسیر نہ ہوتا۔''

تا ہم اُس نے ردِعمل کے طور پر کچھ نہیں کہا۔ منگنی توڑی اور واپس انگلینڈ چلی گئی۔

پر وہ بہت غمزدہ تھی۔دل شکستہ سی۔ فلورنس سوتیلی ماں جانتی تھی کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک لڑکی ہے۔وہ خود بھی پلے رائٹر تھی۔شائداسی لیے اُس نے کہا۔

''تمہارا باپ تمہارے لیے ہیرا سے لڑکے کا متمنی ہے۔اس ڈپریشن سے باہر نکلو اور لکھو۔تم نے ایران کا چپہ چپہ دیکھا ہے۔یہ سب لوگوں کو دکھاؤ۔

آہستہ آہستہ اُس نے خودکو آمادہ کیا اور Persian pictures لکھی۔پہلی کتاب ہی نے اُسے بطور لکھاری مستند کر دیا تھا کہ اس کے انداز بیان میں جذب کرنے کی فراوانی تھی۔فارس مغرب کیلئے اتنا زیادہ مانوس نہ تھا۔اُس کی تحریر ایران کے شاندار ماضی کی اساطیری کہانیوں کے پیچ وخم سے گزرتی قاری کو اُس کی عظمتوں سے مرعوب کرتی اُس کے موجودہ زوال اور اسباب سے آشنا کرتی تھی۔ایران کے چہرے پر نمایاں اسکی سیاسی تہیں،اُس کا اسرار،اس کا طرز تمدن،خواتین کے رویئے،اُن کی بودوباش،اُن کا حُسن جمال۔زمین کا قدرتی اور اس پر انسانی ہاتھوں کا دیا گیا حُسن،محرم اور رمضان کی رونقوں کی تفصیلات دلچسپی سے معمور پڑھنے والے کو قید کرتی تھیں۔

مذہبی تہواروں کی تفصیلات میں اسلام اور عیسائیت کے تقابلی جائزے میں دونوں مذاہب کے فرق اور مماثلتوں کی تفصیلات حیران کن تھیں۔

یہ ایک ایسا سفرنامہ تھا جسمیں مشرق کی دنیا اپنی چھوٹی چھوٹی تفصیلات اور رازوں سے سامنے آئی تھی۔اس کی دوسری تخلیق

1897.Poems from Diwan Hafiz میں شائع ہوئی۔ جو اُس کی فنی مہارت کا ثبوت تھی۔

با قاعدہ ترجمے سے پہلے پیش لفظ میں اُس نے حافظ کی زندگی کے نمایاں پہلو اور ان کے کام کا تنقیدی جائزہ لیا۔ نظموں کے ساتھ ساتھ لکھے گئے اس کے نوٹس میں حافظ کے ہم عصر شعرا کے تقابلی جائزوں میں اُس کے اندر کے علم کی وسعت اور گہرائی کھل کر سامنے آئی ۔کہیں وہ اُس کا موزانہ Dante دانتے سے کرتی ہے۔کہیں وہ اُسے گوئٹے سے جوڑتی ہے، اور کہیں Villon سے۔کہیں خیالات کی رو میں اُسے احساس کی وہ جھلک نظر آتی ہے جو مغرب کی مشرق سے inspiration سے جڑتی ہے۔

اُس کی موت کے بعد بیسویں صدی کی وسطی دہائی میں ایک پبلشنگ ادارے نے اس کی اِس کاوش کو حافظ ایک عظیم صوفی شاعر، حافظ کی تعلیمات ،حافظ کے حالات زندگی وغیرہ مختلف عنوانات کے تحت اسّی سوے کے صفحات پر مشتمل خوبصورت فارسی خوشخطی کے ساتھ ساتھ کتابیں شائع کیں جو بہت پسند کی گئیں۔

وہ حافظ شیرازی کی بہت مداح تھی۔حافظ کے بارے میں اُس کا اپنے والد کو ایران سے لکھا گیا ایک خط شاعر کی عظمت اوراس کے کمالِ فن کا ثبوت ہے۔

لکھتی ہے۔"میں جیسے جیسے حافظ کو پڑھ رہی ہوں حیرتوں میں گم ہوتی جارہی ہوں ۔ہم کیسے لوگ ہیں جو اُسکے مقام سے ہی آگاہ نہیں۔اُس کی نظموں میں موسیقیت کا ایسا رچاؤ ہے کہ آپ کا جی انہیں بے اختیار گنگناتے رہنے کو چاہتا ہے ۔دنیا کا مقبول ترین اور محبوب ترین جسے شاعروں کا شاعر اور Tongue of the invisible کہتے ہیں ۔میں اُس کے دیوان کا ترجمہ کروں گی تا کہ مغرب اُسے جان سکے۔"

جب وہ دیوان حافظ کا ترجمہ کرنے میں مصروف تھی اُسے معلوم ہوا تھا کہ ہنری

نمونیے سے فوت ہوگیا ہے۔

چند لمحوں کیلئے اُسے ماحول اور اپنا وجود یکسر ساکت محسوس ہوا تھا پھر جیسے اُس کے لبوں نے خود سے سرگوشی کی تھی۔

''دیکھوابھی تو سال ہی گزرا تھا اور وہ دنیا سے بھی چلا گیا۔''

بہت دنوں وہ حافظ کے شعروں کو پڑھتی خاص طور پر اُس کے اِن اشعار کو زیرلب گنگناتی رہی۔غم زدہ ہوتی رہی۔

بُلبل کے دل سے نکلے خون کے قطروں نے

سُرخ گلاب کو زندگی دی

اُسے توانائی دی

اے موت کی ہواؤ

تم تو میری امیدیں بھی لے اڑیں

پھر پہاڑ اور ان کی مہم جوئی نے توجہ کھینچ لی۔پہلے فرنچ الپس کی Meijeچوٹی سر کی تو حوصلہ بڑھا بعد میں سوئٹزرالپس نگاہوں میں آگئے۔

اس نے بہت سی چوٹیاں سر کیں۔ایک کو تو اُس کا نام بھی دیا گیا۔Gertrudspitze

اکتیس سال کی عمر میں اُس نے مشرق کا رُخ کیا۔یروشلم اور دمشق میں اُس کی سہیلیوں نے اُسے لکھا تھا۔

''تم آؤ یہاں۔بہت حیران کن تجربات سے ملوگی۔''

اب وہ نئی زبانیں سیکھنے میں جُت گئی۔اُس نے ٹرکش سیکھی،عبرانی اور عربی میں مہارت حاصل کی اور یروشلم آگئی۔

مڈل ایسٹ اُس کیلئے تحیّرات کی سرزمین تھی۔شہروں کی سیاحت کے بعد وہ صحراؤں میں نکلی۔

افلاق نے کافی کا آرڈر دیتے ہوئے مجھ سے کہا۔

تاریخ کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے پر بھی ایسی عورت نہیں ملتی۔مشرق وسطیٰ کے صحراؤں کی سردی اور گرمی دونوں انتہاؤں پر۔وجود کو جلانے اور منجمند کرنے والی موسمی حدّتیں۔کیا شیر دل عورت تھی۔گھوڑوں،خچروں،باورچی،گائیڈ،خیمے،کتابیں نقشے اور دیگر سیاحتی لوازمات کے ساتھ نکل پڑتی۔

سر پر دھرے ہیٹ کے ساتھ کفایہ سے سر ڈھانپتی۔لمبے سکرٹ پہنتی۔چہرے پر جالی دار نقاب ڈالتی اور صحراؤں میں سے گزرتے ہوئے مقامی قبائلی سرداروں اور شیخوں سے ملتی۔ہمیشہ پروٹوکول کا دھیان رکھتی کہ اُسے شیخوں کے سامنے کیسے پیش ہونا ہے؟اور انہیں کیسے عزت و تکریم دینی ہے؟وہ زیادہ وقت مقامی لوگوں کے ساتھ گزارتی۔فراٹے کی عربی بولتی۔جگہوں کے بارے جانکاری حاصل کرتی۔اُن کے خیموں میں،اُن کے گھروں میں،اُن کے سے انداز میں چوکڑی مار کر بیٹھتی۔انکی تاریخ،اُن کے رسم رواج سے آگاہی حاصل کرتی گاڑھے اور کسیلے قہوے کے گلاس پر گلاس پیتی۔بڑی سی سینی میں روسٹ بکرا اور چاول جنہیں وہ اُن کے ساتھ ہی ہاتھوں سے کھاتی اور انگلیاں چاٹتی۔

مڈہف(مہمان گھر جو نرسلوں اور جیوٹ کے ریشوں سے بنایا جاتا ہے)میں ٹھہرنا اُسے بہت پسند تھا۔جب بھی ایسا موقع آتا وہ اپنے میزبانوں سے stuffed بکرے کی فرمائش کرتی جو اُس کی دُم اُس کے منہ میں ڈال کر اُس کی آنکھیں نکالے بغیر روسٹ کیا جاتا تھا۔سگریٹ پیتی اور حقے کے کش بھرتی۔اکثر بون فائر میں ان کے ساتھ ڈانس کرتی،گانے گاتی۔وقت رخصت انہیں قیمتی تحائف اور قیمتی بندوقوں سے نوازتی۔

وہ حیرت سے اُسے دیکھتے۔ایک اکیلی نوجوان خوبصورت عورت تن تنہا اتنے شدید موسم میں کیسے سفر کرتی ہے؟ ہاں تو اب یہ بھی جان گئی تھی کہ گھڑ سواری کے دوران گھوڑے کی پشت پر بیٹھے بیٹھے اُونگھ کیسے لی جاتی ہے؟ کوئین اف دی ڈیزٹ کا خطاب اُسے اِن ہی قبائلی سرداروں اور شیخوں نے دیا تھا۔

The Desert and the Sown بھی اُس کا ایک بے مثل تاریخی شاہکار ہے۔جو تاریخ نویسی کے ساتھ ساتھ تقریباً ڈیڑھ سو انتہائی اعلیٰ درجے کی تصویروں سے مزین ہے۔

وہ ایک نڈر، دلیر، جی دار اور وسائل رکھنے والی سیاح تھی۔اُس کا بڑا مقصد کرداروں کا مطالعہ، جگہوں کا مشاہدہ اور رسم و رواج سے آگاہی تھی۔

جگہوں کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ اُس کا زیادہ فوکس لوگوں پر رہا۔ان کے اطوار و کردار پر اُس کی گہری نظر اور عورت ہونے کے ناطے عائلی زندگی کے بہت سے پہلو جنہیں پردہ دار روایتی اسلامی معاشرے میں صرف ایک عورت ہی دیکھ سکتی ہے۔اُس نے انہیں دیکھا اور پوری تفصیل سے زیر تحریر لائی۔اِن قبائلی معاشروں کی یہ وہ حقیقی تصویر تھی جس نے اُسے باقی سیاحوں سے منفرد کیا کہ تہذیبی اور تمدّنی زندگی کا ایک اہم پہلو گھریلو معاشرت ہوتی ہے۔دیواروں کے اندر کی زندگی کیسے سانس لیتی ہے اور اُسے کیسے بسر کرتی ہے۔عورت ہونے کے ناطے جرٹروڈ نے عرب قبائلی زندگی کو اس کے پورے رنگوں سے دیکھا اور اُسے بیان کیا۔

قدرت نے اُسے ایک خاص نوع کی حِس مزاح سے نوازا تھا۔پہاڑوں اور صحراؤں کے لوگوں سے اپنے اسفار کے دوران ملاقاتوں میں وہ اپنے مخاطب سے لفظوں کا ایک ایسا ڈرامائی کھیل کھیلتی کہ اُن کی شخصیت کھل کر سامنے آجاتی۔کسی منظر کا بیان

ہو۔کسی شخص سے گفتگو ہو۔آثار قدیمہ کے کسی حصے کی روئداد ہو۔منظر آنکھوں کے سامنے مجسم ہو تے تھے۔

Amurath to Amurath اُس کا ایک اور شاہکار سفرنامہ ہے جو حلب سے شروع ہو کر دریائے فرات کے ساتھ ساتھ چلتا دیابرک Diyaberk سے قونیہ تک جاتا ہے۔

The Thousands and one churches جیسی کتاب ولیم ایم ریمزے اور اس کی مشترکہ کاوش سے لکھی گئی ۔اس کی تصاویر اور تفصیلات ایسی معلومات فراہم کرتی ہیں جو بہت قیمتی ہیں۔آغاز کے بازنطینی اور عیسائیوں کے اناطولیہ کے ریجن میں پوسٹ کلاسیکل یادگاریں جن میں بہت سی اب ناپید ہیں ۔اور جو ہیں اُن کے نئے نام ہو گئے ہیں۔

پھر یوں ہوا کہ اِن علاقوں سے، بغداد اور عراق سے محبت کرتے کرتے اُسے ایک جیالے سے محبت ہو گئی۔یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ وہ برٹش تھا۔اُس کی چوڑی چھاتی تمغوں سے سجی ہوئی تھی۔بڑا بہادر، جیالا، دلیر اور دلبر سا مشرق وسطیٰ میں برٹش آرمی کا میجر چارلس ڈوگی ولی Doughty Whlie۔

دونوں مقناطیس کی طرح ایک دوسرے کی طرف بڑھے تھے۔دونوں کی دلچسپیاں اور شوق ملتے تھے۔جرٹروڈ کو اپنے اندر بہت ہیجان بھری کیفیات کے مدّ و جزر کا احساس ہوا تھا۔چارلس میں وہ سب کچھ تھا جس کے خواب جرٹروڈ جیسی خاتون دیکھتی تھی۔ایک آئیڈیل مرد۔مگر وہ شادی شدہ تھا اُس کے اندر سے ہُوک سی اٹھی تھی ۔تاہم پھر بھی وہ خود کو اس کی محبت میں گرفتار ہونے سے روک نہ سکی۔دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتے تو لمبے لمبے خط لکھتے۔

جرٹروڈ کے خطوط ایسے شاہکار ہوتے کہ جنہیں وہ بار بار پڑھتا اور اُس کا جی نہ بھرتا۔پندرہ ہزار خط جو اُس نے اپنے والد، والدہ، سہیلیوں اور چارلس کو لکھے۔یہ وہ آئینہ تھا جس میں اُس زمانے کے سارے عکس موجود تھے۔برطانیہ اور اس کے حواریوں کی چالیں، ریشہ دوانیاں، لارنس اف عریبیا اور چرچل کے کردار۔مقامی آبادی،مذہبی رہنماؤں کے باہمی اختلافات، کیمونسٹ عناصر کا اثر و نفوذ۔بغداد اور دمشق کے شب و روز۔یہ خط نہیں تاریخ تھے۔اس کے علاوہ سولہ ڈائریاں۔خطوط کو پانچ چھ والیوم کی صورت میں چھاپا گیا۔اور یہی صورت ڈائریوں کی ہوئیں۔مغرب کا عام قاری تو انگشت بدندان تھا۔اُسکے تحریری شہ پاروں نے مشرق کو اُس کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔جنگی جرنیلوں اور سیاسی مُہروں کیلئے اُس میں جاننے اور سمجھنے کیلئے بہت کچھ تھا۔

یہی وہ دن تھے جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی اور جرٹروڈ نے سوچا اس کے مادر وطن کو اس وقت اس کی ضرورت ہے۔وہ فرانس پہنچی۔ریڈ کراس میں زخمیوں اور گم شدہ سپاہیوں کے اندراج کرنے کی ڈیوٹی دینے لگی۔

ایسے ہی دنوں میں اُسے چارلس کا خط ملا۔اُس نے لکھا تھا میں تمہیں مس کر رہا ہوں۔ملنا چاہتا ہوں۔اگلے چند دنوں تک مجھے گیلی پولی کے فرنٹ محاذ پر جانا ہے۔

چار دن انہوں نے لندن کی گلیوں، سڑکوں پر گھومنے پھرنے،ڈھیروں ڈھیر باتیں کرنے ریسٹورنٹوں میں کھانے کھانے میں گزارے اور پھر جدا ہوئے۔

مئی کے پہلے ہفتے کے آخری دنوں میں جرٹروڈ لندن آئی تھی۔خوبصورت موسم کا سارا حسن جنگ کے بادلوں میں گم ہوا پڑا تھا۔لندن ریڈ کراس آفس میں جب وہ فائلیں دیکھ رہی تھی۔دفعتاً آفس کی انچارج نے باتیں کرتے کرتے جزیرہ نما گیلی پولی کے محاصرے میں اُن برٹش سینئر آرمی افسروں کی ہلاکت کا ذکر کیا تھا جن کے بارے میں اطلاعات کل

شام موصول ہوئی تھیں ۔برگیڈیئر جنرل اور برگیڈیئر میجر کے مرنے کے بعد کمان لیفٹیننٹ کرنل چارلس ڈوگی نے سنبھالی تھی ۔تا ہم اپنی تمام تر دلیری کے باوجود وہ اور اس کے ساتھی مارے گئے ۔وہ ساکت بیٹھی اُس کے لبوں کو ہلتے دیکھتی تھی ۔اندر اٹھتے طوفان کے جھکڑوں کی شدت کے کسی ہلکے سے عکس کو اُس نے چہرے پر پھیلنے نہیں دیا۔

اور جب روزمرہ کے اس کوفت بھرے تھکا دینے والے ڈیسک ورک کو نپٹا کر وہ اٹھی ۔اُس نے لمبی آہ بھر کر خود سے کہا تھا۔

''محبت میرے نصیب میں نہیں۔''

جیسے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔

اور وہ بغداد آ گئی ۔

''یہ کیسی حیرت انگیز سی بات ہے ۔مشرق نے میرے دل کو گھائل کر دیا ہے ۔مجھے ہمیشہ اس کی خوبصورتی اور سحر جکڑ لیتا ہے ۔گھر تو وہاں ہے جہاں تمھارا دل ہے ۔میں خود سے پوچھتی ہوں ۔میرا دل کہاں ہے؟''بغداد میں ۔مجھے بغداد سے اتنی محبت ہے کہ بغدادیوں کو بھی نہیں ہوگی ۔کوئی بغدادی اِسکے حُسن کو اُن نظروں سے نہیں دیکھتا جن سے میں اسے دیکھتی ہوں ۔دریا کی خوبصورتی ،پام کے باغوں کا حُسن کھجور کے درختوں کا بانکپن ،صحرا کی دل آویزی۔

یہ اپنے والد کو اُس کا لکھا ہوا ایک خط تھا۔

اور یہ 1916 کے دن تھے ۔برٹش آرمی بصرہ پر قابض ہو چکی تھی ۔مگر اُسے بغداد آنے میں بہت دشواریاں نظر آ رہی تھیں ۔ہائی کمان اُس کی صلاحیتوں سے آگاہ تھی ۔اِن علاقوں میں اُس کی ہر دل عزیزی سے واقف تھی ۔مقامی با اثر لوگوں سے اُس کے رابطوں کو جانتی تھی ۔

"ہمیں محفوظ راستے بتاؤ۔بغداد تک پہنچنے میں تمہاری رہنمائی چاہیے۔"جنرل کلیٹن Clayton کا پیغام اُسے ملا تھا۔

اُس نے نقشے اور ڈائریاں اٹھاہیں اور بصرہ پہنچ گئی۔برٹش آرمی کم سے کم جانی و مالی نقصان اور مزاحمت کے بغداد پر قابض ہو گئی تھی۔برطانیہ کی ہائی کمان نے اُسے باقاعدہ اورینٹل سیکریٹری کا درجہ دیا۔

برطانیہ انٹیلی جنس سروس کو اس کی صلاحیتوں کا بہت اچھی طرح علم ہو گیا تھا کہ عربوں سے ڈیل کرنے میں انہیں اس کی کتنی شدید ضرورت ہے۔اُس کا زبان پر عبور اور صحرائی قبائل کے بارے علم منفرد تھا۔عراق کے ساتھ اور ہاشمی خاندان کے ساتھ بہر حال اسکی ہمدردیاں تھیں۔شریف مکہ کے بیٹوں فیصل اور عبداللہ کو عراق اور اردن کے بادشاہ بنانے میں اُس کا بنیادی کردار تھا۔

برطانوی مینڈیٹ کو پس پردہ قائم رکھنے اور عراقیوں کو فرنٹ لائن پر رکھنے میں اُسے اصرار تھا۔قاہرہ کی کانفرنس میں وہ واحد خاتون عورت تھی جسکی نئے ملکوں کو بنانے اور مستقبل کی صورت پر دوٹوک حتمی اور قابل عمل رائے تھی میسوپوٹیمیا کا چیف پرسی کوکس اور ونسٹن چرچل اُس سے متفق تھے۔

کنگ میکنگ جیسے مشکل مرحلوں سے گزرنے ،اختیارات عراقیوں کو منتقل کرنے میں اُس کی حیثیت لازماً کلیدی رہی تھی۔الخاتون الخاتون کہتے عراقیوں اور اُم المومنین کہتے کہتے شامیوں کی زبانیں خشک ہوتی تھیں۔بے تاج ملکہ جیسی حیثیت تھی۔

پر ان مرحلوں کے بعد تلاطم خیز زندگی میں تھوڑا سا ٹھہراؤ آگیا۔ڈپریشن کا شکار ہوئی مگر اُس نے اپنی دلچسپیاں آرکیالوجی میوزیم بنانے میں ڈھونڈ لیں۔ایک بہت بڑے کام کی تکمیل ہو چکی تھی۔اور یہ سال 1926 تھا۔اور وقت بہت بدل گیا تھا۔بادشاہ کو اس کی

ضرورت کم کم محسوس ہوتی تھی۔اُس نے خواب آور گولیاں زیادہ کھالی تھیں۔جو جان لیوا ثابت ہوئیں۔اور وہ دنیا سے رخصت ہوگئی۔یہیں بغداد میں برٹش قبرستان میں دفن ہے۔

مگر کہانی ختم کرنے سے قبل افلاق نے کہا تھا۔''ایک عجیب سی بات ہے کہ پچاس سال کی عمر میں وہ تیسری محبت میں مبتلا ہوئی۔

افلاق نے کہانی ختم کردی تھی پر میں ساکت بیٹھی تھی۔تیسری محبت یہ ایک اور حیرت انگیز انکشاف تھا۔یوں بھی عورت ہونے کے ناطے اس کی زندگی کے کچھ خاص حصّوں کے بارے میں میں بہت متجسّس تھی۔اُن کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔

دفعتاً میرے ذہن میں برق سی کوندی۔بغداد کی ایلیٹ فیملی کی عورتیں جن کے ہاں بیسویں صدی کی دوسری تیسری دہائی میں اُس کا آنا جانا اور میل ملاقات تھی انہیں ڈھنڈوا جائے۔کو1920 اور 2007،درمیان کا بہت سا وقت۔بغداد کے پلوں کے نیچےتو ڈھیروں ڈھیر پانی گزر چکا ہے۔کھوج کروں گی بھی تو اس کی کوئی ساتھی ملنی ناممکن۔ مگر شاید کہیں ایک نسل سے دوسری اور تیسری تک کسی تعلق،کسی واسطے،کسی فخر یہ اعزاز کے ساتھ کوئی اہم،کوئی خاص واقعہ،خاندان میں گردش کرتا رہا ہو اور کوئی راوی کچھ رازوں سے پردہ اٹھادے۔

''اب اس کی قبر دیکھنی تو بہت ضروری ہوگئی ہے۔''میں نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''وہ کون سا مسئلہ ہے۔آرمینین چرچ کے پاس ہی باب شورجا Shorja کے نزدیک ہے۔شام کو کسی بھی وقت چلے چلیں گے۔''

وہ دن بھر میرے ساتھ رہی تھی۔میں نے طے کیا تھا کہ جیسے میں پرانے دمشق اور حلب کے گلی کوچوں میں عالیشان گھروں کے کھلے دروازوں سے اندر داخل ہوجاتی تھی۔رجحل،و سیب کے سارے نظاروں کے مزے لوٹتی تھی۔اکثر کھانا بھی ان کے

دسترخوان پر کھاتی تھی۔ یہ طریقہ یہاں بھی آزماؤں۔ مگر دو قباحتیں سامنے تھیں۔ موسم کی شدت اور بغداد کے نازک حالات۔ پاکستان کا سُن کر کہیں دہشت گردوں کی ساتھی جان کر ہی نہ دھتکار دی جاؤں۔ بہتر ہے کہ افلاق کی مدد لوں۔

میرا مسئلہ شاید افلاق کی سمجھ سے باہر تھا۔ بیٹے جیسے لڑکے سے میں کیا کھل کر بات کرتی کہ میرے اندر کون سانسوانی اسرار جاگا ہوا ہے۔

میں ہوٹل آئی۔ اتفاق ہی تھا کہ مروان سیٹ پر تھا۔ میں نے اُسے آج کی کارگزاری سے مطلع کرتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

میری بات کا جواب دینے سے پہلے اُس نے ستائشی انداز میں کہا تھا۔

''کیا عورت تھی۔ اپنے وقت کی ذہین ترین اور چالاک ترین جس کا دماغ دنیا کے کسی جینئس مرد کا تھا۔ وہ اس علاقے کے چپّے چپّے کو جانتی تھی۔ ایک بار ہمارے میسوپوٹیمیا کے ایک ممتاز شیخ سے اُس کے علاقے کی جغرافیائی حدود کے متعلق پوچھا گیا۔ اُس نے کہا تھا۔ جرٹرود بیل سے پوچھو۔ ڈوب مرنے کی بات تھی ناشیخوں کیلئے۔

میری خواہش کا سُن کر اُس نے کہا تھا۔ ''مشکل لگتا ہے۔ دراصل ہمیں اس کے بارے تھوڑی بہت معلومات اس لیے بھی ہیں کہ ہم سیاحتی پیشے سے منسلک ہیں۔ وگرنہ عام لوگ نہیں جانتے ہیں۔ یوں عراق کے ممتاز احمد شیلابی خاندان کی بزرگ بی بی جو صدام سے پہلے کے بغداد کی معتبر اور امیر ترین عورت شمار ہوتی تھیں اور اعظمیہ کے ذیر Deer پلیس میں کسی ملکہ کی طرح رہتی تھیں۔ اُن کے ہاں اُس کا بہت آنا جانا تھا۔ اس خاندان کی لڑکی تمارہ بھی بہت سرگرم ہے۔ ممکن ہے وہ کچھ جانتی ہو۔

میری بے تابی اور شتابی کا کچھ یہ عالم تھا کہ بس نہ چلتا تھا ابھی اٹھ کر منصور سٹی چلی جاؤں جہاں اُن کا محل نما گھر ہے۔ مروان مزید بتا رہا تھا۔

''گذشتہ سال اُس نے کورا قبرستان میں جرٹروڈ کی قبر کے آس پاس یاسمین کے پودے اور کھجور کے بیشمار درخت لگوائے تھے۔''

منصور ڈسٹرکٹ گرین زون سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔بغداد کی ہائی کلاس سماجی زندگی کا ایک اہم حصّہ یہاں رہائش پذیر تھا۔یہ ڈپلومیٹ ،بزنس کلاس اور اعلیٰ درجے کے ہنرمندوں کا بھی گھر تھا مگر بموں کے دھماکوں kidnapping اور سُنّی تشدد پسندوں نے اِسے غیر محفوظ بنادیا ہے۔

منصور میں تمارہ شیلابی سے تو ملاقات نہ ہوئی کہ وہ استنبول گئی ہوئی تھی ۔ہاں البتہ اس کے محل نما گھر کے سیکورٹی گارڈوں اور اسلحہ بردار محافظوں سے ضرور ملاقات ہوئی جنہوں نے مجھے پاکستانی جان کرمسکراہٹیں بکھریں اورافسوس بھی کیا کہ وہ اپنے پاکستانی مہمان کی خدمت سے قاصر رہے۔

تاہم بغداد پریس کلب میں حسین السّید ی جیسے صاحب علم لکھاری اور صحافی سے باتیں ہوئیں۔حالات حاضرہ سے متعلق بہت سی باتوں کے بعد جب میں نے جرٹروڈ بیل کے تیسرے عشق والے موضوع کو چھیڑا اور مروان اور افلاق کی گفتگو سے حاصل کردہ ابنِ سعود بن عبدالعزیز اور شریف مکہ کے بیٹے امیر فیصل کے نام ان کے سامنے رکھے۔

''ابن سعود''

اُن کے گول مول سے چہرے پر نفی کے بھرپور تاثرات بکھر گئے۔

ابن سعود کے بارے میں تو بہت اونچی رائے رکھتی تھی وہ اُس کا اعتراف تھا کہ اپنے ہم عصر لیڈروں میں وہ بہت منفرد تھا۔کہیں وہ۔اُس کی شاندار قامت اور وجود بارے رطب السان تھی ۔اور کہیں اس کے بھاری پپوٹوں کے نیچے اس کی سنجیدہ اور ذہین آنکھوں ،سپاہیانہ دلیری وشجاعت اور سیاسی بصیرت کے گن گاتی تھی۔

''تو اِس کا مطلب ہے وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے کہ بس محبت میں گرفتار ہو گئی ۔ بھئی وہ ایک عظیم لکھاری بھی تھی ۔ کرداروں کو حُسن و خوبی سے بیان کرنا جانتی تھی ۔ یوں بھی ابن سعود اُسے پسند نہیں کرتا تھا ۔ اُس کی تیز اور تیکھی آواز سے اُسے کوفت ہوتی تھی ۔ جب وہ بے تکلفی سے اُسے کہتی ۔

''عبدالعزیز ۔ عبدالعزیز دیکھو اِسے ۔ اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ ابن سعود کوفت بھرے انداز میں بات کو ٹال جاتا تھا ۔

ہاں فیصل کے سلسلے میں کہا جا سکتا ہے مگر میں اِسے قربت رفاقت کے تعلق کا نام دیتا ہوں اس کی چند وجوہات بھی ہیں ۔

پہلی جنگ عظیم میں ان فاتح اتحادیوں کی بندر بانٹ میں شام پر مسلط فرانسیسیوں نے تو فیصل کو دمشق سے سال بھر کے اندر ہی دھکا دے کر نکال دیا تھا ۔ برطانیہ نے تھوڑی سی شرم و حیا کی ۔ جرٹرو ڈ بیل نے اِسے تین صوبوں پر مشتمل اس نئے ملک جس کی حدود کی لائنیں خود اُس نے کھینچی تھیں پر بٹھایا ۔ مقامی اشرافیہ اُس کی کچھ خاص حامی نہ تھی ۔ مگر درمیان میں جرٹروڈ بیل تھی جس پر عرب شیخ بھی اعتماد کرتے تھے اور برٹش کیبنٹ cabinet بھی ۔

عراقی جھنڈے کی ڈیزائن کاری دونوں نے مل کر کی تھی ۔ بغداد کے ماضی سے اُس کی پوری جانکاری تھی ۔ کالی پٹی عباسی دور، سبز پٹی امیہ اور سفید فاطمیوں کی نمائندہ بنی ۔ اونچ نیچ، توڑ جوڑ کے سبق وہ سب اُس نے اُسے پڑھائے تھے ۔ برطانیہ کی پشت پناہی بھی فیصل کو سو فیصد حاصل تھی ۔ اور جس صبح فیصل کی رسم تاجپوشی تھی اُس نے تقریب کے اختتام پر کہا تھا ۔ ''یہ کنگ میکنگ تو نرا عذاب ہے ۔ اِس کھینچا تانی نے مجھے تھکا دیا ہے ۔''

ابھی اِس بیاہ کا ہنی مون پریڈ ہی چل رہا تھا کہ جب شیعہ سنی عوام متحد ہو کر اس

سامراجی غلبے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔سارے میسوپوٹیمیا کے شہروں میں محمد البعیدی کی شاعری گونج رہی تھی۔

اے عراقیو اٹھ جاؤ اب

آگ لگا دو

خون سے ذلت کے دھبے دھو دو

ہم غلام ہیں؟

جو گردنوں میں طوق پہنیں

ہم قیدی ہیں جو پاؤں میں بیڑیاں پہنیں

ہم کیا عورتیں ہیں؟

جو آنسوؤں کو ہتھیار سمجھتی ہیں

ہم یتیم ہیں؟

کہ ہمیں عراق کیلئے مینڈیٹ چاہیے۔

جب ہوا ئیں اور فضائیں ایسی ہوں تو ظاہر ہے انحصار بڑھ جاتا ہے ہمہ وقت مشورے رائے۔یوں بھی فیصل عرب خوبصورتی کا شاہکار نمونہ تھا۔ایسے میں محبت تو ہوجاتی ہے نہ۔پالک کتے بلی سے بھی پیار ہوتا ہے نا۔

''بڑے المناک انجام سے دوچار ہوئی۔''میرے لہجے میں گلے گلے تک تاسف تھا۔

''ایسا ہی ہوتا ہے۔بڑا نارمل سا لہجہ تھا۔ان کا بہت اونچے جا کر جب بندہ زمین پر آتا ہے تو ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے۔ڈپریشن کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔فیصل کو اس کے مشوروں کی ضرورت اب کم کم ہوتی تھی۔برٹش ہائی کمیشن آفس میں نئے نئے لوگ آگئے

تھے۔آرکیالوجی میوزیم اُس کا ایک بڑا کام مکمل ہوگیا تھا۔وہ بیمار رہنے لگی تھی۔چین سموکر تھی۔پھیپھڑے متاثر ہو گئے تھے۔تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہم جیسے لاکھوں بغدادیوں سے زیادہ بغدادی تھی۔

پاکستان آ کر بھی وہ مجھے اکثر یاد آتی۔میں تنہائی میں ایک سوال ضرور اپنے آپ سے کرتی۔زندگی سے بھری ہوئی، آزاد معاشرے کی ایک مکمل عورت کیسے ممکن ہے کہ اُس کے اندر مرد کی قربت کی تمنا نہ مچلی ہو اور اُسنے اِسکی تکمیل نہ کی ہو۔

پھر ایسا ہوا کہ مجھے جم خانہ لائبریری سے جارجینا ہوول Georgina Howell کی کتاب The Queen of the Desert ملی۔اپنے کزن کی ممبر شپ پر میں نے اِسے ایشو کروایا۔

پڑھنا شروع کیا۔پڑھتی گئی پڑھتی گئی۔پھر رُکی۔ایک بار،دو بار،تین بار پڑھا۔چوتھی بار اور پانچویں بار کا پڑھا ہوا آپ بھی پڑھیئے۔

یہ ذکر ہے اُس شام کا جو بادلوں سے بھری ہوئی تھی۔جرٹروڈ چارلس سے مل کر لندن میں اپنے ذاتی اپارٹمنٹ میں کوئی گھنٹہ بھر پہلے آئی تھی۔چارلس ڈوگی کو آج رات دس بجے کی ٹرین سے محاذ پر جانا تھا۔ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سٹول پر بیٹھی وہ اپنے بالوں میں لگی پنیں نکال رہی تھی جب اُس نے ایک نرم اور دھیمی سی دستک سُنی۔اُس نے دروازہ کھولا۔چارلس مسکراتے ہوئے اندر آیا تھا۔وہ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔چپ چاپ۔

جرٹروڈ سے کہا ہی نہیں گیا کہ ابھی تو میں تمہیں رخصت کر کے آ رہی ہوں۔لباس بھی تبدیل نہیں کیا۔پھر چارلس کے توانا بازوؤں نے اُسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔اس کے بالوں پر بوسہ دیتے ہوئے اُس نے کہا۔

''جرٹروڈ پتہ نہیں کیوں لگتا ہے تمہیں شائد پھر نہ دیکھ سکوں۔تین گھنٹے کا مارجن

تھا۔جی چاہ رہا تھا یہ وقت بھی تمہارے ساتھ گزاروں۔''

اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔وہ بیڈ پر بیٹھ گیا اور بازوؤں کے ہالے میں سمیٹتے ہوئے اُسنے اُسے بھی ساتھ ہی بیٹھا لیا۔پھر وہ لیٹ گیا۔اُس نے اُسے بھی اپنے ساتھ لٹا لیا۔اُس کے ماتھے اور پھر اُس کے گالوں پر بوسے دینے کے بعد جب وہ ذرا سا آگے بڑھا تب اُس کے بازوؤں میں گھرے اُس کی محبت کی گرمی میں پگھلنے اور ڈوبنے کے بجائے اُس نے دھیرے سے سرگوشی میں کہا تھا۔

''نہیں۔چارلس نہیں۔ہرگز نہیں۔

پھر اُس نے اُس کے والہانہ بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو آہستگی سے پیچھے ہٹاتے اپنے جسم کو اکڑاتے،اس کی گرفت میں سے نکلتے اور کھڑے ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''چارلس میں ورجن ہوں۔''